جنوری — جون ۲۶

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

اسلم جیراجپوری

و

یوسف حسین خاں بی اے (جامعہ)

قیمت سالانہ چار روپیہ (للعہ)

مطبوعات شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

وجہ دین: حکیم ناصر خسرو کی مشہور تصنیف
مسائل اسلامی پر فلسفیانہ تنقید اور مفصل بحث ہے
سوانح حکیم ناصر خسرو و حالات تصانیف ... للعہ

زاد المسافرین: حکیم ناصر خسرو کی عدیم المثال اور
نادر الوجود تصنیف فلسفہ و حکمت اسلامی پر پہلی بار کمال
اہتمام و شان سے چھپی ہے حجم ۵۰۰ صفحات سے زائد قیمت ملے ر

سفر نامہ ناصر خسرو: حکیم مرحوم کے چشم دید حالات
اور چوتھی ہجری کے مفید معلومات مع مثنوی روشنائی نامہ
وسعادت نامہ۔ طباعت و کاغذ اعلیٰ ترین۔ سرنامہ
مطلا و رنگین۔ قیمت .... ہے

تذکرہ شاہ طہماسپ: شاہ موصوف کا خود نوشتہ
تذکرہ نہایت دلچسپ۔ قیمت .... عہ

طہران مخوف: فارسی کا نہایت دلچسپ ناول
مصنفہ مرتضیٰ مشفق کاظمی قیمت .... عار

دستور تار: علم موسیقی میں ستار کا درجہ سب سے بلند ہے
اس کتاب میں ایرانی و یورپی طریقہ ساز علیحدہ علیحدہ
دئے ہوئے ہیں اور ہر طرح کے متعلق نقشے دئے گئے
ہیں قیمت ۱ہ ۶ر

حمائل: چھوٹا سائز، اصل نسخہ حافظ عثمان کا فوٹو لیکر
جست کی پلیٹوں پر چھاپی گئی ہے۔ کاغذ سبزی مائل
نہایت خوبصورت جلد مطلا قیمت .... للعہ

بدائع سعدی: سیر لوکس وائٹ کنگ سی
ایس آئی۔ ایل ایل ڈی۔ ہمدرد پروفیسر فارسی ڈبلن یونیورسٹی
نے بدائع سعدی کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ
کیا ہے قیمت .... صر

دیوان غالب مطبوعہ کاویانی پریس

مکتبہ جامعہ نے دیوان غالب جرمنی سے چھپوایا تھا
جو بہت مقبول ہوا اور تھوڑے عرصہ میں ختم ہو گیا
دوسرا ایڈیشن نہایت اہتمام سے چھپوایا گیا ہے۔ مگر
جرمنی کی گرانی کی وجہ سے اخراجات پہلے سے
ڈیوڑھے آئے ہیں اسلئے اسکی قیمت عہ کی بجائے
للعہ کر دی گئی ہے۔

تیاتر: مرزا ملکم خان کہ جنکی قلمی و علمی جد و جہد سے
ایران دوبارہ زندہ ہوا۔ تین نثری ڈراموں کا
دلکش مجموعہ قیمت .... عار

موش و گربہ: عبید زاکانی مشہور ہجو گو کی
تصنیف جو بلی کی کہانی ہے ابنائے عصر کی
ہجو ملیح اور عہد حاضر سے تطبیق۔ ہر صفحہ رنگین
و لطیف مضحک بلاکس سے مزین نہایت دلچسپ
قیمت ۵ر

رہنمائے پسران: فارسی جدید کے نمونے در
بچوں کو خط و کتابت کے پیرایہ میں مفید نصائح
از مرزا محمود خان قیمت .... عہ

تلگراف بے سیم: بے تار کی تار برقی کے متعلق
کار آمد معلومات مع چند نقشوں و بلاکس کے۔ عہ

لغات المانی بفارسی: فارسی و جرمنی زبان
کے لغت کا جرمنی ایڈیشن قیمت .... عار

دوست داران بشر: بعض مرد و عورت
خاتونوں کی ملی و ملکی خدمات۔ بطور سوانحات۔
نہایت مفید مستند معلومات قیمت .... عہ

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ۔ دہلی

دیوان غالب مطبوعہ جرمنی

مکتبہ جامعہ نے دیوان غالب اردو بڑے اہتمام سے جرمنی سے چھپوایا تھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا اور دوسرے اڈیشن کی ضرورت محسوس ہوئی اور چند ہی ماہ میں پہلا اڈیشن ختم ہو گیا۔ جرمنی سے دوسرا اڈیشن اسی شان و اہتمام سے چھپوایا ہے۔ تو اب مکتبہ میں فروخت ہونے کے لئے موجود ہے۔ چھوٹی تقطیع، نہایت عمدہ اور پائدار کاغذ، جلد نہایت خوبصورت مطلّا کنارے سنہری، ایک دبے کے بکس میں احتیاط سے بند کر۔

جرمنی کی گرانی کی وجہ سے اخراجات
اس کی قیمت [illegible] کے بجائے [illegible] کر دی
کاویانی پریس کی تازہ مطبوعات بھی
ہیں جن کا اشتہار مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔

فہرست کلاں مفت طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ

منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

تار کا پتہ۔

"جامعہ" دہلی

فہرست مضامین

جلد ۶ | ماہ جنوری ۱۹۲۶ء مطابق رجب ۱۳۴۴ھ | نمبر ۱

ہندوستان کا قدیم فنِ طبّ جراحت

(سعید انصاری بی اے جامعی)

یوں تو ہندوستان کے قدیم علوم
ہیں جو اس عہد کے کسی مخصوص فن یا ادب
کے بعد اور سنسکرت زبان سے ہماری
چاہیں بھی تو براہِ راست ان تک نہیں پہونچ سکتے ۔ البتہ بعض اہلِ ... کی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اِس عہدِ زریں کے علم و فن کی کوئی جھلک ہمیں نظر آجاتی ہے ۔ مہامہوآپا دِھیا کویراج گنگا ناتھ سین سرسُتی انھی چند لائق ہستیوں میں ہیں جو سنسکرت زبان پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ فنِ طبّ جراحت سے بھی خاص ذوق رکھتے ہیں ۔ اِس فن پر اُن کی متعدد کتابیں سنسکرت اور انگریزی اور بنگالی زبانوں میں ہیں اور انھوں نے نہایت تحقیق و تلاش کے بعد یہ مضمون بھی لکھا ہے جو ایک مستقل تاریخ کی بجائے اگر کسی طب کے طالبِ علم کے قلم سے اردو کا قالب اختیار کرتا تو زیادہ مناسب تھا لیکن اِس خیال

سے کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ سے جہالت و ناواقفیت کا ایک سرا اٹھ جائے۔
راقم اس کام کے لئے آمادہ ہوا اور ممکن ہے کہ یہ کوشش ناظرین جامعہ کا شرفِ قبول
بھی حاصل کر سکے۔ (سعید)

اس غرض سے کہ ہندوستان کے قدیم فن طب و جراحت یعنی آیور وید کا ایک معمولی سا
خاکہ ہمارے ذہن میں آجائے سب سے پہلے یہ ضرورت ہے کہ اس کی ابتدا اور اس کے بعد اس
کے عروج و زوال کی مختصر تاریخ بیان کر دیجائے اور پھر ان اصول و مبادیات کی تشریح کیجائے
جن پر اصل فن کی بنیاد ہے۔ اس لحاظ سے فن آیور وید کی پوری تاریخ چار زمانوں یا ادوار
میں تقسیم کیجا سکتی ہے۔

(۱) ویدیا ما قبل تاریخ کا زمانہ (۲) مصنفین و محققین کا زمانہ
(۳) حکمائے کیمیا کا زمانہ (۴) انحطاط اور تالیف کا زمانہ

۱۔ ویدیا ما قبل تاریخ کا زمانہ

آیور وید کی تاریخ بیان کرنے سے قبل بہتر ہے کہ خود اس لفظ کی اصل پر غور کر لیا جائے۔
یہ مرکب ہے دو لفظوں سے "آیور" اور "وید" سے جسکے معنی ہیں "زندگی کا علم اور فن"۔ اس علم و فن
کا اصل پتہ ویدوں میں ملتا ہے جو دنیا کا قدیم ترین لٹریچر مانا جاتا ہے اور آج بھی آیور ویدک کے نظریے
ادویات اور طریقۂ علاج وید کے زمانہ کی کتابوں میں تلاش کرنے سے مل سکتے ہیں۔

آیور وید کی اصل ابتدا اور اس کے نشو و نما کے متعلق جو قدیم افسانے رواج پذیر ہیں وہ
بھی کسیطرح دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک قصہ میں ہے کہ برہما نے جو ہندوؤں میں خالق کائنات
مانے جاتے ہیں آیور وید کے علم کو اپنے مراقبہ کے ذریعہ سے پیدا کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے
سب سے پہلے یہ علم "پراجپتی دکش" کو سکھایا جن سے منتقل ہو کر یہ علم "اسوین" نامی دو دیوتاؤں

کو جو توام پیدا ہوئے تھے ملا ۔ ان سے یہ علم اِندر تک پہونچا جو سب دیوتاؤں کے راجہ مانے جاتے ہیں اور انھوں نے اس علم کو خوب ترقی دی ۔ ابتک یہ سب کچھ دیوتاؤں کی پاک اور مقدس سرزمین میں ہوتا رہا ۔ لیکن اس دنیائے آب و گل میں جب قدیم رشیوں اور منیوں نے لوگوں کو بیمار ہوتے اور مرتے دیکھا تو انھوں نے کوہ ہمالیہ پر اپنی ایک مجلس منعقد کی اور اس میں طے کیا کہ بھردواج کو اس کام کے لئے مقرر کیا جائے کہ وہ جائیں اور اندر سے اس علم کو سیکھ آئیں چنانچہ اُن کے ذریعہ یہ علم اِس دنیا میں پھیلا ۔ لیکن ایک دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں سب سے پہلے جس نے اِس علم کو سیکھا وہ دھنونتری تھے جو رشی بھی تھے اور راجہ بھی ۔ انھوں نے اندر سے یہ علم حاصل کر کے بنارس میں آیورویدک کے مدرسے کھولے اور ان میں خاصکر فنِ جراحت اور علم القابلہ (دایہ گری) کی تعلیم دیتے تھے ۔ غرض اِس طرح سے اندر کے دونوں شاگردوں بھردواج اور دھنونتری نے آیورویدک یعنی فنِ طب ... سے دو مختلف گروہ پیدا ہوئے ۔ بھردواج ... نام سے موسوم ہے اور دھنونتری سے جراحی ...

۲ ۔ رشی مصنفین اور تحقیق و تدقیق

ہر دو گروہوں میں سے اطبا کے گروہ میں چھ بڑے بڑے اشخاص گذرے ہیں جو بھردواج یا اُس کے شاگرد اتریا کے چیلے ہیں (بھاؤمشر کی روایت کے مطابق خود بھردواج کا نام اتریا ہے) ان چیلوں کے نام یہ ہیں :-

(۱) اگنویش (۲) بھیل (۳) جاتوکرن

(۴) پراشر (۵) ہریت (۶) شرآپنی

ان میں سے ہر ایک نے آیورویدک پر ایک نہایت مبسوط اور جامع کتاب لکھی ہے جو خود

اسی کے نام سے منسوب ہے۔ دوسرے گروہ یعنی جراحوں میں جو بڑے بڑے لوگ ہوئے ہیں وہ سب دھونونتری کے چیلے ہیں جو بنارس کے راجہ تھے اور تاج و تخت چھوڑ کر سادھو ہوگئے تھے ان کے چیلوں کے نام سشرت، بھوج، اوپادھینو، اور آیورایدا پوشکاوت گوپرارکشت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان میں سے بھی ہر ایک نے فن جراحت و علم القابلہ (دایہ گری) پر ایک کتاب لکھی ہے، جو اب بھی نظر ثانی شدہ صورت میں ملتی ہیں اور ان کے یا اور دوسری قدیم تصانیف کے حوالے تو بعد کی تصانیف میں بیشتر اور بکثرت ملتے ہیں۔ غرض یہ ہیں وہ مصنفین جنہوں نے فن طب جراحت میں تحقیق و تفتیش کا کام کیا اور آیورویدک میں جو بڑے بڑے گروہ ہیں ان کی ابتدا انہی سے ہوئی ہے

اس وقت سے یا بعض قدیم مصنفین کے خیال کے مطابق ابتدا ہی سے آیورویدک کے طریقہ علاج کی آٹھ مخصوص شاخیں ہوگئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شلیہ ۔ جس میں فن جراحی اور علم القابلہ دونوں شامل ہیں۔

(۲) شالکیہ ۔ جس میں ان اعضا کے امراض کا علاج ہے جو شانوں سے اوپر ہیں، مثلاً چشم، گوش، بینی وغیرہ

(۳) کایا چیکتسہ ۔ جس میں مرض لاحق ہونے سے پہلے حفظ ما تقدم کے طور پر اور مرض لاحق ہونے کے بعد دونوں حالتوں میں علاج کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

(۴) بھرت ودیا ۔ امراض دماغی کا علاج جس میں آسیب وغیرہ سب شامل ہے۔

(۵) کمار بھرتیہ ۔ جس میں بچوں کا علاج اور ان کے لئے دودھ وغیرہ کے نقائص اور ان کی اناؤں کی ضروری خصوصیات وغیرہ بتائی گئی ہیں۔

(۶) اگدتنترہ ۔ جس میں حیوانی سمیات مثلاً سانپ یا دیوانے کتے کے کاٹنے کا علاج بتایا گیا ہے

(۷) رشائن — جس میں افزائش عمر اور سر نو جوان ہونے کا طریقہ اور علاج بتایا گیا ہے۔

(۸) واجی کرن — جس میں مشتہی و مبہی ادویہ کا ذکر ہے۔

جو تحریریں کہ آجکل موجود ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تقریباً .. قبل ان مذکورہ بالا شاخوں میں سے ہر ایک پر ہمارے ان رشیوں نے متعدد محققانہ کتابیں لکھی تھیں۔ قدیم شارحین نے ان کے بکثرت حوالے دئے ہیں اور ان میں سے بعض تو اب بھی قلمی صورت میں یا نظر ثانی شدہ مطبوعہ حالت میں موجود ہیں۔ بعض اور کتابیں بھی تلاش کر کے نکالی گئی ہیں؛ مثلاً بھیلا سمھتیہ جو تنجور کے کتبخانہ میں تھی اور جسے اب کلکتہ یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ ان مستند کتابوں میں سے پچاس سے زائد کی فہرست خود مقالہ نگار کی بنگالی تصنیف آیور ویدسمھتیہ کے حصہ اول میں دی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ ابتک ان قدیم نسخوں کے لئے ہندوستان میں پورے طور پر تلاش و تفحص سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بالکل ہی نہ

خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ ان میں سے

خاصیتوں یا علاج کے طریقوں کے متعلق ایسے

جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قدیم رشی حصول علم کے لئے عقل و رائے کو روایات سے صریحاً نتائج پر بھینٹ نہیں چڑھا دیتے تھے بلکہ ان سے برابر کام لیتے تھے۔ اے کاش وہی جذبہ آج بھی ہم میں موجود ہوتا

(۳) حکماے کیمیا یا کیمیائی تحقیق کا زمانہ

اس دور کے ختم ہونے کے بعد غالباً تاریخ ہند کے لحاظ سے بدھ کے زمانہ کا ابتدائی حصہ رہا ہوگا، جبکہ ایک دوسرا گروہ (اسکول) پیدا ہوا جو سدھ، یا حکمائے کیمیا کے نام سے موسوم ہے انلوگوں نے متعدد معدنیاتی مرکبات دریافت کیں اور انھیں استعمال میں بھی لائے۔ مثلاً لوہا، پارہ جست اور ٹن وغیرہ۔ جن میں سے پارہ سب سے اہم ہے۔ ان معدنیات کا معمولی استعمال تو پہلے

بھی ہوتا۔ تھا لیکن فنِ طب میں ان سے ابتک کوئی کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس گروہ کے اشخاص کے نام بہ کثرت ہیں اور جو اُن کتابوں میں مل سکتے ہیں جو انھوں نے لکھی ہیں۔ ان تصانیف میں سے جو سنسکرت اور تامل دونوں زبانوں میں ہیں آج بھی بہت سی مطبوعہ صورت میں دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن اُسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ تعداد میں ابھی قلمی نسخے موجود ہیں۔ شمالی ہند اور بنگال میں اُن کی تصانیف اور طریقہائے علاج سے بہت کام لیا گیا۔ اور جو موجودہ آیور ویدک اور اس کے طریقہ علاج سے کسی طرح جدا نہیں کئے جا سکتے۔ جنوبی ہند میں اس فن نے ایک بالکل جداگانہ صورت اختیار کرلی اور "سِدّہ گروہ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ لوگ اپنی اصل اور ابتدا تامل کی قدیم تہذیب کے وقت سے بتاتے ہیں اور یہ آجتک ہندؤں کے فنِ طب اور اُن کے طریقہ علاج کے حریفِ مقابل بنے ہوئے ہیں۔ بنگال میں زیادہ تر وہ طریقہ علاج رائج ہوا جس میں معدنیات سے زیادہ نباتات سے کام لیا جاتا ہے اور جس نے سدّھ کے طریقہ علاج سے مل جل کر ایک جدید صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ آجکل کویراج "سسٹم" یا کویراج کے طریقۂ علاج کے نام سے موسوم ہے اور جس میں ہر دو طریقہائے علاج کے بہترین اجزا شامل ہیں۔ اِس طریقۂ علاج کو ہندوستان بھر میں شہرت حاصل ہے۔

(۴) انحطاط اور تالیف کا زمانہ

جب حکماء کیمیا کے ابتدا و عروج کا زمانہ گذر گیا اور اس کے بعد ہندوستان میں سیتھین، یونانیوں اور مسلمانوں کے پیہم حملے شروع ہونے لگے تو اس وقت اِس فن پر بہت کم محققانہ کتابیں لکھی جاسکیں۔ جسم انسانی کی چیر پھاڑ جو بہت ہی قدیم زمانہ سے رائج چلی آتی تھی اور اُس وقت بھی سشرت خود اسکا حامی تھا، اشوک نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے سے بند کرادی۔ یہ زمانہ جو ۸۰۰ ء سے ۱۶۰۰ ء تک پھیلا ہوا ہے، اس میں بھی آیوروید کے بعض لائق اور قابل مصنفین مثلاً بھگت اور شرن گدھر

وغیرہ پیدا ہوئے۔ ان میں سے پہلے مصنف بھگت نے اپنے کو قدیم مصنفین کی ان تصانیف کو جمع کرنے کے لئے وقف کر دیا جو نہایت سرعت کے ساتھ روز بروز زائل ہوتی جارہی تھیں۔ اپنی ان تالیفات میں انھوں نے ان تمام قدیم سمہیتوں کو بھی شامل کر لیا جو انھیں اس وقت دستیاب ہو سکیں۔ اپنی ان تالیفات کے ذریعہ جو اشٹنگ سنگرہ" (مجموعہ ہشت مقالات) اور اشٹنگ ہردے" (خلاصۂ ہشت مقالات) کے ناموں سے موسوم ہیں، بھگت نے آیور وید کی بڑی خدمت انجام دی۔ اسی زمانہ کے دوسرے مصنف شرن گدھر ہیں جو کسی قدر بعد میں شمالی ہند میں پیدا ہوئے انھوں نے بھگت کی قدم بقدم اتباع کی اور انھی اصول و بادیات پر ویسی ہی لیکن مختصر کتاب لکھی۔

بنگال اور قنوج میں اس عہد کے سب سے بڑے ...

ان کی قابل قدر تصنیفات انھی کے ناموں پڑ چکا

"بھاو پرکاش" (جو آیور وید پر بھگت کے تصا

اس موخر الذکر کتاب کے مصنف نے اپنی ت...

وغیرہ اور نئی نئی دوائیں مثلاً افیون اور ریوند چینی کا بھی ذکر کیا ہے۔

ترقی اور نشوونما کا زمانہ

گزشتہ ڈھائی ہزار سال میں آیور وید نے کس طرح نشوونما پائی اور کیسے کیسے ترقی کی، یہ ایک نہایت دلچسپ مطالعہ ہے یہ اس زمانہ کا ابتدائی حصہ تھا جبکہ یہ فن اپنے انتہائی اوج ترقی پر پہونچا اور چرک، سسشرت اور دیگر مصنفین کے ترجموں کے ذریعہ سے مصر اور عرب تک میں روشناس ہوا۔ البیرونی۔ ڈاکٹر وائز اور دیگر مورخین نے اس کی تصدیق بھی کی ہے لیکن آئیے ذرا ہم خود دیکھیں کہ اس فن نے اپنی مختلف شاخوں میں کہاں تک ترقی کی تھی۔

۱۔ علم تشریح یا اناٹومی۔

آیورویدجس زمانہ میں اپنے بام ترقی پر تھا تو اس وقت جسم انسانی کی چیر پھاڑ کی ضرورت کو بخوبی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سشرت اپنی کتاب میں لکھتا ہے :۔

"لہذا ہر شخص کو ایک مردہ لاش تیار کرنی چاہیئے۔ اور جسم کے ہر حصہ کو نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ چیر پھاڑ کر کے دیکھنا چاہیئے تاکہ جسم انسانی کا بالکل صحیح اور ٹھیک ٹھیک علم ہو۔ اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو"۔

(شریرمعنہ مصنفہ سشرت باب ششم)

چرک کا بھی یہی خیال ہے چنانچہ وہ یہ کہتا ہے کہ

"جو شخص جسم انسانی کے ہر پہلو کو بخوبی سمجھتا ہے، اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے آیوروید پر پورا عبور حاصل کیا ہے"۔

("ودیان" ۔ مصنفہ چرک ۔ باب ششم)

ابھی حال میں علم تشریح پر ایک نہایت قدیم کتاب "ششریر پدمنی" ملی ہے جو ۱۰۰۰ء کے قریب لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کو ڈاکٹر پی کورڈیر نے تلاش کر کے نکالا ہے اور اس کے اکثر اقتباسات ڈاکٹر ہورنلے نے اپنی قابل قدر تصنیف "ہندوستان کے قدیم فن طب کا مطالعہ" میں بھی دیا ہے علم تشریح پر ایک اور قدیم نسخے کا ذکر جس کا نام "شریر شاستر" ہے افریکٹ نے اپنی فہرست کتب میں بھی کیا ہے۔

قدیم علم تشریح کے آثار جو اب تک سشرت، بھگوت اور ان کے شارحین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کا یہ قدیم علم اب کس درجہ معدوم اور ناپید ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی آیندہ اس علم کو دوبارہ زندہ کرنیکے لئے اس میں کافی مواد اور مسالہ موجود ہے

خود مصنف مضمون نے سنسکرت زبان میں اس علم پر اپنی جو کتاب "پرانگ شریرم" لکھی ہے اس میں ان موادوں سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔

ب - علم منافع الاعضا یا فزیالوجی۔

اس علم کے مختلف خواص مثلاً ہاضمہ اور اخراج رطوبات وغیرہ کا اس زمانہ کے حکمائے آیوروید بخوبی علم رکھتے تھے۔ دوران خون کا مسئلہ بھی سنسکرت اور چرک کے زمانہ میں بخوبی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ چرک لکھتا ہے:۔

"اس بڑے مرکز سے جس کا نام قلب ہے ایسی رگیں شروع ہوتی ہیں جن سے جسم کے تمام حصوں میں خون پہونچتا ہے۔ اور جو شرائین کو تر و تازہ اور تمام ذی روح اشیاء کی حیات کو باقی رکھتا ہے۔ یہ تمام جسم کا دورہ کرنے کے بعد پھر اپنے مرکز یعنی قلب کو لوٹ جاتا ہے"۔

یہ کہ خون اپنی رنگینیت تلی سے حاصل کرتا۔ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس علم منافع الاعضا کا سب سے مشہور نظریہ "تری دھو" یا تری دوش" کے نام سے موسوم ہے جس کا ترجمہ بعض لوگوں نے "ہیومرل تھیوری" کیا ہے اور غلطی سے اُسے یونانیوں کے اسی نظریہ کے ہم معنی سمجھ رکھا ہے۔ صرف اسی ایک نظریہ پر علم منافع الاعضا علم تشخیص امراض علم الادویہ طب۔ جراحت۔ غرض تمام آیورویدک علوم کی بنیاد قایم ہے۔ اس نظریہ کی تشریح انگریزی کے رسالہ آیوروید (جرنل آف آیوروید) بابت ماہ جولائی ۱۹۲۵ء میں کیگئی ہے۔ جو صاحب اس کی تفصیل چاہتے ہیں وہ اس میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس نظریہ کو اگر موجودہ سائنس کی روشنی میں دیکھا جائے اور اُسکی

تشریح اس فن موجودہ کی کتب کی بنا پر کیجائے (جیسا کہ مصنف مضمون نے اپنی سنسکرت کی تصنیف ("سدھانت ندانم" میں کیا ہے) تو پھر اس میں کوئی ایسی بات نہیں رہجاتی جو موجودہ علم منافع الاعضا کے مطابق نہ نظر آتی ہو۔ آیورویدکے ہر معالج کے لئے یہ نظریہ اگر غلط بھی سمجھا گیا ہو، پھر بھی ایک نہایت اہم اور عملی پہلو رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس نظریے سے جو کلیات قایم ہوتے ہیں اُن سے بہت کام لیا جاسکتا ہے۔ امراض کا جو علاج اِس نظریہ پر مبنی ہوگا۔ اس کی کامیابی خود ایک نقطۂ پسند طبیعت کے نزدیک اِس نظریہ کے صحیح ہونے کی کافی دلیل ہی۔

(ج) علم الکیمیا یا کیمسٹری۔

حامیان "رس شاستر" یا حکمائے کیمیا نے جو ترقی اس علم کو دی ہے وہ بھی کچھ کم معلوم نہیں ہوتی ڈاکٹر پی سی رے نے اِس موضوع پر اپنی مشہور کتاب "ہندو علم کیمیا کی تاریخ" میں بہت کچھ لکھا ہے پارہ کے مختلف مرکبات اور مختلف امراض میں ان کے استعمال کو انھی حکمائے کیمیا نے دریافت کیا تھا دیگر معدنیات اور ان کے متعدد کیمیائی مرکبات بھی اِس زمانہ میں دریافت کئے گئے تھے اور ان کا عام طور پر استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ معدنیات کو تحلیل کر کے اُن کے مختلف کیمیائی مرکبات جو تیار کئے جاتے تھے اور جو بعض حکمائے کیمیا کے تیار کردہ ہوتے تھے، آج بھی آیورویدک اطبا کے ہاں استعمال کئے جاتے ہیں اور نہایت بہتر اور مفید نتائج مترتب ہوتے ہیں۔

(د) علم نباتات یا بوٹنی۔

علم نباتات میں بالخصوص اس کے عملی حصہ کا جہاں تک تعلق ہے اُس کے متعلق اب بھی چرکھ، سشرت، نگادھر وغیرہ کی کتابوں میں بہت کچھ مواد ملتا ہے۔ کچھ مواد بعض پرانوں مثلاً اگنی پران میں بھی موجود ہے۔ "منوسمرتیہ" اور دوسری تصنیفوں میں پودوں کو "استھاور جیو" یعنی حیوان ساکت کہا گیا ہے جنھیں رنج و خوشی کا احساس مانا جاتا تھا۔ اور اب توحیاتِ نباتاتی کے اس پہلو کو ہندوستان

کے مشہور سائنس داں سر جے۔ سی۔ بوس نے اپنے عملی تجربوں سے بالکل ثابت ہی کر دیا ہے۔ اسوقت پودوں کی بیماریوں کے تشخیص و علاج کا بھی ایک باقاعدہ علم مرتب ہو گیا تھا جو "ورکرش آیورویدا" یعنی طب نباتات کے نام سے موسوم تھا اور اس کے بعض حصّے اب بھی مذکورہ صدر کتابوں میں موجود ہیں۔

(۵) علم الادویہ یا میٹیریا میڈیکا۔

ان کتابوں میں جو "دراویا گن" کے نام سے موسوم ہیں، دواؤں اور کھانے کی چیزوں کے خواص ایسی اصطلاحات میں بیان کئے گئے ہیں جن کے معانی اگر صحیح طور پر سمجھ لئے جائیں تو دواسازی کے فن اور بعض دافع امراض ادویہ کا صحیح علم ہو جائے۔ بدقسمتی سے یہ اصطلاحات ان لوگوں کے لئے بالکل مختوم رہی ہیں جنہوں نے اُن کے معانی غیر صحیح ترجموں کے ذریعہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے آیوروید کے علوم نباتات و معدنیات میں نہایت اچھی او[ر] بعض بہا[ر] دوائیں [موجود] ہیں لیکن اسے صحیح [ثابت] کرنے کے لئے کوئی میجر چوپڑا جیسا شخص موجود ہو

(ی) علم دواسازی یا فارمیسی۔

اُس وقت یہ فن بھی بہت ترقی پر تھا اور [illegible] میں نکالتے تھے۔ پارہ اور دوسری معدنیات مثلاً لوہا، جستہ، ٹین اور ابرق وغیرہ [illegible] کیجاتی تھیں جنہیں انسانی طبیعت آسانی کے ساتھ قبول کر سکتی ہو۔ آیورویدک کے حکماء اُن ادویات کا استعمال نہایت کثرت سے کرتے تھے۔ "مکردھوج" جو اسی طریقہ سے تیار کیا جاتا تھا اس کا استعمال بڑے بڑے حکما مثلاً سر پارڈے لوکس وغیرہ نے بھی کیا ہے اور اس کے نتائج بھی اچھے نکلے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے کیمیائی مرکبات بھی استعمال کئے جاتے تھے اور اُن کے نتائج بھی اسی طرح قابل اطمینان ہوتے تھے۔

(س) طب بہ اصول اندفاع مرض۔

اِس طب میں ہمیشہ اِس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ علاج سے قبل تشخیص مرض صحیح ہونی چاہیئے۔ تشخیص کے طریقے اس وقت بھی وہی رائج تھے جو مغرب میں آج سے نصف صدی قبل تک استعمال کئے جاتے تھے۔ تشخیص کے لئے تمام حواس خمسہ (چرک کے یہاں ذائقہ ان سے خارج تھا) سے کام لیا جاتا تھا۔ آنکھ میں لگانے نیز دوسرے حواس کی امداد کیلئے مختلف آلات استعمال کئے جاتے تھے لیکن زیادہ زور اِس امر پر دیا جاتا تھا کہ ان حواس سے بلا کسی آلے کی مدد کے کام لیا جائے۔ نبض کا پورا علم حاصل کر لینا اُس زمانہ کا ایک معرکۃ الآرا کارنامہ تھا۔ گو اُس کا استعمال بہت بعد میں شروع ہوا۔ اِس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور نبض کی رفتار، مقدار اور تعداد کا صحیح صحیح علم حاصل کیا جاتا تھا تاکہ آیورویدک کے تین خاص اصول یعنی واَیو۔ پِتّ۔ کپھ اور سمت کی بھی اچھی طرح تعیین ہو سکے آج بھی آیورویدک کے ہر طبیب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اِس فن کو بخوبی سمجھتا ہوگا قارورہ دیکھنے کا طریقہ بھی اپنے اسی معمولی نہج پر رائج تھا اور بعض صورتوں میں اشد ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعدد امراض کی خصوصیت کو بھی اُس وقت بخوبی سمجھا جاتا تھا اور بعض امراض میں قدماء جراثیم کے وجود کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ ایسے امراض مثلاً مختلف قسم کے بخار۔ جذام اور دیگر جلدی بیماریاں تپ دِق، بیماریاں جیسے ہیضہ، طاعون وغیرہ کا ذکر اُن کے ہاں متعدی امراض کے تحت میں علیحدہ طور پر کیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگرچہ اِس زمانہ میں خوردبین یا اِس قسم کے دیگر آلات کا کوئی ذکر نہیں ہے پھر بھی قدما نے بعض ایسے جراثیم کا جو برہنہ آنکھوں سے نظر نہیں آتے اور جن سے اکثر امراض پیدا ہوتے ہیں ذکر کیا ہے۔

بہرحال آیورویدک کا تمام طریقۂ علاج "ترِی دوش" کے نظریہ پر مبنی ہے اور جس کی تمامتر بنیاد صحیح تشخیص اور صحیح علاج کے اصول پر قائم ہے۔ طبیب یا معالج کو بقول چرک یہ تاکید کر دی گئی ہے کہ وہ بیماری کی وجہ اور جگہ، شریانوں کی تبدیلیاں، علامات کی پہچان، مریض کی عمر، عادت اور مزاج

نیز موسم اور وقت علاج کی پوری طرح پر تعیین کرلے

(ح) طب بہ اصول حفظان صحت۔

(۱) اس اصول کے ماتحت ایک طریقہ تو عام حفظان صحت کا تھا جسے سنسکرت میں سوستھ درت کہتے ہیں۔ اس میں غذا حوائج ضروریہ اور سونے وغیرہ اور روز و شب کے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے رہنے سہنے نیز غذا اور پانی میں صفائی کا لحاظ رکھنے اور آب و ہوا کے متعلق اصول و قواعد بتائے گئے ہیں جو آیورویدک تمام بڑی بڑی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ہندو اور بودھ راجاؤں کے زمانے میں شاہی باورچی خانوں کی نگرانی کے لئے خاص خاص اطبا رکھے جاتے تھے تاکہ وہ راجاؤں کے کھانے کی ان کے دسترخوان پر جانے سے پیشتر اچھی طرح دیکھ بھال کرلیں۔ فوجیں مہم پر جاتیں تو اس وقت بھی ان کے ساتھ اطبا اور حکماء کی ایک جماعت ہوتی جن کا کام حسب ضرورت راستہ میں فوجیوں کے

آب و خور کی تحقیق و تفتیش کرنا ہوتا تھا اس سلسلہ

بھی مختلف طریقے بتائے گئے تھے۔ ان میں

ہیں آج بھی ہندوستان کے مختلف گوشوں

(۲) دوسرا طریقہ خاص حفظانِ صحت کا تھا جسے سنسکرت میں رسائن اور [illegible]

یہ دونوں طریقے آیورویدک طب کے دو آخری شعبے ہیں جو اندفاع حفظ کو سب سے مقدم اور ضروری شے خیال کرتے ہیں اور اس کے لئے اس میں نہایت وضاحت اور تشریح کے ساتھ اصول اور قواعد بتائے گئے ہیں انکی خاص غرض یہ ہے کہ ان اصول و قواعد کی پابندی کرکے صحت عامہ کا معیار نہایت بلند رکھا جائے انمیں تناشوئی کی عام صحت اور اس سے متعلقہ امور کیلئے اصول و قواعد کا ذکر کیا گیا ہے اور ضعفا کیلئے دوبارہ شباب لانے کے طریقوں کا بھی ذکر ہے۔ عام بہبودِ انسانی کے لئے اس علم کا مطالعہ اور ان اصول و ضوابط کا برتنا آج بھی تہذیب و شائستگی کے خیال سے متروک نہیں کیا جاسکتا۔ (باقی دارد)

اضافیت اور خودی

(مترجمہ سید نذیر نیازی از کرسینٹ)

(۱)

جس آسانی سے ہمیں خارجی اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اسی قدر ہم اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں موجودہ سائنس کی رو سے تمام وہ باتیں جو کسی شے کے ادراک کیلئے ضروری ہیں ہمارے اندر رونما ہوتی ہیں، بایں ہمہ ہم تمام اشیائے مدرکہ کو خارج ہی میں دیکھتے ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً ستارے وغیرہ تو بعید مسافت پر نظر آتے ہیں، اب اگر ستارے محض اس عمل کا نتیجہ ہیں جو ہمارے اندر ظہور پذیر ہوتا ہے تو یہ خارج ہیں۔ کیوں نظر آتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ یہ فی الواقعہ خارج میں موجود ہیں؟ خیر ہمیں اس سے بحث نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ حقیقتاً ہم سے الگ مکانِ محض میں واقع ہوں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر وہ نظریہ ادراک جسے موجودہ سائنس پیش کرتا ہے درست ہے تو ستاروں کو خارج میں نظر نہ آنا چاہئے۔

(۲)

ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ ان اشیا کی حقیقت میں جن کا ہمیں علم ہے علم کو بھی کچھ دخل ہے یا نہیں؟ کیا اشیا کا علم ان اجزا میں سے تو نہیں جن سے ان کی تشکیل ہوتی ہے؟ طبیعات کی رو سے تو یہ ناممکن ہے کہ ہمارے علم کا کچھ بھی اثر موجوداتِ خارجی کی ذات پر پڑے۔ اس لئے کہ اگر ہمیں کسی چیز کا علم نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں۔ کسی چیز کے علم سے اس کے وجود و عدم وجود میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ ہم اس چیز کے مطالعہ میں نفسِ علم کو نظر انداز بھی کر سکتے ہیں چنانچہ علوم طبعی نے اپنی تحقیقات کے دوران میں مابعد الطبیعات کو بحیثیت ایک نظریۂ علمی کے برابر نظر انداز رکھا۔ لیکن

طبیعات کی یہ روش باوجود ان فوائد کے جو اس سے مترتب ہوئے دیر تک قائم نہ رہ سکی اس لئے کہ علم بجائے خود اُن حقایق تجربیہ میں سے ہے جو علوم تجربی کا موضوع ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ اہل طبیعات مابعد الطبیعات سے غافل رہیں۔ یقیناً انھیں اپنے تجربات میں اُسے اپنا رفیق کار بنانا پڑیگا۔ خوش قسمتی سے اس حقیقت کا اعتراف بالآخر ایک سائنٹسٹ ہی نے کیا ہے۔ چنانچہ آج آئین اسٹین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مدرکات ذہن کو ایکدوسرے سے گہرا تعلق ہے اور علم بجائے خود اُن اجزا میں سے ہے جن سے موجودات خارجی کی ترکیب ہوتی ہے گویا آئین اسٹن نے ایک طرح سے کانٹ کے تخیل کی تصدیق کر دی ہے۔ مدرکات ذہن کو باہم جو تعلق ہے اُس کی مزید توضیح غالباً نفسیات کے ذریعہ سے ہوسکیگی۔

(۳)

بہرکیف ہر وہ شے جس کا ہمیں علم حاصل ہوتا ہے ہمارے ساتھ ایک نسبت اضافی رکھتی ہے اور اُس کی شکل وصورت اور اُس کی ضخامت ہمارے اند[illegible]
یہ ضرور ہے کہ ہمارا انداز اور ہماری حیثیت کچھ بھی [illegible]
نظر آئیں گی۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ موجودات [illegible]
ہرگز نہیں یہ ناممکن ہے کہ موجودات خارجی کی دوامی موجودگی کو اُن کے استقلال اور اطلاق کا ثبوت بنا جائے۔ اس لئے کہ اس سے خود نظریۂ اضافیت کی تردید ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اضافیت کی رو سے عالم ومعلوم میں باہم نسبت اضافی ہے تو بلاشبہہ کوئی ایسی ذات ہوگی جسے موجودات خارجی اپنے سوا نظر نہ آئیں اور ضروری ہے کہ وہ ذات قید زمانی ومکانی سے آزاد ہو یعنی ذات مطلق جسے تمام وہ اشیا جو ہمیں خارج میں نظر آتی ہیں خارج میں معلوم نہ ہونگی۔ بغیر اس مفروضے کے یہ ناممکن ہے کہ موجودات خارجی کو ہم سے کوئی نسبت اضافی ہوسکے۔ البتہ ذات مطلق کے لئے یہ کائنات اپنے سے سوا نہیں ہے بلکہ اس کے شعور کی ایک گذرتی ہوئی کیفیت اور اُس کی غیر محدود زندگی کی ایک آن۔ آئین اسٹن نے بجا کہا ہے

کہ کائنات متعین ہی مگر غیر محدود۔ متعین اس لئے کہ بالفاظ قرآن یہ خدا کے مقدر علم کی ایک گذرتی ہوئی کیفیت یہ "شان" ہی اور غیر محدود اس لئے کہ خدا کی قوت تخلیق کی کوئی انتہا نہیں۔ قرآن نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہی کہ کائنات میں اضافہ بھی ہوسکتا ہی یہ آسان سی حقیقت فلسفے کے تمام ان انتخراجی نظامات اور حرکت زمانی کے تمام اُن نظریوں کے لئے موت کا حکم رکھتی تھی جو اس وقت ہر قسم کے آریائی تخیلات میں پھیلے ہوئے تھے لیکن قرآن کا زمانہ وہ تھا جب لوگ اس قسم کی باتوں کو بمشکل سمجھ سکتے تھے۔

(۴)

یہ معلوم ہوچکا ہی کہ ذات مطلق کو یہ کائنات اس طرح اپنے سے سوا معلوم نہیں ہوتی جیسے ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے لئے یہ ایک مستقل بالذات حقیقت ہے لیکن اس کیلئے محض شعور کی ایک کیفیت مگر سوال یہ ہے کہ کیا ذات انسانی بھی خدا کے شعور کی ایک کیفیت ہی یا اُس کی حقیقت اس خیال سے کچھ بڑھکر ہے؟ ذاتِ انسانی کی ماہیت تو یہ ہے کہ یہ سب سے الگ مخصوص بالذات ہی۔ کیا اس کا یہ مطلب ہی کہ ذات مطلق اور ذاتِ انسانی ایکدوسرے سے بالکل جدا اور مختلف ہیں؟ پرنگل پٹیسن کو افسوس ہے کہ انگریزی زبان میں خدا اور کائنات اور خدا اور ذاتِ انسانی کا تعلق بیان کرنے کے لئے صرف ایک ہی لفظ ہے یعنی "خلق"۔ خوش قسمتی سے عربی میں اس کے متعلق دو لفظ موجود ہیں "خلق" اور "امر" اول الذکر کو قرآن میں اُس وقت استعمال کیا جاتا ہی جب خدا کا تعلق دنیا سے مادیات سے دکھلانا منظور ہوتا ہے اور مؤخر الذکر کو اس وقت جب ذاتِ انسانی اور ذاتِ ایزدی کا تعلق بیان کرنا مقصود ہو اوپر کے نہایت ہی دقیق سوال کے جواب میں یعنی یہ کہ ذاتِ انسانی کی حقیقت کیا ہے" صرف یہ کہا جاسکتا ہی کہ " امر کا تعلق خدا سے وہ نہیں ہی جو "خلق" کا ہے اور "امر" اگرچہ فی نفسہٖ مخصوص ہی لیکن خدا سے علیحدہ نہیں۔ باینہمہ مجھے اعتراف ہی کہ میں اس تعلق کو عقلاً مولانائے روم سے بہتر نہیں سمجھ سکتا اُن کا ارشاد ہے ؎

اتصالِ بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

(۵)

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کسی وقت اس درجہ کو پہونچ سکتا ہے جہاں یہ کائنات اسے اپنے ست
سوا معلوم نہ ہو۔ صوفیا کے نزدیک اس مافوق العقل رتبہ کو پہونچنا ممکن ہے اور اُن کی رائے میں اس کا
طریقہ یہ ہے کہ تمام ان باتوں سے احتراز کیا جائے جو عقل کو حرکت دیتی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ
تصوف کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس نے بڑے بڑے انسان پیدا کئے
ہیں۔ لیکن میری ذاتی رائے میں تصوف کی یہ روش اپنے [illegible] کے باوجود زندگی کے بعض فرائض
کے لئے مہلک واقع ہوئی ہے اور زیادہ تر انسان کی اس [illegible] پر پہنچا ہے جو بجائے اس کے کہ عقل
کو کام میں لاکر مادیات پر غلبہ حاصل کیا جائے اس [illegible]
علم حاصل کرنے کا سب سے یقینی طریقہ یہ ہے کہ ال[illegible]
پیدا کرے۔ مجھے یقین ہے کہ تجربیت یعنی مرئیات
منزل ہے۔ قرآن کے الفاظ میں کائنات جو ہمیں اپنے سے [illegible]
بلکہ اس میں کئی ایک مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور ان میں سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ جو کوشش
ہمیں اس کی پیدا کردہ دقتوں پر غالب آنے کے لئے کرنا پڑتی ہے اسی سے ہمارے فہم میں وہ
نظر پیدا ہوتی ہے جو مظاہر عالم کی تہ کو پہونچتی ہے۔ بقول نظیری

نہ ہر مغزے کہ بوید نکہت از مصر و یمن گیرد
مشام تیز باید تا نصیب از پیرہن گیرد

موجودات کے مسلسل تغیر و تبدل کے اندر "حقیقتِ غیر زمانی" کو دیکھنے کیلئے غیر معمولی فہم کی ضرورت ہے

صوفیا اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ہر حقیقت اپنی صورت اور اپنے پیکر کے اندر موجود رہتی ہی اور وہی اس کے حصول کا آسان ترین وسیلہ ہی۔ یہ پیغمبرِ عربی تھے جنہوں نے سب سے پہلے اِس ناخوشگوار ایشیائی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور انسان کی توجہ تغیرات عالم کی طرف جو داخل و خارج میں ہر جگہ جاری و ساری ہیں منعطف کرائی۔ یہی ایک چیز ہی جس کو بجا طور پر سمجھنے سے انسان حقیقتِ ابدی تک پہونچ سکتا ہی۔ قرآن میں خدا کے متعلق آیا ہی "کل یوم ہو فی شان" اور ہمیں بتلایا گیا ہی کہ تغیر و اختلاف اِس کی سب سے بڑی آیات ہیں گویا قرآن نے ذاتِ انسانی کو اس حقیقت تک پہونچانے کے لئے ایک جداگانہ طریق عمل پیش کیا ہی جس کے متعلق بالفعل ذیل کی سطور کافی ہونگی۔

(۶)

کونٹ کیسرلنگ اپنے روزنامچے میں جس کا ابھی چند دن ہوئے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہی لکھتے ہیں "جو کیفیت لوگوں کو عرفانِ ذات کے لئے خانقاہوں کی طرف لیجاتی ہے وہی مجھے دنیا میں آنے کے لئے مجبور کرتی ہے" کونٹ موصوف نے جو کچھ کہا ہی بجا ہے۔ اِس لئے کہ دنیائے مادیات جو ہمیں اپنے سے سوا معلوم ہوتی ہے ہماری ذات کی دوسری شکلوں میں جلوہ گر ہونے کی راہ میں ایک ضروری مرحلہ ہے البتہ عرفان ذات کے متعلق کونٹ موصوف کی جو رائے ہی وہ میرے نزدیک یکطرفہ ہے اِس لئے کہ وہ لکھتے ہیں "میں ان تمام باتوں کے اثرات کو قبول کرونگا جن کا میں پیشتر سے تصور نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ گرم ممالک کی آب و ہوا ہو یا ہندوستانی طریقۂ شعور یا اہل چین کا دستورِ حیات ۔ اور دیکھوں گا کہ یکے بعد دیگرے اِن سے میرے اندر کیا تبدیلی پیدا ہوتی ہے" بہت ممکن ہے کہ اس طرز عمل سے ہماری عقلیات کی تکمیل ہو جائے اور ایک بلند فکر انسان اِن خیالات کو ایک باقاعدہ سلسلے میں منضبط کر سکے۔ لیکن یہ ناممکن ہی کہ اس سے ہماری خاک ایک انسانِ کامل کی صورت میں متشکل ہو سکے۔ انسان کی عقلیت اُسکی ذات کلی کا ایک پہلو ہی جس کے عرفان

کی یہ صورت نہیں کہ ہم اپنے ذہن کو کائنات کے مختلف اثرات قبول کرنے کے لئے طیار رکھیں اور پھر دیکھیں کہ اس سے ہماری زندگی کیا صورت اختیار کرتی ہے، نہ یہ اس طرح ممکن ہے کہ انسان ان موثرات کو عقل و فکر کے ماتحت ترتیب دیا کرے۔ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم تمام ان موثرات کو ان مقاصد اور ان اغراض کے لئے کام میں لائیں جو ہمارا نصب العین ہیں۔ عرفان ذات کے علاوہ اس سے انسان کو اس امر کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ وہ بجائے خود دنیا کی عظیم ترین قوتوں میں سے ہے یہ صرف عمل اور زبردست عمل کا نتیجہ ہے کہ انسان مکان و زمان کی قید سے آزاد ہو کر اپنی حقیقت کو کھوئے بغیر خدا کی ذات سے واصل ہو جائے جو وصل تصور کی انتہا ہے۔

دائرۃ المعارف النظامیہ

مسلمانوں کے اس دورِ انحطاط و تنزل میں سلطنت حیدرآباد دکن علمی و اسلامی خدمات کے لئے مغتنمات میں شمار کیجاتی ہے ۔ آج ہم اُس کے ایک علمی کارنامے سے ناظرینِ جامعہ اور ہندوستان کے علمی مجمع کو روشناس کرانا چاہتے ہیں ۔ اگرچہ اکثر اہل علم اس سے واقف ہوں گے لیکن اُس کی تاریخ اساس و ضرورت و نیز محرکین و عاملین سے کم لوگ واقف ہوں گے ۔ یقیناً اُس کے مطبوعات کا بڑا حصہ ہندوستان کے علاوہ مصر، اسلامبول، یورپ وغیرہ میں بھی پہونچ چکا ہے، مگر عام طور سے اُس کی کتابوں پر نقد و تبصرہ نہیں کیا گیا نہ اُس کی خدمات کا اعتراف ہوا۔ جس کی ضرورت تھی ۔ اور اگر صحیح طریقے پر نقد و تبصرہ ہوتا تو آج اُس کی حالت بہت اطمینان بخش اور ترقی پذیر ہوتی۔

عرصہ سے میرا عزم تھا کہ ایک مضمون مرتب کرکے اُس کی حسن خدمت کا اعتراف، گذشتہ کارروائیوں پر تنقیدی نظر اور آئندہ کے لئے طریق عمل میں جو ضروری اصلاحات درکار ہیں اون کا ذکر کروں تاکہ ارباب حل و عقد اُس کی طرف متوجہ ہو کر اُسے اعلیٰ مدارج ترقی پر پہونچائیں ۔ اس کے متعلق جسقدر ضروری مواد تھا نہ مل سکا۔ اِس لئے توقف کیا ۔ مگر چونکہ وقت گذر رہا ہے اور اصلاح کی بیحد ضرورت معلوم ہوتی ہے لہذا جو کچھ معلومات جمع ہوسکے انھیں پر اکتفا کرکے یہ کام شروع کر دیا گیا۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ایسا اہم و اعلیٰ کارنامہ راز و اسرار کی طرح پوشیدہ رکھا جائے بلکہ اسے عام ہونا چاہئے ۔ علمی رسائل میں اس پر بحث و تبصرہ ہو اور جسطرح دیگر محاکم ریاست میں روز افزوں ترقی و اصلاح کا دروازہ کھلا ہوا ہے اس پر بھی خاص توجہ کیجائے ۔ اس کو کسی محکمہ کے تابع رکھنے سے بہتر ہوگا کہ ایک مستقل محکمہ بنا دیا جائے ۔ بلاشبہہ اگر اُس کو باقاعدہ " دائرۃ الطباعۃ والنشر " بنا دیا جائے تو یہ ریاست کے لئے منفعت بخش اور علمی خدمت کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ کارنامہ ہوگا۔

نقد و تبصرہ کے متعلق ارباب صحائف و ارکان تحریر کا عام دستور ہے کہ مراعات و مدارات سے کام لیتے ہیں۔ حق و صداقت جو نقد کا جوہر اور اصل اصول ہے اس کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے علمی تنزل و انحطاط کا یہی اصلی باعث و علت ہے، یہ سلسلہ کسی ایک محکمہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہمارے مدارس، مکاتب، اور تمام معاملات اسی کے ماتحت ہیں۔ رعایت و مداہنت کا عنصر اسقدر غالب ہوگیا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی صحیح منزل مقصود تک پہونچنا محال ہے۔ نقد و تبصرہ وہ چیز ہے کہ اگر اسے صحیح طریقہ پر استعمال کیا جائے تو ہمارے تمام معاملات درست ہوسکتے ہیں اس سے آیندہ کی اصلاح اور موجودہ کی حقیقت منکشف ہونے کے علاوہ صحیح طریقہ عمل معلوم ہوسکتا ہے آجتک دائرۃ المعارف النظامیہ پر نقد و تبصرہ اس لئے بھی نہ ہوسکا کہ اس کی کتابیں علمی رسائل میں نقد کے لئے نہیں بھیجی گئیں۔ نہ اس کی سالانہ یا پنج سالہ یا اور کسی مدت کے اعتبار سے کوئی رپورٹ شائع ہوئی جس پر اہل نظر غور کرسکیں۔ یہ اشاعت اور مصر و یورپ کے علمی رسائل میں بغرض ریویو شائع ہوتی رہے۔

مضمون ہذا میں دائرۃ المعارف کے چہل سالہ عہد کی روداد پر ... ان اہم و ضروری امور کو بھی مفصل طور پر بیان کردیا گیا ہے جنسے علمی کارنامہ اعلیٰ مرتبہ حاصل کرسکے اس کی اشاعت کا دائرہ اقطار عالم پر محیط ہو۔ اس کی عظمت و عزت ہر ایک صحیح علمی ذوق رکھنے والا کرے۔ امید ہے کہ اراکین مجلس، اصحاب حل و عقد اسے بالخصوص بغور ملاحظہ فرمائیں گے۔

دائرۃ المعارف النظامیہ کی بنیاد ۱۲۹۸ھ فصلی میں رکھی گئی جسے آج ۴۰ برس ہوئے اس کے بانی عالیجناب نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی صاحب ہیں اور محرک و مؤید جناب ملا عبدالقیوم صاحب مرحوم تھے۔ پہلے سرکاری امداد بارہ ہزار سالانہ تھی۔ اثنا میں مولانا انوار اللہ صاحب مرحوم

مدار المہام امور مذہبی نے ایک مطبع اشاعت العلوم نامی اور قایم کر کے اس کی نصف امداد اپنے مطبع کے لئے مقرر کرا لی تھی۔ مگر اشاعۃ العلوم نے چند معمولی اردو کے رسائل شایع کرنے کے علاوہ کوئی علمی خدمت انجام نہیں دی۔ دائرۃ المعارف کی آمدنی اپنی نادر علمی مطبوعات کی بدولت ترقی کر گئی ساتھ کے نوادر کی مانگ ہر طرف سے ہونے لگی۔ مگر اصول تجارت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ عرصہ ہوا اس نے اپنی مطبوعات کا تبادلہ منشی نولکشور کی مطبوعات سے کیا تھا، جو کسی طرح نقصان سے خالی نہ تھا، اور جسکا قلق ہر صحیح مذاق شخص کو ہوگا۔ ایک مرتبہ میرے ایک تاجر کتب دوست نے کہا کہ دائرۃ المعارف والوں کی یہ حالت ہے کہ جرمنی سے اُن کی کتابیں طلب کیجاتی ہیں مگر وہ نہیں بھیجتے۔ ناچار اہل جرمنی نے مجھسے وہ کتابیں منگوائی ہیں۔ کچھ عرصہ سے تصحیح کے لئے معقول رقم (ایک لاکھ) منظور کیگئی ہے اور اب اُس کا مالیہ ضرورت کے لحاظ سے کافی ہوگیا ہے۔

ابتدا میں چونکہ جوش تھا اور کچھ باذاق لوگ خاص اہتمام رکھتے تھے اس لئے اکثر عمدہ اور منتخب ذخائر علمی کی اشاعت کیگئی جنمیں کتب حدیث ورجال کی چند کتابیں اپنی نظیر آپ ہیں۔ پھر ہر قسم کی رطب ویابس کتابیں شایع ہونے لگیں اور اکثر حصہ متاخرین کی تالیفات کا بھی نکل گیا جو اُس کے مطمح نظر سے بعید اور علمی مقاصد کے اعتبار سے ادنی ہے۔

اب اُس کی مطبوعات کی تعداد ۹۰ کے قریب ہے جنمیں اعلیٰ متوسط ادنی تینوں قسم کی ہیں۔ اُن کی فہرستیں متعدد بار چھپ کر شایع ہوتی رہی ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر فہرست مطبوعہ ۱۳۳۱ھ ہے جس کے بعد دو تین کتابیں اور شایع ہوئی ہیں۔ ایک خاص کیفیت جو ان تمام کتابوں میں یکساں طور پر نمایاں اور مابہ الامتیاز رکھی گئی ہے یہ ہے کہ وضع قطع، طباعت تصحیح، کاغذ کے اعتبار سے تمام کتابیں ایک درجہ اور ایک صف میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ اصول ارتقا کے لحاظ سے کوئی سروکار نہیں رکھا گیا۔ زمانہ کا مذاق بالکل بدل گیا مگر مطبع اپنی پرانی حالت پر قایم ہے۔ نہ حروف

تقطیع یا تصحیح میں کسی قسم کا تغیر ہوا نہ فن طباعت کے جدید ترین آلات سے کچھ استفادہ کا خیال پیدا ہوا۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ مجلس دائرۃ المعارف نے طباعت کے مخصوص قالب کے علاوہ کسی دوسرے قالب کو اپنے یہاں جگہ دینے سے بالکل انکار کر دیا۔ اور قدیم کتابوں کے واسطے قدیم طرز کو ہی سنتِ لازمہ سمجھ لیا۔

مشرق، مغرب، یورپ اور ہندوستان کے علمی کارناموں میں کسی قسم کا موازنہ مشکل ہے اس لئے نہیں کہ اہل مغرب بشریت سے کوئی بالاتر مرتبہ پا چکے۔ بلکہ اس لئے کہ وہاں جد و جہد اخلاص و صدق ترقی کی طلب۔ صحیح مذاق موجود۔ یہاں ہر ایک میں کمی ہی نہیں بلکہ مفقود۔ پھر وہاں ہر ایک کام کیلئے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے۔ امیر و غریب، رئیس و مزدور کی نظر میں تو علمی خدمتیں یکساں معزز و محترم ہیں۔ اگر غریب کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو امیر و رئیس مال و اسباب سے امداد کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ حاکم اپنی مملکت میں اس کی [illegible]
الگ اس کا مؤید ہوتا ہے۔ مشرق میں نہ ایسا [illegible]
ایک ادنیٰ مثال گیب میموریل فنڈ کی لیجئے۔
ہوتا ہے۔ اس کے خویش اس کے نام سے ایک فنڈ مقرر کرتے ہیں۔ [illegible]
السنہ مشرقیہ کی بہترین تالیفات شائع کر کے مناسب قیمت پر فروخت کرتا اور تمام بڑے بڑے عام کتبخانوں کو مفت بھیجتا ہے۔ اس فنڈ کی عمر بہت کم ہے مگر اس نے تین درجن کے قریب ایسی نادر کتابیں شائع کیں جو عربی فارسی ترکی کی بہترین کتابیں کہی جا سکتی ہیں۔ ہر ایک کتاب باعتبار انتخاب لاجواب۔ تصحیح و طباعت کا اہتمام تو یورپ کا حصہ ہے، ابتک مصر و اسلامبول وغیرہ نے بھی کوئی کتاب اس اہتمام سے نہیں شائع کی جیسا کہ یورپ نے اسلامی کتابوں کے متعلق کیا ہے۔
مصر و اسلامبول و ہندوستان میں عموماً جسقدر کتابیں شائع ہوئیں یا ہوتی رہتی ہیں ان میں

محض تجارت مدنظر ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے یورپ کے نزدیک خاص مقاصد ہیں یعنی علمی ضروریات کو پورا کرنا مخصوص فن کو اہل علم کے مطالعہ کے لئے مکمل کرنا اس لحاظ سے ہر فن کا ایک معتدبہ ذخیرہ شایع کیا گیا۔ ہمارے یہاں قصتے، ناول اور دیگر مخرب اخلاق و عادات خرافیات، رمل، جفر، تعویذ وغیرہ کی کتابیں زیادہ چھپتی اور بکتی ہیں۔ اس قسم کے لغویات کا ذکر بھی علمی مجمع میں نہیں آتا۔ نہ ایسی شایع کی جاتی ہیں۔ اسی طرح جس کتاب میں کوئی خاص اہمیت باعتبار اوس کی قدامت علمی تحقیق یا مولف کے اجتہاد کے نہ ہو وہ محض کتاب ہونے سے شایع نہیں کیجاتی۔ پھر تصحیح و تنقیح اور فہرست وانڈکس کا خاص انتظام بھی ایسا ہوتا ہے جو مطالعہ میں ہر قسم کی سہولت بہم پہونچاتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا کوئی مطبع نہیں۔ نہ ایسا کوئی مجمع ہے جو اس اہتمام و تنقیح سے کتاب شایع کرے۔ دائرۃ المعارف نے جسقدر کتابیں شایع کی ہیں خواہ وہ عربی کی ہوں یا فارسی کی ان میں نہ تو خصوصیتِ علمی کا لحاظ کیا نہ کسی مخصوص فن کی تکمیل کی نہ اُس کی صحت میں کوئی خاص سعی کی۔ اس قسم کی بے پرواہی صرف مضمونِ کتاب تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ کتابوں اور مولفین کتب کے نام تک غلط چھاپ دئے اور غلطی پر اکتفا نہ کی بلکہ اُس کی توجیہات میں بھی کافی محنت صرف کی۔ نمونہ کے طور پر لیجئے "تجرید اسماء الصحابہ" مطبوعہ ۱۳۱۵ھ ۔ اس کے جزاول کے ٹائٹل پیج پر یوں مرقوم ہے:-

"تجرید اسماء الصحابۃ للامام العلامۃ الحافظ فخر العلماء الدین ابی الحسن علی بن الاثیر النیسابوری"

جزو دوم پر اِس طرح مسطور ہے۔

"تجرید اسماء الصحابۃ للحافظ العلامۃ شمس الدین ابوعبد اللہ الذھبی"

گویا ایک ہی کتاب کے دو حصّے دو مختلف مولفین نے مرتب کئے ہیں عربیت کے لحاظ سے معمولی وغیر معمولی اغلاط حواشی و ٹائٹل پیج پر بکثرت ہیں۔ مثلاً للحافظ العلامۃ کے بعد ابوعبداللہ بجائے ابی عبداللہ لکھا ہے۔ اب ذرا محشی صاحب کی تحقیق بھی سنئے۔ جزو اوّل کے پہلے صفحہ پر لکھتے ہیں:-

موجودہ نسخوں میں اسی طرح تجرید اسماء الصحابہ لابن الاثیر لکھا ہوا ہے۔ اسی واسطے ہم نے ٹائٹل پیج پر یہ لکھدیا لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ ابن اثیر کی جامع کتاب اسماء صحابہ میں بنام "اسد الغابہ" ہے جس کی تجرید معہ زیادات حافظ ابو عبد اللہ الذہبی نے کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف کتاب ذہبی ہے نہ ابن اثیر"

خدا کا شکر ہے کہ محشی صاحب کو اصابہ کے مطالعہ کی توفیق ہوئی اور وہاں سے کچھ نہ کچھ سمجھے اسد الغابہ۔ اصابہ اور خود تجرید سب ان کے پاس موجود تھیں پھر انھوں نے کتاب کو بغیر دیکھے چھاپنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک یہ بھی تحقیق نہیں ہو سکا تھا کہ مولف کتاب کون بزرگ ہیں۔ ابن اثیر یا ابن ذہبی چھپ جانے کے بعد یہ خیال گزرا اور وہ بھی بصورت ظن نہ بیقین و جزم۔ اس کے بعد تمام کتاب میں جو ضروری تحقیق و تنقید درکار تھی اس [illegible]
نے جن کتب حدیث یعنی مسند احمد اور اصول ستہ
ابن ماجہ اور بقی بن مخلد کی مسند کے واسطے خاص
ابن مندہ وغیرہ کے لئے بھی مخصوص علامتیں رکھیں۔ [illegible]
سے از بس ضروری کام تھا۔ مگر اس کا کوئی خیال نہیں کیا گیا۔ نہ ناموں کی تصحیح کا کوئی اہتمام کیا۔ فہرست وغیرہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔

دوسری مثال کتاب الازمنۃ ابو علی مرزوقی ہے سنہ ۳۱ھ میں مجھ سے دریافت کیا گیا تھا کہ یہ کتاب طبع ہو رہی ہے اس کے مولف کا نام معلوم نہیں۔ میں نے نام مع حالات و سنہ وفات معجم الادباء یاقوت سے بتا دیا۔ کتاب جب طبع ہوئی تو پہلے ٹائٹل پیج پر ابو علی قطرب اس کا مولف بتایا گیا پھر اسے بدل کر ابو علی مرزوقی کیا۔ جس جگہ حواشی کی ضرورت تھی حواشی لکھے گئے اور تمام کتاب محرف و مصحف غلط در غلط کر کے طبع کی۔ چنانچہ اس پر بعض مستشرقین یورپ نے سخت اعتراض کیا اور دائرۃ المعارف

کے عملہ کی خرابی ظاہر کی۔ یہ بھی بتایا کہ مصحیین کے پاس قاموس کے علاوہ کوئی کتاب نہ تھی جس سے کتاب کی تصحیح میں مدد لیتے۔ بالآخر اراکین مطبع نے اُسے دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ کرلیا اور اس کے واسطے ایک مصحح مقرر کیا گیا۔ جو عرصہ تک کام کرتا رہا۔ میں نے بھی ان مصحح صاحب سے ملاقات کی ہے مگر جو شخص کسی چیز کو سمجھے ہی نہیں وہ اس کی تصحیح کیا کرسکتا ہے؟۔

غرضکہ جب کتاب کے مولفین کے متعلق اس طرح اجتہاد و تحقیق کیجائے تو دیگر مطالب کو کن کن اجتہادات سے سابقہ پڑا ہوگا۔ ان تمام خرابیوں کی بناء وہی نقد و تبصرہ نہ ہونا۔ کام کی جانچ کے کام کے لئے کوئی صحیح معیار مقرر نہ کرنا ہے۔ ہاں اہل علم کو اس قدر فائدہ ضرور پہونچا کہ قلمی نسخے کی جگہ ایک مطبوعہ نقل ہاتھ آگئی۔

کتاب شائع کرتے وقت اس کے متعدد نسخوں کی جستجو بہت کم کیجاتی ہے۔ تصحیح کا خاص اہتمام نہیں کیا جاتا۔ جو نسخہ اصل ٹھہرایا جاتا ہے اس کے سنہ کتابت وغیرہ کی اطلاع بھی نہیں دیجاتی۔ بیاض کے مقامات کو بہت جگہ ویسے ہی ملا کر چھاپ دیا جاتا ہے۔ بعض معمولی کتابیں مثلاً مرآۃ الجنان یافعی۔ معروف بہ تاریخ یافعی اس قدر غلط اور ترک و بیاض سے شائع کی کہ اس کا نہ چھاپنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کے متعدد نسخے ہندوستان کے کتبخانوں میں موجود ہیں۔ تہذیب التہذیب اور لسان المیزان کی تصحیح میں بعض کتبخانوں سے مدد لیگئی جن کے مہتمم شکایت کرتے ہیں کہ مطبوعہ نسخوں میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

دوبارہ کسی کتاب کو شائع کیا جاتا ہے تو اس کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا مثلاً استیعاب ابن عبدالبر۔ تذکرۃ الحفاظ دوبارہ شائع کی گئیں مگر نہ تصحیح کا کچھ مزید اہتمام ہوا نہ فہرست و انڈکس وغیرہ سے مطالعہ میں سہولت پیدا کرنے کی سعی کیگئی۔

یہ بات نہایت اہم اور قابل غور ہے کہ کتاب کو بلا فہرست انڈکس شائع کرنا بہت معمولی اور عام کام ہے،

خاص مطابع اور بالخصوص دائرۃ المعارف کو ہر ایسی کتاب جس کے انڈکس کی ضرورت ہو بلا انڈکس نہ شائع کرنا چاہئیے۔ تذکرۃ الحفاظ کے طبع جدید میں ایک فہرست طویل و عریض مرتب کیگئی ہے جس سے مطالعہ کرنے والوں کیلئے کوئی خاص سہولت نہ ہوئی بلکہ کتاب کی ہو بہو نقل ہے۔ اگر اس کو مرتب کر دیا جاتا تو مختصر اور زیادہ مفید ہوتی۔ اسی طرح ابھی ایک سال کا عرصہ گزرا کہ ایک کتاب المجتنی ابن درید کی شائع ہوئی ہے۔ جس کی فہرست مرتب موجود تھی۔ مگر مطبع والوں نے اُسے تحقیق کے لئے حاجت کرنا مناسب سمجھا، نیز اسلئے بھی کہ ابتک ایسا کام نہیں ہوا تو کہیں بدعت نہ سمجھا جائے۔ خوش قسمتی سے اس پر ایک مقدمہ بھی مہذب عربی میں لکھا گیا ہے جو مطبوعات دائرۃ المعارف میں اس موضوع پر پہلا قدم معلوم ہوتا ہے۔ ولادت مولف ۱۲۳ ثلث عشرین و مائۃ بتاکر سخت غلطی کی ہے حالانکہ ۲۲۳ ہونا چاہئیے یعنی ۲۲۳ھ کے واقعات کے لئے اصل عبارت مورخین کی نقل کرینا کافی تھا اس میں مولف مقدمہ سید ہاشم ندوی صاحب نے اپنے کوئی سطر صحیح نہیں لکھی گئی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ؛

وکان ہذا فیہ من المعائب، ولکن لا یفوت فضلہ واننا

علینا ان لا نلتفت الی معائبہ بل ننظر الی محاسنہ التی اقاق بھا علی ۔۔۔

ولا ننظر الی من قال۔ بل عذر لغفرانہ من اللہ تعالی۔ انہ کان بحرا واسعا فی العلم تعلم منہ کثیر من العلماء والادباء فی البصرۃ وفارس وبغداد وکذالک روی عنہ کثیر۔ کاش اس عربی عبارت کی جگہ اردو کا مقدمہ لکھا جاتا جیسا کہ مستشرقین یورپ غالباً عجز کی وجہ سے عربی مطبوعات کے ساتھ اپنی اپنی زبانوں میں مقدمے لکھا کرتے ہیں۔ اس مقدمہ کی بڑی مقدار انہ، کان کے نذر ہوگئی ہے۔ باقی کچھ حالات ہیں مگر وہ بھی اس طرح لکھے گئے ہیں کہ بے ربط۔ تصحیح کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ اس نئے سلسلہ میں مزید اہتمام کی ضرورت تھی۔ نہ اس قسم کی بے پرواہی واہمال وعجلت کی۔

اگرچہ عموماً اس قسم کا کوئی احساس نہیں معلوم ہوتا جس سے اس کی طرف اہل حل وعقد متوجہ ہوں۔ لیکن ایک جماعت ارکین مجلس کی ایسی ضرور ہے کہ وہ اس پر کافی توجہ مبذول کرے تو اس کی مطبوعات علوم اسلامیہ کی دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) بن سکتی ہیں۔ اب یک غور وفکر ہوتی تو آج پانچ ودچین کے قریب بہترین کتب اسلامیہ اس سے شائع ہو چکی ہوتیں اور یہ سلسلہ الذھب سلطنت حیدرآباد کی بہترین اسلامی وعلمی خدمت شمار ہوتا۔

دائرۃ المعارف میں یہ خصوصیت بھی ہونی چاہیئے کہ اس کی مطبوعات کا ایک معتد بہ حصہ مدارس عربیہ اسلامیہ کو بطور ہدیہ بھیجا جائے۔ نیز تمام کتبخانوں اور مخصوص علمی مطابع ورسائل میں بطور ہدیہ دیجا دین تاکہ وہاں سے سلسلہ قایم ہو اور بوقت ضرورت تصحیح ونقل ومقابلہ میں سہولت پیدا ہو۔ اس کی ترقی کے لئے ایک بات اشد ضروری ہے وہ یہ کہ ہندوستان کے اہل علم جنہیں علوم عربیہ اور کتب علمیہ سے شوق ورغبت ہے ان کی ایک منتخب جماعت بنائی جائے اور سب کو شریک مجلس کر کے سالانہ کوئی جلسہ منعقد کیا جائے۔ جس میں طباعت تصحیح۔ انتخاب کتب وغیرہ مدارج ضروریہ طے پائیں اور سالانہ کام پر تحقیقی نقد وتبصرہ ہو تاکہ آئیندہ کے لئے کتابوں کا انتخاب، تصحیح کا انتظام اور نسخوں کی جستجو وغیرہ امور کا بھی تصفیہ ہو۔

فنون کے متعلق اہل علم سے مخفی نہیں کہ تفسیر۔ حدیث۔ رجال وسیر۔ فقہ وتاریخ وغیرہ علوم اسلامیہ کی بیحساب نوادر ولطائف کتب ایسی ہیں جنکو اگر مرتب کر کے شائع کیا جائے تو بہت سے علمی واسلامی فوائد حاصل ہوں اور علمی دنیا کی تشنگی بجھانے میں بیحد ممد ومعین ہوں۔ نوادر کے علاوہ ہر قسم کی مشہور ومتداول علمی کتابوں کو خاص اہتمام وتصحیح سے شائع کرنا بھی ایک حد تک بہترین علمی خدمت ہے۔ مثلاً حدیث کی مشہور کتابیں خاص اہتمام وانڈکس سے شائع کیجائیں اس کی اشد ضرورت ہے۔

دائرۃ المعارف کی مطبوعات تین حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو اعلیٰ درجہ کی ہیں یہ ائمہ فن متقدمین یا متاخرین کی وہ کتابیں ہیں جن کی وجہ سے فن کی تکمیل، اس کے مشکلات و ضروریات کا حل اور علمی فوائد و اصلاحات کا ذخیرہ بہم پہونچتا ہے۔ مطالعہ کرنے والوں میں صحیح علمی مذاق پیدا کرتی ہیں۔ یہ کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) مستدرک حاکم (۲) کتاب الاعتبار للحازمی (۳) مسند ابی داود الطیالسی
(۴) الاستیعاب لابن عبد البر (۵) کتاب الکنیٰ والاسماء للدولابی (۶) تعجیل المنفعہ
(۷) لسان المیزان (۸) تذکرۃ الحفاظ للذہبی (۹) دلائل النبوۃ لابی نعیم
(۱۰) کتاب الازمنۃ والامکنۃ (۱۱) شرح السیر الکبیر للسرخسی (۱۲) مشکل الآثار للطحاوی

متوسط درجے کی کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) تہذیب التہذیب (۲) کتا...
(۳) تجرید اسماء الصحابہ (۴) الجز...
(۵) مجموعہ رسائل عقائد (۶) الص...
(۷) کتاب الروح (۸) الذخیرہ
(۹) الفائق فی لغۃ الحدیث (۱۰) المغرب فی لغۃ الفقہ (۱۱) مفتاح السعادۃ
(۱۲) دستور العلماء (۱۳) دول الاسلام (۱۴) مرآۃ الجنان للیافعی

معمولی کتابوں کی کوئی مد نہیں ان میں بعض بہت ہی ردی اور ناقابل التفات ہیں بعض ملتے میں کم و بیش ہیں مثلاً۔

(۱) الکہف والرقیم فی شرح بسم اللہ الرحمن الرحیم (۲) اعجاز البیان فی تاویل ام القرآن۔
فن تفسیر میں صرف یہی دو نادر کتابیں منتخب کیگئی ہیں جن کی کوئی اہمیت علمی نقطۂ نظر سے نہیں۔

نہ قران کے فہم میں اُن سے کوئی خاص ترقی کی امید ہوسکتی ہی حالانکہ ابتک علوم تفسیر کی بیشمار لوادر علیہ طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں۔ علوم القرآن۔ احکام القران۔ نظم القرآن وغیرہ میں سے ابتک معدودے چند کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بہت سی اعلیٰ تفسیریں ابتک نادر اور کمیاب ہیں۔

(۳) جامع المسانید کا نسخہ نہایت معمولی اور پہلے سے شائع شدہ ہی۔

(۴) کنز العمال۔ اگرچہ عمدہ ذخیرہ ہی مگر معمولی درجہ کی کتاب اور منتخب کے مصر میں شائع ہوجانے کے بعد اُس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

(۵) المعتصر من مشکل الاثار۔ ایک غیر اہم کتاب ہے۔

(۶) القول المسدد۔ شائع کرنیسے بہتر یہ تھا کہ مسند احمد کی فہرست اور مطبوعہ نسخہ کے اغلاط شائع کئے جاتے۔ ذیل میں یہ رسالہ بھی شائع ہوجاتا۔

(۶) الاحادیث القدسیہ (۷) شرح تراجم ابواب البخاری (۸) قرۃ العین فی ضبط رجال الصحیحین

(۹) رسائل خمسہ اسانید (۱۰) الروضۃ البہیہ (۱۱) السمط المجید

(۱۲) شفاء السقام (۱۳) استحسان الخوض (۱۴) الرسائل التسعہ

(۱۵) فتح المتعال (۱۶) الاقتراح (۱۷) الاشباہ والنظائر النحویہ

(۱۸) الخصائص الکبریٰ (۱۹) مصدق الفضل (۲۰) النفائس الارتضیہ

(۲۱) المنحۃ السراء (۲۲) التحفۃ النظامیہ (۲۳) رسالہ فی فضیلۃ العلم وغیرہ

معمولی اور غیر ضروری تالیفات ہیں۔

الجواہر النقی فی الرد علی سنن البیہقی کی طباعت اُس وقت مفید ہوتی جبکہ اصل کتاب السنن الکبیر شائع کیجاتی۔ سنا گیا ہی کہ آجکل سنن کا نسخہ زیر طبع ہی۔ کیا ہی عمدہ علمی خدمت ہو اگر اُس کے ذیل میں معرفۃ السنن والاثار بیہقی کا نسخہ بھی شائع کردیا جائے اُس کے نسخے ہندوستان میں موجود ہیں۔ حیدرآباد

میں بھی مولوی حسن الزماں صاحب مرحوم کے کتبخانہ میں اس کا عمدہ نسخہ میری نظر سے گزرا ہے۔

خلاصۃ الامر اصلاح کے متعلق ضروری امور حسب ذیل ہیں۔

(۱) مجلس کی طرف سے مخصوص اہل علم کو اپنے جلسہ میں مدعو کیا جائے اور ان کو رکن مجلس بنا کر تمام مطبوعہ کتابیں ان کے پاس بھیجی جائیں۔ انتخاب و طریقہ طباعت وغیرہ میں ان کی رائے حاصل کی جائے۔

(۲) مطبوعات کا ایک ایک نسخہ مشہور اسلامی دارالعلوم اور عام کتبخانوں کو ہدیہ بھیجا جائے۔ خاص علمی رسائل میں بھی ریویو کے لئے بھیجنا از بس ضروری ہے۔

(۳) محض نوادر وغیر مطبوعہ کتابوں کو مطمح نظر نہ بنایا جائے۔ بلکہ [illegible] کو ملحوظ رکھکر ضروری نادر قابل اشاعت کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور [illegible] کتابوں [illegible] کافی تصحیح و تنقیح [illegible] بعض مطبوعہ کتابوں کو از سر نو خاص تصحیح و اہتمام

(۴) طباعت، حروف، تقطیع وغیرہ میں ضرورت [illegible] بہتر ٹائپ حاصل کیا جائے اور تقطیع موزوں رکھی۔

(۵) تصحیح و فہرست بنانے کا خاص اہتمام کیا جائے۔ اس کے واسطے [illegible] جائیں اور مجلس اپنے ارکین علمی سے بھی بعض کتابوں کی تصحیح میں امداد لیا کرے۔ ضرورت ہو تو پروف کی تصحیح باہر سے کرائی جائے اور کتاب کے آخر میں غلط نامہ حسب ضرورت شائع کیا جائے۔

(۶) مطبع اپنی کتابوں کا تبادلہ مصر و یورپ کی مطبوعات سے کرے اور تجارت کا سلسلہ اس قدر وسیع کرے کہ ہر قسم کی علمی کتابیں مطبوعہ ہند و مصر و یورپ وغیرہ اس کے یہاں بکثرت موجود ہوں اور بکفایت ملیں۔

(۷) بعض جدید التالیف علمی کتابیں بقیمت خرید کر شائع کرے یا ویسے ہی علمی خدمت کیلئے انھیں اپنے مصارف سے طبع کر دے۔ اس سے اشاعت علم میں وسعت اور اہل علم کی ہمت افزائی ہوگی

علمی نوادر اور ضروریات مطبع کے لئے خاص خاص کتابیں ہندوستان اور ممالک غیر سے نقل وعکس وغیرہ کے ذریعہ سے حاصل کیجاویں اور دائرۃ المعارف کا ضروری کتبخانہ بھی ایک جامع کتبخانہ بنایا جاوے جس میں ہر فن کی کتابیں اِس قدر ہوں کہ تصحیح میں اُن سے پوری طرح کام لیا جاسکے۔

ان کاموں کے لئے پہلے مطبع کے مصارف میں بہت کچھ اضافہ ہوگا لیکن چند دنوں میں وہ خود اِس اضافہ کا بخوبی متحمل ہوجائیگا۔ اور تجارت کے اعتبار سے علوم مشرقیہ کا بڑا مخزن اور مرکز ثابت ہوگا۔ یہ تمام باتیں بطور اعتراض اور بیجا تنقید جو صریح ذم و ہجو کے مرادف ہی نہیں لکھی گئیں۔ بلکہ اظہارِ حقیقت اور اصلاح طریقت کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اُن کی غرض و غایت یہی ہے کہ مطبع اپنے مقاصد میں کامیاب اور علمی خدمت میں فتحیاب ہو۔ علومِ اسلامیہ و مطبوعات السنۂ مشرقیہ کا مرکز و مخزن بنے اور علمی سلسلہ میں سعی کرنے والوں کے واسطے رحمت الٰہی ثابت ہو۔ واللہ الموفق۔

محمد سورتی۔ پروفیسر ادبِ عربی
جامعہ ملیہ دہلی

عربی شاعری کی ابتدا

(بسلسلۂ ماسبق)

علاوہ بریں ادب کا ارتقا عام طور پر غیر مرتب سے مرتب کی طرف ہوتا ہے لاطینی ادب اس کا بین ثبوت ہے۔ عربی سجع اور نظم دونوں کو قرآن کی زبان سے یکساں مناسبت ہے۔ قرآن کی بعض عبارتوں کے سجع ہونے سے تو سخت سے سخت مذہبی آدمی کو بھی مشکل سے انکار ہو سکتا ہے بلکہ اکثر بحروں کی مثالیں بھی قرآن سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کے طرز سے ترقی کر کے شعر کے مختلف اوزان کا وجود میں آنا ایک ایسی بات ہوگی جس کی مثالیں [illegible] جا سکتی ہیں [illegible] اگر [illegible]

وہ پہلی کتاب ہوتی جس نے عربی ادب میں صنائع [illegible]

دعوی لوگوں کی سمجھ میں بھی آسکتا۔ اور معقول بھی ہوتا [illegible]

واقف اور نظم کی ان دلربائیوں سے جو جاہلیۃ کی شا[illegible]

یہ دعوی ذرا مشکل سے قبول کیا جاتا۔

مگر اس آخری دلیل کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ قبل از وقت ہے اس لئے کہ جس بات کو خود مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتے اُسے یقین کر لینے کا دوسروں کو کیا حق ہے۔ صاحب اغانی جو مسلمان ہے رسول عربی کے پیش رو ورقہ بن نوفل کا ایک شعر پیش کرتا ہے جس میں اُس نے اعلان کیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نذیر ہو کر آیا ہے اور لوگوں کو تلقین کرتا ہے کہ خالق کے سوا کسی کو نہ پوجیں (ج ۳۔ ص ۱۵) یہ قرآن اس دعوے کے کہ مکہ میں محمد (صلعم) سے پہلے کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا سراسر خلاف ہے قدام بن قادم کی ایک نظم میں وہ تعلیمات موجود ہیں جو قرآن کی خصوصیات میں سے ہیں حالانکہ قرآن اس کے بعد نازل ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن جب یہ دعوی کرتا ہے کہ

مشرکین عرب کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی تو اس کو یقین کرنا بظاہر ایک مسلمان کے لئے بھی لازمی نہیں ہے لیکن ہم جو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کی تحریری ادب کے وجود کے دعویدار ہیں ہرگز رسول عربی سے زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ خواہ ہم ان کے وہ خصائل مانیں یا نہ مانیں جو مسلمان بیان کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم عربی اشعار کا وجود حمیری رسم الخط میں تسلیم کریں دو چار نمونے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً لکھنے والے نے حارث بن حلزہ کے معلقہ کو جس میں اکثر مقامات پر ایک لفظ دونوں مصرعوں میں مشترک ہے کس طرح لکھا ہوگا۔ جنوبی عرب کی تحریر کا اصول ہے کہ ہر لفظ کے ختم پر ایک کھڑی لکیر کھینچ دیتے ہیں۔ اس قسم کی نظم میں تو یہ کچھ اچھا نہ معلوم ہوتا ہوگا۔ معمولی عربی خط تو بے شک اس قسم کے اشعار کے لئے مناسب ہے اس لئے کہ لکھنے والا آسانی سے ہر لفظ کو کھینچ سکتا ہے۔ اسطرح ساری تحریر میں کوئی نقص نہیں آئیگا لیکن یہ صورت جنوبی عرب کے رسم الخط میں تو شاید ہی ممکن ہو سکے تاہم اگر کہیں سے کوئی نمونہ مل جائے تو وہ اس اعتراض کا مسکت جواب ہو سکتا ہے۔

تاریخ اسلام میں نثر سے پہلے لکھی ہوئی نظم کی کتابوں کا ذکر آتا ہے طبری کے بیان کے مطابق ۸۳ھ میں کرمان کے قلعہ میں ایک کتاب ملی تھی جس میں ابو جلدۃ الیشکری کے اشعار لکھے ہوئے تھے یہ کتاب کوفہ کے ایک شخص نے لکھی تھی (ج ۲۔ ص ۱۱۰۲) طبری ہی نے ایک نظم اعشیٰ ہمدان کی پیش کی ہے جس میں ۶۵ھ کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اور جو اس وقت تک پوشیدہ تھی اور پوشیدہ تو صرف ایک مادی چیز رہ سکتی ہے۔ قاضی ابو یوسف نے ہارون الرشید (۱۸۰ تا ۱۹۳ھ) کے لئے ایک مجموعہ قوانین تیار کیا تھا۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ قرآن اور ان اوراق کی جن پر اشعار لکھے ہوں چوری سرقہ کے حدود میں نہیں آتی (کتاب الخراج۔ ص ۱۰۵) بظاہر اس کے یہی معنی ہیں کہ اس زمانہ میں قرآن کے علاوہ جو کتابیں عام طور پر رائج تھیں وہ اشعار کی کتابیں تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ رائے امام ابوحنیفہ کی ہے جن کی تاریخ وفات ۱۵۰ھ ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) کے حکم سے عربی اشعار (غالباً اسلامی) کا ایک مجموعہ تیار ہوا تھا۔ ابوتمام نے اس کے تقریباً ایک صدی بعد حماسہ کی ترتیب میں کتابوں سے مدد لی۔ غالباً اس تعلق کی بنا پر جو اس ابتدائی زمانے میں تحریر کو شاعری سے تھا۔ بعد کے آنے والوں نے یہ قیاس کر لیا کہ جاہلیت کی شاعری تحریری صورت میں محفوظ رہی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ حماد الراویہ کا جس نے لاتعداد اشعار قدیم شعراء کے پیش کئے ہیں بیان ہے کہ نعمان (۵۸۰ء تا ۶۰۲ء) نے حکم دیا تھا کہ عربی اشعار لکڑی کی تختیوں پر لکھے جائیں اور حیرہ کے ''سفید محل'' میں دفن کر دئے جائیں۔ جب مختار ابن ابی عبید ۶۵ھ میں کوفہ میں داخل ہوا تو اس سے کہا گیا کہ اس قسم کا ایک ذخیرہ یہاں مدفون ہے [illegible]
دنیا کے سامنے آیا۔ اگر واقعی یہ قول حماد کا ہے تو اس
ایسے اشعار پیش کرنا ہے۔ جن کا کسی دوسرے [illegible]
کوئی توجیہہ تو ہونی چاہئے تھی۔ آغانی میں اس [illegible]
کا بیان ہے کہ اس نے شاعری کو ایسا مسخ کر دیا ہے کہ مصنوعی اور اصلی [illegible]
ہے کہ ایک دفعہ مہدی نے حماد اور مفضل دونوں کو بلوایا اور زہیر کے ایک شعر کا مطلب پوچھا۔ مفضل نے مشکلات کو حل کرنے کی جہاں تک بن پڑا کوشش کی لیکن حماد نے فوراً جواب دیا کہ یہ قصیدہ اس شعر سے شروع نہیں ہوتا بلکہ اس سے پہلے تین شعر اور ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے قسم کھا کر اقرار کر لیا کہ یہ شعر اسی کے گھڑے ہوئے تھے۔ بہر حال وہ اشعار مروجہ نسخوں میں تو موجود ہیں (اغانی۔۱۳۔۴) یہ واقعہ مہدی کی خلافت سے پہلے کا ہوگا اس لئے کہ وہ سریر خلافت پر ۱۵۸ھ میں بیٹھا اور حماد کا انتقال ۱۵۵ھ میں ہو گیا تھا۔ کوفہ کے محققین سلطان اشعار کی اصلیت کے بھی قائل ہیں جنہیں حماد نے خالد القسری کی ضیافت طبع کیلئے خود لکھ کر قدیم

شعرا کی طرف منسوب کر دیا تھا (اغانی ۱۲-۱۴) ۔ یعقوت کا بیان ہے کہ سبعہ معلقات بھی اسی شخص نے جمع کئے ہیں کاش کسی زیادہ معتبر آدمی نے یہ کام کیا ہوتا۔ کوفہ میں اشعار کا دوسرا راوی جنّاد تھا۔ حماد کی طرح اسے بھی اشعار کا علم کم تھا لیکن سنا ثابت تھا۔ اس طرح ابتدائی عہد میں عربی اشعار جن لوگوں کے ہاتھوں سے جمع ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے تھے کہ جعل کو بری بات نہ سمجھتے تھے اسی زمانہ میں ایک شخص برزخ تھا اس نے امرؤ القیس سے کچھ اشعار منسوب کئے۔ پوچھا گیا کہ اس کی سند ؟ تو فرمایا کہ میں خود! گویا آپ کی سند بالکل کافی تھی۔

حماد کے کچھ دن بعد خلف الاحمر کا زمانہ آیا۔ اُس کی تاریخ وفات ۱۸۰ھ ہے اور یہ مشہور ادیبوں کا استاد رہ چکا ہے۔ یہ بھی اس معاملہ میں بہت بدنام ہے۔ ابن خلکان نے ایک روایت ابو زید کی سند سے بیان کی ہے جس میں خلف الاحمر نے اقرار کیا ہے کہ اس نے خود اشعار گھڑ کر انھیں قدیم شعرا کے نام سے کوفہ میں رائج کیا تھا۔ ایکبار سخت بیماری میں گھبرا کر اس نے اپنے جرم کا کوفیوں سے اقبال کر لیا لیکن بہت سے اور لوگوں کی طرح اسے معلوم ہوا کہ دھوکا دینا آسان ہے مگر اس کے بعد پھر سچی بات کا یقین کرانا بہت مشکل ہے۔ اسی کے ہمعصر ابو عمرو بن العلا (متوفی ۱۵۴ھ) کا نام بھی محققین کی فہرست میں بہت نمایاں ہے۔ آپ نے بھی اقرار فرمایا ہے کہ اعشیٰ کے ایک قصیدہ میں اپنا ایک شعر داخل کر دیا تھا۔ تعجب ہے کہ ایک ہی شعر پر اکتفا کیوں کی خلف الاحمر کا ایک شاگرد اصمعی تھا جس نے اشعار کا ایک معتدبہ حصہ جمع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں مدینہ میں ایک عرصہ رہا لیکن مجھے وہاں کوئی نظم اصلی نہیں ملی۔ اگر کسی قصیدہ میں یہ نہ بتایا جا سکا کہ مصنوعی اشعار کون سے ہیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے مصنف ہی کی تحقیق نہ ہو سکی (اغانی ۷-۱۱۰) حالانکہ اصمعی کی تنقید کچھ زیادہ سخت نہیں ہوتی۔ ایک شخص کے متعلق جس کا نام قیمان تھا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بدویوں سے اُن کے اشعار جا جا کر سنتا تھا اور انھیں متفرق بر جگہ

لکھ لیا کرتا تھا۔ یہ چوں سے جس وقت یہ اشعار بیاض پر منتقل ہوتے تھے تو ان کی صورت کچھ بدل جایا کرتی تھی۔ اس کے بعد جب یاد کرنے کا وقت آتا تب بھی کچھ ترمیم ان میں کیجاتی تھی۔ اور پھر لوگوں کو سناتے وقت بھی ان میں تھوڑا سا تغیر کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آخر میں کتنا حصہ اصلی بچ جاتا ہوگا اور یہ شخص اصمعی کی نگاہ میں مستند ہی۔ (ارشاد ۶ - ۲۱۵)

جامع اعظم ابوعمر شیبانی کے پاس کتابوں کا ایک صندوق تھا جس کا وزن چند سیروں سے زیادہ نہ تھا۔ جب کسی نے اُن کی کمی پر اظہار تعجب کیا تو اسے یہ جواب ملا کہ اصلی اشعار کا اتنی تعداد میں جمع کرنا بھی بڑی بات ہے (ارشاد ۲ - ۲۲۹) مگر یہ چھوٹا سا مجموعہ بھی مصنوعی اشعار سے خالی نہ تھا۔ ابوعمر کی ایک کتاب سے صاحب اغانی نے ایک قصیدہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسلام کے قبل کا ہے، روایت کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ عہد اسلام کی صناعیوں کا ثمر ہے (اغانی ۱۳ - ۴۰) یہاں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہئے کہ ان محققین سلف میں سے ایک کا خیال دوسرے کے متعلق کچھ بہت اچھا نہیں ہوا کرتا تھا ابن الاعرابی کے خیال میں نہ اصمعی ہی کسی کام کا آدمی تھا اور نہ ابوعبیدہ ہی۔ اور یہ خیال غالباً ان دونوں کا ابن الاعرابی کے متعلق ہوگا۔

تیسری صدی کا معیار بھی دوسری صدی سے کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اس زمانہ کا سب سے مشہور محقق مبرد ہے جس کی تعریفوں کے پل باندھے گئے ہیں۔ اس کے متعلق بھی دو واقعات حاضر ہیں۔ ایک دفعہ یہ کسی امیر کی ملاقات کے لئے گیا۔ اُس نے حدیث کے ایک لفظ کے معنی پوچھے۔ مبرد نے قیاس سے کچھ معنی بتائے۔ جس کے لئے امیر نے سند طلب کی۔ اُس نے بلا پس و پیش ایک شعر شہادت میں پیش کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسرا عالم اس امیر سے ملنے آیا۔ اس سے بھی یہی سوال کیا گیا۔ اسے

اتفاق سے اس لفظ کے صحیح معنی معلوم تھے۔ اس امیر نے جب مبرد کا شاہد پیش کیا تو اُسے اقرار کرنا پڑا کہ اس نے خود اس موقع کے لئے شعر گھڑ لیا تھا۔[1]

اس کے بعد ایک دفعہ لوگوں کو مبرد کے شواہد کے غلط ہونے کا شبہ ہوا تو انھوں نے ایک لفظ خود ایجاد کیا اور مبرد سے اس کے معنی پوچھے۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ اس لفظ کے معنی ردئی کے ہیں اور شہادت میں ایک شعر بھی پیش کر دیا۔ جواب اگرچہ غلط تھا لیکن سننے والے اس کی قابلیت کی داد دئے بغیر نہ رہ سکے[2]

یہی وجہ ہے کہ اشعار کے اہم مجموعوں کے متعلق بھی معلومات میں اتنا اختلاف ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قبیلہ ہذیل کے اشعار ایک مجموعہ کی صورت میں ایک موجود ہیں اور لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قبیلہ شاعری میں دیگر قبیلوں سے ممتاز ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے مشہور نحوی احمد ابن فارس ایک دفعہ اس قبیلہ میں گئے۔ لیکن انھیں کوئی آدمی ایسا نہ مل سکا جو ان شعرا سے واقف ہوتا۔ ان لوگوں میں سے بعض نے جنہیں کچھ شعر و شاعری کا مذاق تھا دو چار معمولی اشعار سنائے۔ جن کا اس قبیلہ سے کوئی تعلق نہ تھا[3]
اس مجموعہ کا مولف یعنی سُکری صرف ایک صدی پہلے گذرا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد اس قبیلہ میں جسکی وجہ سے یہ اشعار عالم وجود میں آئے ان کا چرچا اور زیادہ ہوتا مگر بظاہر اثر بالکل الٹا پڑا۔ کچھ عرصہ پہلے شاعروں کے نام تو معلوم تھے۔

---

[1] ارشاد (۱-۱۲۶)

[2] (ارشاد ۷-۱۴۸)

[3] - (مزہر ۲-۲۴۲) (۴)، ارشاد (۲-۵۰۸)

مگر اشعار یا قصائد کی نسبت اُن کی طرف بہت زیادہ مشتبہ سمجھی جاتی تھی۔[1] نظم کی ایک معتد بہ مقدار مجنوں بنی عامر کی طرف منسوب کیجاتی ہے۔ ایک ادیب نے بہت تکلیف اٹھاکر اس قبیلہ کے ہر خاندان سے اس شاعر کے متعلق دریافت کیا مگر معلوم ہوا کہ کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا۔ باوجود اس کے بھی نہ معلوم کیونکر اس کا نام دس پشت تک سلسلۂ نسب اور سال بسال کے واقعات مع طویل مکالمات کے دریافت ہو سکے۔

اس سلسلہ میں دو افسانہ سازوں کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔

دوسرے مقامات پر نہ صرف جعل سازوں کے نام بلکہ اُن کی تصنیفوں کی تصریح بھی موجود ہے۔ مثلاً یزید بن مفرغ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حمیری بادشاہ تبّع کے قصہ اور اُن اشعار کا جو اس سے منسوب ہیں مصنف ہے۔[2]

ابن اسحٰق کی سیرۃ میں جو اشعار جابجا نظر آتے ہیں اُن کے متعلق بھی شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔[3] بعض مقامات پر تو خود ابن ہشام نے انھیں مصنوعی ٹھہرایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں سے ایک شعر کے اصلی ہونے کے متعلق بھی کوئی قابل اطمینان دلیل موجود نہیں ہے۔ نُصَیب نے اپنی شاعری کی ابتدا یوں کی تھی کہ اشعار کہہ کہہ کر قبیلہ ضمرہ بن بکر بن عبد مناۃ اور خزاعہ کے مشہور شاعروں سے منسوب کر دیا کرتا تھا جب اُس نے یہ دیکھا کہ اُس کے اشعار نے انھی قبائل کے برگزیدہ اشخاص کے دربار میں

---

[1] - (اغانی ۲۰-۱۹)

[2] - (اغانی ۱۷-۵۲)

[3] - (ارشاد ۶-۴۰۱)

درجہ مقبولیت حاصل کر لیا ہو تو اُسے اپنی شاعرانہ قابلیت کا یقین ہو گیا۔ [۱]

اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قسم کے تجربے دماغی قابلیت کی دلیل ہیں۔ لیکن اگر سرداران قبائل کے یہاں ان اشعار کا مقبول ہونا صحیح ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ کہ وہ قدیم شعرا کے اشعار سمجھے گئے اور اس کے بعد اُن کو یہ یقین دلانا کہ یہ اشعار خود اسی کے ہیں قسیب کی قدرت سے بھی باہر رہا ہوگا۔ اسی طرح عبداللہ ابن زبیر کے بھائی جعفر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے اشعار عمر بن ربیعہ کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے اور اُسکا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اشعار اُس کے دیوان میں داخل کر دیے گئے۔ [۲]

یہاں اس کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اور امرا کی جانب سے اس قسم کے جعل سازوں کی کافی ہمت افزائی ہوتی تھی۔ مفضل اور حماد کا جو واقعہ مہدی کے دربار کا پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفضل کو بہت کچھ انعام ملا۔ لیکن حماد بھی خالی ہاتھ نہ گیا۔ ہارون الرشید نے ایک دفعہ دس ہزار درہم کا انعام اس شخص کے لئے رکھا جو الاسود بن یافور کا ایک قصیدہ سنا دے تعجب اس بات پر ہے کہ باوجودیکہ عراق، شام اور حجاز کے مشہور سردار جمع تھے مگر کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ [۳]

موفق نے جو خلیفہ معتمد کا بھائی اور حقیقت میں اس سے زیادہ صاحب سطوت

---

[۱] ۔ (اغانی ا۔۱۲۶)

[۲] ۔ (اغانی ۱۳۔۱۰۲)

[۳] ۔ (اغانی ۱۱۔۱۲۹)

تھا اپنے وزیر سے خواہش ظاہر کی کہ یہودیوں کے کچھ اشعار مہیا کرے۔ وزیر نے مبرد سے اس کے لئے کہا مگر اس نے جواب دیا کہ مجھے کسی ایسی نظم کا علم نہیں ہے لیکن حسن اتفاق سے ایک دوسرا ادیب جس کا نام ثعلب تھا چالیس سال سے یہودیوں کے اشعار جمع کر رہا تھا۔ اس نے اپنا مجموعہ پیش کیا اور اس کے معاوضہ میں جو کچھ پایا اس کا ذکر ہی فضول ہے۔

اشعار کے شائع کرنے والوں کی انھیں بے عنوانیوں کی وجہ سے روایات میں بجد اختلاف ہے۔ اغانی میں ایک جگہ ذوالاصبع کی ایک نظم میں چھ شعر بتائے گئے ہیں تھوڑی دور آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ بجائے چھ کے اس میں بارہ شعر ہیں۔ لیکن ذیل یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک مشہور محقق کے خیال میں صرف تین شعر اصلی ہیں مگر ابھی ایک اور روایت باقی ہے جس میں سترہ شعر موجود ہیں[1]

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس قسم کے جعل اور فریب سے اجتناب کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان میں نقد صحیح کا مادہ بھی موجود تھا یعنی یہ کہ وہ خود اشعار گھڑتے نہیں تھے اور اپنی روایت میں انھیں اشعار کو داخل کرتے تھے جن کے قدیم اور اصلی ہونے کا انھیں کامل یقین ہوتا تھا۔ لیکن یہاں آن کر پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ماخذ اور ذرائع معلومات کیا تھے۔ پیغمبر اسلام کی بعثت عرب کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے اور اس کی وجہ سے اس ملک کے ماضی اور حال میں جو تباعد پیدا ہو گیا ہے اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ ملک عرب کے ہر حصہ سے لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر ایسے دور دراز ممالک میں جا بسے جنکا نام بھی اس سے پہلے شاید ہی سنا ہو اور خود ملک کے اندر اسلام

[1] (اغانی ۳ - ۲ و ۴ و ۱۰)

سے ابتدائی عہد میں جو جنگیں ہوئی ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ قدیم کفر و شرک کے مقابلہ میں
اسلام کا انداز ایک حقارت آمیز رواداری کا بھی نہیں رہا ہے بلکہ سخت سے سخت مخالفت
کا اعلان ابتدا ہی سے کر دیا گیا تھا اور کسی قسم کے معاہدہ یا سمجھوتا ہونے کی گنجائش مطلق نہ تھی۔
شعرا کے متعلق تو بار بار کہا گیا ہے کہ وہ کفر و شرک کے نمایندے تھے۔ پھر آخر وہ کون لوگ
تھے جنہوں نے ان اشعار کو جو روح اسلامی کے سراسر خلاف اور اس عہد کی یادگار تھے جس کے
ختم کرنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا۔ یاد رکھا اور دوسروں کو سنایا۔ اس وقت کے احساس
کا پتہ اس روایت سے بھی چلتا ہے جو حماد کی طرف منسوب کیجاتی ہے یعنی یہ کہ جوش و خروش کے
زمانہ میں یہ نظمیں زمین کے اندر دفن کر دی گئیں تھیں اور ہیجان کم ہونے کے بعد اتفاقاً نکل پڑیں
اس مسئلہ کا دوسرا حل جس کے متعلق ہم آیندہ بحث کریں گے یہ ہے کہ شعرا در اصل کفر و شرک
کے نمایندے نہ تھے۔ بلکہ حقیقتاً مسلمان تھے جو کافروں کے بھیس میں نمودار ہوئے۔

چشمۂ خورشید

(پروفیسر محمد اکبر منیر - ایم اے)

جھپکی نہیں ہی آنکھ ستاروں کی رات بھر — عالم رہا ہی بزم فلک میں سرور کا

ہر گوشہ انجمن کا چراغاں بنا ہوا ہی — پیہم رہا ہی دور شراب طہور کا

ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے قدسی تھے محو رقص — لب پر تھا ورد نغمہ وید و زبور کا

تھی حوریوں کی آنکھ فرشتوں سے لڑ رہی — شیدا ہر اک فرشتہ تھا انداز حور کا

مستانہ وار پی کے تھے گردش میں اس طرح — درپیش ہو کسی کو سفر جیسے دور کا

مستی میں ایک حور سے ساغر جو گر پڑا — مشرق کی سمت ابلنے لگا چشمہ نور کا

تیری زباں میں جس کا لقب آفتاب ہی
وہ قدسیوں کی بزم کا جام شراب ہی

یہ جام بزم قدس کا ہی شمع زندگی — گر یہ نہو تو محفل کون و مکاں نہو

تارے نہ جگمگائیں شب تار میں کبھی — مہتاب کا چراغ کبھی ضو فشاں نہو

سبزہ اُگے نہ پھول کھلیں باغ و راغ میں — گلزار و کوہسار میں جوئے رواں نہو

ہر ذرہ خاک اس کی ضیا سے ہے مستنیر — اِس کے بغیر نور زمین و زماں نہ ہو
یہ سرِ زندگی ہے اسے خوب یاد رکھ — گر وہ جواں نہ ہو تو کبھی یہ جہاں نہ ہو
اٹھ، پھوٹتا ہے چشمۂ خورشید تابناک — بیگانۂ حقیقت سود و زیاں نہ ہو

پی بھر کے جام چشمۂ آبِ حیات سے
اور آشنا ہو رمزِ حیات و ممات سے

غزل

(شوکت علیخاں فانیؔ۔ بدایونی)

امیدِ التفات کو رسوا نہ کیجئے — لازم نہیں کہ خونِ تمنا نہ کیجئے
شرمندہ وہم رشک سے اتنا نہ کیجئے — آئینہ دیکھکر مجھے دیکھا نہ کیجئے
اندیشہ عیشِ خواب لحد کا نہ کیجئے — ہنگامہ نزع وعدۂ فردا نہ کیجئے
کیا فرض تھی نگاہِ مکرر ازل کے بعد — یہ جان ہے، یہ دل ہے تقاضا نہ کیجئے
سرکار پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں — یہ بھی اگر روا ہے تو اچھا نہ کیجئے

فانی بلائے مرگ سے غم کیجئے غلط
اب جستجوئے دولتِ دنیا نہ کیجئے

غزل

(حضرت تپش خورجوی مرحوم)

ترے سوزِ دل کی چمک دمک، مرے داغِ دل کی ضیا ہے تو
سوئے عرش قصدِ عروج کر، کہ فرازِ آہِ رسا ہے تو

جو عیاں نہیں تو نہاں سہی، جو یہاں نہیں تو وہاں سہی
یوں ہی سیرِ نقلِ مکاں سہی، کہ چمن چمن کی صبا ہے تو

غمِ ہجر و بعد سے مضمحل، یہ خیال خام ہے مرگِ دل
دلِ زار عاشق زندہ دل، کہیں دلستاں سے جدا ہے تو

کہیں سوز و ساز میں منتظر، کہیں حسن و عشق میں جلوہ گر
سببِ تحیرِ ہر نظر، ہے تجھے خبر بھی کہ کیا ہے تو

ہے رگِ گلو سے تری رواں، وہ لہو کہ غرق ہیں دو جہاں
ازل و ابد ہیں یہ داستاں کہ شہیدِ مہر و وفا ہے تو

تو وہی قلندرِ مست ہے، تو سدا کا حسن پرست ہے
شب و روز عیدِ الست ہے، طرب آشنائے بلا ہے تو

تپش اب نہ مجھ سے یہ غم چھپا، ترا حال زار ہے برملا
تری گفتگو سے سمجھ گیا، کسی نازنیں پہ فدا ہے تو

غزل

(حضرت شاد عظیم آبادی)

اے ازلی الوجود اے ابدی البقا
دیکھ نہ کورانہ چل، حلقۂ طاعت میں آ

چین سے کر زندگی پاؤں کو پھیلا کے سو
شامِ ازل فرشِ خواب صبحِ ابد مسند کے

جوہرِ جاں تیرا اسم جان نہ تو فرق بین
نفسک نفسی درست لحمک لحمی روا

بزمِ حقیقت میں تو لائقِ تمجید ہے
تیری ہی توحید ہے قاطعِ کُن ماسوا

عرصۂ کون و مکاں ذرہ کے اندر نہاں
شہر ترا ہے وہاں جس کو عدم روستا

عقلِ عسر رائگاں ہیچ ہے سارا گماں
بازیِ طفلانہ جان مسئلہ ارتقا

نورک مراۃِ حق شاہد وے نہ طبق
سرِ تو بالا ز درک درک تو حیرت فزا

جوہرِ توحید تو سبحۂ تمجید تو
غازۂ روئے یقیں شانۂ گیسوئے لا

جلوہ کناں تو جہاں واں نہیں دخلِ گماں
نقشِ تو تحت الثریٰ شانِ تو فوق السما

لوحۂ مشقِ تو آئینۂ ہست و بود
ذکرِ تو حاجت روا نامِ تو مشکل کشا

مسلکِ سر میں ترے پاؤں بڑھانا حرام
فکرِ فلاطوں کو جان علتِ مالیخولیا

منکرِ امرِ رحیم صورتِ شیطانِ رجیم
ہر کہ زند بر زخت سیلیِ مکر و دغا

در صفتِ برتری چوں تو فلک کے بود
ذاتِ تو خالص لجیں وے بود اقلیما

کوچہ کا تیرے نشاں ہے وہیں مسلک جہاں
قتل رہا ہے ہدر، خونِ تمنا روا

آیۂ والفتح پڑھ جلد ہو تا سرنگوں
اپنی امیدوں کو جان جیشِ طویل اللوا

باندھ کے محکم کمر لے تبرِ نفیِ غیر
کاٹ کے سب پھینک دے خار و خسِ ماسوا

خالق و مخلوق تو مالک و مملوک تو
ساجد و مسجود تو تو بھی سر اپنا جھکا

روزِ ازل جو دکھا جوش میں آکر الست
ہوگیا بھر کیوں خموش دیکے صدائے بلیٰ

کلمۂ قالوا سے قال قال نہیں بلکہ حال
جمع کو واحد سمجھ لفظ کا دھوکا نہ کھا

انگشت سے اشکال دیکھ کان سے اصوات سن
جملہ شیونات کے معنی و مطلب لگا

تیری گلی کے فقیر مفتخرِ شاہ و میر
دست تو دریا نوال جو د تو فوق العطا

تیری خودی نے تو خود قید میں ڈالا تجھے
جوں جوں تجھے خواہشات پاؤں میں پھندا ترا

روح امر ہے تری اس کا عدم نادرست
موت ہے تبدیل جا اس سے عبث تو ڈرا

تیرے تو قانون کی ہے وہی محکم کتاب
جس کا ہے صرف اک ورق معرکۂ کربلا

عمر کے بڑھنے سے شاد گھٹ گیا زور زباں
پہلے تھا کُن جس جگہ اب ہے وہیں لب پہ لا

غزل

(حضرت مومن ٹونکی۔ سابق متخلص بہ یاس)

ہائے کس انجمنِ ناز سے تو آتی ہے
اے صبا تجھ سے مجھے رشک کی بو آتی ہے

تو نے بیتابیِ دل اور بھی بیتاب کیا
یاد تجھ سے مجھے اس شوخ کی خو آتی ہے

کبھی آنکھیں بھی ملیں گے کفِ پا سے ان کے
ابھی جا جا کے نگہ پاؤں کو چھو آتی ہے

گلِ امید سے بھرتا ہے فلک یوں دامن
آرزو آنکھ سے ہو ہو کے لہو آتی ہے

حرمِ خاص کا کرتی ہے وہی جان طواف
آبِ شمشیر سے جو کر کے وضو آتی ہے

جمع ہیں سیکڑوں ارمان شبِ وصل اے شرم
ایسے ہنگامہ میں کیا سوچ کے تو آئی ہے

اتنے دم خم بھی ہیں، یا دم ہی دئے جاتے ہیں
آپ کی تیغ کبھی تا گلو آتی بھی ہے ؟

تم اچھوتے سہی آغوشِ تصور میں تو ہو
نہ چھوئیں ہاتھ ہم، نگہِ شوق تو چھو آئی ہے

ان کے بیمار سے کیا تجھ کو سروکار اے موت
تجھ سے مرتا نہیں کمبخت جو لینے آتی ہے

تیغ کھینچی ہے تو آپ کھنچے بیٹھے ہیں
جان کھنچ کھنچ کے یونہی تا بگلو آئی ہے

چارۂ دردِ دل زخم طلب کیا جانے ؟
چارہ گر تجھ کو تو تدبیرِ رفو آتی ہے

گو دکھیلائے کوئی کوبس ہاہر اے موت
جان دیتا ہوں اسی وقت جو تو آتی ہے

منہ سے اب تک تو نکلتا تھا دھواں آہ کے ساتھ
دل کے جلنے کی بھی اب دیر سے بو آتی ہے

ظرف ہی شرط نہیں ہمت ساقی میں کلام
ایک دو جام سے نوبت بہ سبو آتی ہے

بزم احباب کو کرنا نہ پریشاں اے یاس
ہر سخن سے ترے اب درد کی بو آتی ہے

دامنِ گلچیں

میر

گو شگفتہ چمن چمن تھے گل ۔۔۔ غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار ۔۔۔ عشق کی پائی انتہا نہ کبھو

کتنی باتیں بنا کے لاؤں ایک ۔۔۔ یاد رہتی ترے حضور نہیں
عام ہے یار کی تجلی میر ۔۔۔ خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

پھرتے پھرتے عاقبت آنکھیں ہماری مند گئیں ۔۔۔ سو گئے بیہوش تھے ہم راہ کے ہارے ہوئے
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ ۔۔۔ اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

غالب

ہم غبارے رفت در چشم بیاباں دیدمش ۔۔۔ قطرۂ بگداخت بحرِ بیکراں نامیدمش
بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل می گفتمش ۔۔۔ رفت از شوخی بہ آئینے کہ جاں نامیدمش
بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم ۔۔۔ من ز غفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش

جبکہ نقشِ مدعا ہووے نہ جز موجِ سراب ۔۔۔ وادیِ حیرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث
قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہوکر سوئے دشت ۔۔۔ بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

اے اسد بیجا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث

قطعِ سفرِ ہستی و آرام فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبور خموشی
ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ
گلزار دمیدن شررستاں رمیدن
فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا
سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ
آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانہ و ما دارد و ما ہیچ

امیر مینائی

خاک میں بھی ملا چکے ہم کو
نہ ملے اب تو کب ملیں گے آپ
ہجر ہے کون آپ میں آئیے
مل رہوں گا میں جب ملیں گے آپ
آنکھ سے آنکھ دل سے دل ملجائے
کہئے اس طرح کب ملیں گے آپ
ڈھونڈھتا ہے عبث امیر سبب
ایک دن بے سبب ملیں گے آپ

آزمائش میں جان لیتے ہیں
خوب آپ امتحان لیتے ہیں
ہر قدم ہے بہ رنگِ نقشِ قدم
دم ترے ناتوان لیتے ہیں
نہیں ساقی یہ قلقلِ مینا
ہچکیاں نیم جان لیتے ہیں

مطبوعاتِ جدیدہ

کشاف الہدیٰ:- سیٹھ یعقوب حسن صاحب مدراس نے اپنے زمانہ اسیری میں قرآن کریم کو اپنی توجہات کا مرکز بنا رکھا تھا اور جب وہ جیل خانے سے نکلے تو ان کے ساتھ ایک بستہ بھی تھا جس پر یہ مصرع صادق آتا تھا۔

من تیز حاضری شوم تفسیر قرآں در بغل

ہرچند کہ سیٹھ صاحب موصوف نہ عربی کے عالم ہیں نہ کبھی باقاعدہ انھوں نے علوم دینیہ کی تکمیل کی ہے۔ لیکن وہ خلوص اور خلوص کے ساتھ ذہن و ذکاوت و علمی طبیعت رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے جو کچھ سمجھا یا سوچا وہ دینی اور علمی مذاق کے مطابق تھا۔

انھوں نے قرآن کی آیات کو مطالب و مضامین کے لحاظ سے مختلف ابواب میں جمع کر دیا ہے اور ہر باب کے خاتمہ پر اس باب کی آیات کی تفسیر بطور فوائد کے لکھ دی ہے اس طرح پر قرآن کی کل آیات نزولی ترتیب میں مضمون وار مرتب ہو گئی ہیں۔ ان کی اس تفسیر کا نام کتاب الہدیٰ ہے لیکن اس سے پہلے انھوں نے کشاف الہدیٰ کے نام سے اس کا ایک مقدمہ شائع کر دیا ہے۔ جس میں قرآن کی پوری تاریخ مرتب کر دی ہے اور جلال الدین سیوطی نے اتقان میں جو کچھ لکھا ہے تقریباً اس کا خلاصہ اس میں دیدیا ہے۔

انداز بیان۔ ترتیب اور مضامین کی قبولیت میں سہولت اور تسلسل کا لحاظ رکھا ہے۔ اور علم کو سلیس کر دیا ہے۔ غرض یہ مقدمہ جس خوبی سے لکھا گیا ہے نہایت قابل تعریف ہے۔ لیکن ابھی چونکہ اصل کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ سیٹھ صاحب کی توجہ

ایک ضروری امر کی طرف منعطف کراؤں جس کا مجھے امید ہے کہ لحاظ رکھا جائیگا وہ یہ کہ قرآن کی تفسیر اور اس کی آیات کی تاویل میں صرف روایات یا اقوال علماء ہی پر ہرگز اکتفا نہ کریں بلکہ پہلے خود قرآن کے مختلف مقامات سے اُس کے مفہوم کو سمجھیں کیونکہ ان روایات کا ایک بڑا حصہ اس قسم کا ہے جن کے ماتحت قرآن کی تفسیر کرنا تحریف معنوی کے مترادف ہو جاتا ہے۔
اس مقدمہ کی قیمت ۸ر ہے اور دفتر اشاعت سیڈ تمام روڈ مدراس سے ملسکتا ہے۔

اردو حروف کا نقشہ ۔ دائرہ معارف قرآنیہ آگرہ نے جو قرآن مجید کے معارف کو علوم و فنون حاضرہ کی روشنی میں پیش کر کے اسلامی تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے کے لئے قائم ہوئی ہے اردو حروف کا ایک بڑا نقشہ مرتب کیا ہے جس سے بچوں کو آسانی کے ساتھ حروف کی شکلیں اُن کے جوڑ اور ملانے کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ نقشہ میرے خیال میں چھوٹے بچوں کے لئے مفید بلکہ ضروری ہے۔ نہایت صاف ستھرا اور واضح بنایا گیا ہے تاکہ نگاہ پڑتے ہی حروف پہچانے جا سکیں۔ قیمت نقشہ رنگین ۱ر سیاہ ار ہے اور ناظم صاحب دائرۂ مذکور سے ملسکتا ہے۔

گلشن حیات ۔ یہ خان بہادر مولانا علی محمد خاں صاحب شاؔد عظیم آبادی کی سوانحعمری ہے جس کو سید معین الدین احمد صاحب قیس رضوی عظیم آبادی نے لکھ کر شائع کیا ہے۔ قیمت عہ ہے اور مصنف سے اقبال منزل لودی کٹرہ پٹنہ سٹی سے مل سکتی ہے
مولانا شاؔد اس وقت ادب اردو کے ایک ستون ہیں اور صوبہ بہار کی علمی عظمت کے یادگار۔ ضرورت تھی کہ ان کے سوانح حیات بسط کے ساتھ شائع کئے جائیں۔ اس لئے

تبسم صاحب نے یہ ایک علمی و ادبی خدمت کی ہے۔ مولانا کی مفصل سوانحعمری کے ساتھ ان کے خاص خاص شاگردوں کے بھی حالات دیئے ہیں۔ امید ہے کہ اہل ادب اس کتاب کی قدر کریں گے۔

بشریٰ ۔ شرکتِ ادبیہ نے مولانا سلیمان ندوی صاحب کے اس مضمون کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے اور اس پر مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس مضمون کا نفس موضوع اسلام کے خلاف ان غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے جو عام طور پر مستشرقین یورپ کی بدولت پھیل گئی ہیں۔ مولانا نے اسلام کی حقانیت کو نہایت پر زور اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے اور اسلام کے متعلق اس غلط فہمی کو پوری طرح رفع کر دیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کا نصب العین جنگ و پیکار ہے۔ یہ خیال کہ اسلام کا مقصد دنیا کی دوسری قوموں سے جنگ کرنا ہے اسی طرح بے بنیاد ہے جسطرح یہ خیال کہ اسلام کی تعلیمات میں رحم و کرم اور محبت و شفقت کے اوصاف بالکل نہیں پائے جاتے۔ درگذر، عفو و بخشش اور رحم و کرم کی تعلیمات اس کثرت سے قرآن کریم میں موجود ہیں کہ کوئی منصف مزاج شخص ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ باوجود اس کے کہ اسلام کا مقصد بھی دیگر ادیان عالم کی طرح دنیا میں امن و صلح قائم کرنا ہے۔ لیکن اگر اسی امن کے قیام کے لئے جنگ کی ضرورت درپیش ہو جائے تو اسلام اس سے منع نہیں کریگا۔ اسی طرح اسلام میں خدا کے رحم و کرم کے صفات کے ساتھ اس کی قہاریت بھی تسلیم کیگئی ہے۔ مستشرقین یورپ اسلام پر جو الزام لگاتے ہیں۔ فی الواقعی وہی اسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسلام، یہودیت اور عیسائیت کی افراط و تفریط میں ایک مفاہمت ہے۔ اسلام نے نہ تو یہودی مذہب کی طرح اعمال کی بنیاد خوف و خشیت پر رکھی ہے

اور نہ عیسائیت کی طرح محض محبت و شفقت پر بلکہ اسلام نے خدا کے دونوں قسم کے اوصاف
بتلائے ہیں اور عملی دنیا کے لئے ایک عملی راہ عمل تجویز کی ہے۔

مولانا نے ان تمام امور پر نہایت محققانہ طور پر روشنی ڈالی ہے اور یہ مضمون پڑھنے سے
تعلق رکھتا ہے۔

شرکت ادبیہ علیگڑھ نے سلسلۂ معارف اسلام کے نام سے جو سلسلہ مضامین کتابی
صورت میں اعلیٰ مضامین پیش کرنے کا آغاز کیا ہے اس سلسلہ کا پہلا نمبر رسالہ بشریٰ ہے۔
حجم ۴۸ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰ ۔ چھپائی لکھائی نہایت عمدہ۔ قیمت ۴ر ہے
شرکت ادبیہ علیگڈھ سے طلب کیجا سکتی ہے۔

ذکریٰ ۔ مولانا ابو الکلام آزاد صاحب یہ مضمون جو تذکار مقدس (ماہ ربیع الاول) کے نام سے
البلاغ میں شائع ہو چکا ہے سلسلۂ معارف اسلام کا دوسرا نمبر ہے جسے شرکت ادبیہ نے شائع کیا
ہے، یہ مضمون مولانا کے معرکۃ الآرا مضامین میں سے ہے اور خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی اردو
زبان کے بہترین نمونوں میں اس کا شمار ہو سکتا ہے۔ مولانا موصوف کی قادر الکلامی، زور تحریر
اور ان کی مخصوص طرز کا کسی کو اندازہ کرنا ہو تو اس مضمون سے بخوبی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔
مولانا انشائے اردو میں ایک خاص طرز کے موجد ہیں۔ ان کا انداز تحریر زبان انگریزی میں کارلائل
کے انداز سے بہت مشابہ ہے۔ کارلائل بھی ادب انگریزی میں ایک خاص طرز کا موجد تھا۔ جو
اسی پر ختم بھی ہو گیا۔

اس مضمون کا نفس موضوع میلاد رسول کریم ہے، جس خطیبانہ انداز سے اس کی تمہید اٹھائی
گئی ہے وہ فی الواقعی مولانا ہی کا حصہ ہے۔ تقسیم مذاہب، سمیاطیقی اور آرین مذاہب کا

مقابلہ اور اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے پر ایسی خوبی سے بحث کی ہے کہ تحقیق داد دیتی ہے اور فکر مرحبا و آفریں کہتی ہے۔

اسی رسالہ کا دوسرا حصّہ فسانۂ ہجر و وصال ہے جو اسی عنوان سے رسالہ البلاغ میں شائع ہو چکا ہے۔

رسالہ ذکریٰ کا سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہے۔ حجم ۸۶ صفحے۔ قیمت غیر مجلد ۸ر اور مجلد ۱۰ر ہے۔
ملنے کا پتہ۔ منیجر شرکت ادبیہ علیگڑھ۔

لائف آف محمد۔ یہ سیرت کی کتاب الہ آباد رفارم سوسائٹی کی طرف سے زبان انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔ مرزا ابوالفضل صاحب نے اس کے دیباچہ میں خود تبلایا ہے کہ یہ کتاب مختلف کتابوں سے ماخوذ ہے اور اس کا مقصد محض انگریزی داں پبلک اور طلباء کے لئے آسانی بہم پہونچانا ہے تاکہ وہ لوگ بھی جو ضخیم کتابوں سے استفادہ نہ کرسکتے ہوں اس کتاب کو پڑھکر دنیا کی ایک بڑی شخصیت کے حالات سے آگاہی حاصل کریں۔

اس کتاب میں یورپین مورخین میں سے ٹیلر۔ اسٹیفن۔ کارلائل اور گبن کے اقوال بھی نقل کئے ہیں اور یہ تبلایا ہے کہ یورپین مورخین بیجا تعصب کی عینک جب اپنی آنکھوں سے ہٹا دیتے ہیں تو ان کی زبانوں سے بھی رسول کریم کے بارہ میں بے ساختہ تعریف و تحسین کے کلمات نکل جاتے ہیں۔

کتاب کا سائز ۲۰×۳۰/۱۶ اور حجم ۱۵۱ صفحے ہے۔ قیمت ۱۲ر ہے
رفارم سوسائٹی الہ آباد سے طلب کیجا سکتی ہے

پردۂ غفلت ۔ اردو کا نیا ڈرامہ مصنفہ عابد حسین صاحب بی اے۔

خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان میں "ادب لطیف" کے نام سے جہاں بہت سی مہمل اور بیکار کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو رہا ہے وہاں بعض ایسی تصانیف بھی عالم وجود میں آجاتی ہیں جنھیں پڑھکر بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

"پردۂ غفلت" انھیں میں سے ہے مصنف نے اس ڈرامے میں عام مسلمانوں اور خصوصاً مسلمان رئیسوں کی سوشل زندگی کے بعض قابل اصلاح پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور چند اہم مسائل مثلاً عورتوں کی تعلیم و آزادی۔ پردہ، مشترکہ خاندان، رضامندی کی شادی۔ وغیرہ پر اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ فن ڈراما نویسی کے اعتبار سے شاید یہ پہلا ڈراما ہے جو اردو زبان میں اتنی کامیابی کے ساتھ لکھا گیا۔ جس طبقۂ زندگی کے حالات مصنف نے پیش کئے ہیں۔ تخیل کی خوبی اور نفسیات کے گہرے مطالعہ کے سبب اس کا بجنسہٖ نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ لفظ لفظ سے اس طبقہ کے خیالات و جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ زبان نہایت شستہ اور پاکیزہ ہے اور ادبی خوبیوں سے مالامال۔

ان باتوں کے قطع نظر اس کتاب کی ظاہری خصوصیات بھی قابل قدر ہیں۔ کتابت ٹائپ میں ہے اور اتنی خوب کہ لیتھو کے نستعلیق حروف میں بھی یہ بات نہیں پیدا ہو سکتی اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان میں بھی اس قسم کے ٹائپ رائج ہو جائیں اور ایسی عمدہ طباعت ہونے لگے تو ٹائپ کو مقبول بنانے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔ حروف کے بدنما ہونے یا مشکل سے پڑھے جانے کے سبب جو لوگ ٹائپ کو ناپسند کرتے ہیں۔ انھیں مطمئن کرنے کے لئے "پردۂ غفلت" کی کتابت و طباعت کافی سے زیادہ ہے۔

حجم صفحے ۱۴۶ - سائز ۲۲×۱۸ ۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ۔ شرکتِ ادبیہ علیگڑھ۔

قوس قزح - یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو زیر ادارت محمود وحید گیلانی صاحب شائع ہوتا تھا۔ اس کے مضامین میں تنوع ہے۔ ادب لطیف پر زیادہ توجہ کی گئی ہے اور رسالہ کا بیشتر حصہ افسانوں یا اور اسی قسم کے ادبی مضامین پر مشتمل ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحے۔ قیمت سالانہ للعہ ہے۔ منیجر رسالہ قوس قزح۔ مستی گیٹ لاہور سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

مشیر الاطبا - اردو زبان میں جتنے طبی رسالے جاری ہیں۔ ان میں مشیر الاطبا کو خاص اہمیت حاصل ہے اس کے مضامین کا معیار دوسرے رسالوں کے مقابلہ میں زیادہ بلند معلوم ہوتا ہے۔ ماہ دسمبر کے پرچہ میں طب قدیم و جدید اور تاریخ طب، ایسے مضامین ہیں جو نہ صرف پیشہ ور طبقہ کے لئے مفید ہیں بلکہ عام آدمی بھی اُن سے استفادہ کرسکتے ہیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ اس رسالہ کے مضامین میں عمق اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ تنوع بھی ہے۔ مختلف طریقہائے علاج کے عمدہ اصول کو تسلیم کرنا اس رسالہ کی پالیسی ہے اس لئے نہ صرف طب یونانی پر بلکہ ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک طریقوں پر بھی اس میں مضامین نکلتے رہتے ہیں۔ رسالہ محمد حسن صاحب قرشی کے زیر ادارت لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ ضخامت ۷۰ صفحے ہے۔ قیمت قسم اول ۱۲ اور قسم دوم عما ہے۔ ناظم چشمہ زندگی حویلی کابلی مل لاہور سے مل سکتا ہے۔

شذرات

گذشتہ چند سالوں میں جو تبدیلیاں حکومت ترکی میں رونما ہوئی ہیں وہ تمام عالم اسلامی کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ہر تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے پر یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا کہ عالم اسلامی میں یورپ کے تصادم سے جو بیداری اور اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کی خواہش پیدا ہوئی ہے وہ بمقابلہ اور ملکوں کے ترکوں میں زیادہ موثر طور پر کارفرما ہے عالم اسلامی میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے دو نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ ایک جماعت یورپ کی مفید باتوں کو اختیار کرنا چاہتی ہے اور دوسری ہر اس چیز کو رد کرنا چاہتی ہے جس کا یورپ سے کسی طرح بھی تعلق ہو۔ چونکہ ترکی اور مصر یورپ سے قریب ہیں اس لئے بہ مقابلہ اور اسلامی ملکوں کے یہ کشمکش ان ہر دو ممالک میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

ترک ایک حریت پسند قوم ہے۔ آزادی اُن کی سرشت میں شامل ہے۔ ان میں غلامی کی عادتیں ابتک نہیں پیدا ہوئی ہیں جو اور اسلامی ممالک کے افراد میں دوسری قوموں کے زیر تسلط رہنے سے پیدا ہوگئی ہیں۔ ترک اولوالعزم بہادر اور ارادے کے پکے ہیں۔ جب وہ کسی بات کا تہیہ کر لیتے ہیں تو کبھی ڈھیلے نہیں۔ ترکوں میں بہت عرصہ سے ایک ایسی جماعت موجود تھی جو نظام خلافت کو اپنی قومی ہستی کے لئے مضر خیال کرتی تھی اور اس نظام خلافت کے برسر اقتدار ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی اصلاحی جدوجہد نہ کرسکتی تھی زمانہ کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست ریخت سے دنیا سمجھی کہ یہ قوم فنا

سب ختم ہو جائیگی۔ لیکن یہ اس ابتلائے عظیم سے ایسے نکلے جیسے آگ سے کندن، عظمت پارینہ کھنڈروں سے اپنے قومی وجود کو سنبھال لیا بلکہ اپنی قومی اصلاح کو کامیاب بنانے کا پورا پورا موقع مل گیا۔

مصطفےٰ کمال اور اُن کے روشن خیال رفقائے کار نے ترکی جمہوریت قائم کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ دراصل ترکان احرار کا ایسا شاندار کارنامہ ہے کہ تاریخ اُس کی دوسری مثال نہیں پیش کر سکتی۔ انگلستان، فرانس، اور امریکہ اس وقت جمہوری طرز حکومت کے لئے مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان ملکوں میں بھی استبداد اور غیر ذمہ دار حکومت بغیر خون کی ندیاں بہائے نہیں حاصل ہو سکی۔ استبداد کی اپیل ہمیشہ تلوار سے ہوتی ہے کیونکہ اُس کے پاس سچائی نہیں ہوتی کہ وہ سچائی کے مقابلہ میں پیش کر سکے۔ ترکی میں حالات ایسے پیدا ہوتے گئے کہ مصلحین کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنیکا پورا موقع مل گیا۔ جنگِ عظیم کے دوران میں قدیم نظام حکومت کی نااہلی سے قوم کا سارا شیرازہ بکھر گیا اور ساری ترکی قوم اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو آمادہ تھی جو اُس کی شیرازہ بندی کر سکے یہ حسن اتفاق ہے کہ پہلا شخص جس نے اِس بات کا بیڑا اٹھایا جماعتِ مصلحین کا ایک فرد تھا جس کے خوابوں کی تعبیر آج ہم جمہوریۂ ترکی میں عملی طور پر پوری ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

یہ ترکوں اور عالم اسلامی کی خوش قسمتی ہے کہ ترکوں کی موجودہ برسرِ اقتدار جماعت کے خیال میں نہ تو یورپ کے خلاف بیجا تعصب ہے اور نہ غلامانہ نقل کا جذبہ انکا محرک عمل ہے۔ وہ اپنی قومی ضرورت کو واقعات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اسی پر اُن کے اعمال کی بنیاد ہے

وہ یورپ کے ہر خیال کی اس لئے تائید نہیں کرتے کہ وہ یورپ کا خیال ہے اور نہ وہ یورپ کے ہر انسٹیٹیوشن کو اس لئے رد کرتے ہیں کہ اس کا تعلق سرزمین یورپ سے ہے، کوئی خاص خیال یا انسٹیٹیوشن ایک جغرافی حدود کے اندر رہنے والوں کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ اپنی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ دوسری قوموں کے خیالات اور نظامات سے فائدہ حاصل کرے اور واقعہ یہ ہے کہ بنی نوع کی ترقی اسی میں ہے کہ قومیں اپنی مخصوص ضروریات اور خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپس میں ایکدوسرے سے مستفید ہوتی رہیں۔

موجودہ ترکی حکومت پر ایک یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے دائرۂ عمل کو محض ریاست کے بقا کا جہانتک تعلق ہے محدود نہیں رکھا بلکہ انفرادی زندگی کے ہر معاملہ میں اس کی دخل اندازی جاری ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک بیوی سے زیادہ نکاح قانوناً جرم قرار دیا گیا ہے قدیم عربی مدارس بند کر دئے گئے ہیں اور ان کی بجائے سرکاری مدارس میں بچوں کی تعلیم لازمی قرار دیگئی ہے اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ ایک مخصوص لباس سرکاری دفاتر اور کارخانوں کے لئے لازمی بنا دیا گیا ہے۔ یہ اعتراضات اکثر ان لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں جن کے نزدیک بیجا تعصب اور قدامت پرستی قومی ترقی کے مرادف ہیں حالانکہ انسانی ترقی کسی مقام پر ٹھہر جانے میں نہیں بلکہ آگے بڑھنے میں مضمر ہے۔ مذہب معاشرت اور سیاست کا اصلی مقصد حیاتِ انسانی کی تکمیل و ترقی ہے۔ یہ تو دراصل ان کی غلط تاویل ہے کہ بجائے ممد و معاون ہونے کے یہ ترقی کے راستہ میں موانع کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اسلام ایک سے زائد نکاح کی اجازت دیتا ہے حالانکہ اسلام اسے مستحسن کبھی نہیں کہتا۔ لیکن کم

ترکوں کی قومی ضروریات انہیں مذہبی اجازت کے خلاف قانون بنانے پر مجبور کرتی ہیں تو ان کو قابل الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اسی طرح اگر صنعتی اور دیگر ضروریات ایک مخصوص لباس اختیار کرنے پر مجبور کریں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، جہاز سازی اور اسلحہ سازی یا دوسرے بجلی کے کارخانوں میں چست لباس کی ضرورت ہے تو یہ کتنا مضحکہ خیز قیاس ہے کہ مغربی لباس یورپ کی نقل میں ترک اختیار کر رہے ہیں۔ جس طرح ان کی قومی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں اسی کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنی زندگی کو ان ضروریات کے مطابق کرتے جاتے ہیں۔

لیکن ہر قوم کی طبعی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جن کو نظر انداز کر کے وہ ترقی نہیں کر سکتی ترکوں میں ابتک بحمد اللہ حریت و خودداری کے جذبات اپنی اصلی پاکیزگی کے ساتھ موجود ہیں اور غلامی کی گندگی نے ابتک انہیں آلودہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے اس قسم کے تمام خیالات کی کوئی بنیاد نہیں کہ ترک اپنے قومی شعار کو چھوڑ کر یورپ کی نقل میں مختلف انسٹیٹیوشن اپنے ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ترکان احرار اس حقیقت سے بیخبر نہیں، وہ نہایت بے تعصبی سے ان تمام باتوں کو اختیار کر رہے ہیں جو ان کی قومی ضروریات کے لئے از بس ضروری ہیں اور جن کا اختیار کرنا ان کی قومی خصوصیات کے کسی طرح منافی نہیں۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے خلاف جن قوانین کے نفاذ کی کوشش کیجارہی ہے ان کی تہ میں نسلی منافرت اور غرور کا جذبہ کار فرما ہے۔ اگر ان قوانین کا نفاذ ہو گیا تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ ہندوستانیوں اور ایشیائیوں پر جنوبی افریقہ کی سرزمین تنگ

ہو جائے گی اور محض گورے رنگ والی قوموں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ہر قسم کے منافع اس سرزمین سے حاصل کر سکیں۔ حالانکہ جنوبی افریقہ کا بیشتر حصہ ہندوستانیوں کی محنت اور جانفشانی کا رہین منت ہے۔ یہ ہندوستان کی محنت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے جنگلوں کو کاٹ کر بنجر علاقوں کی زمین کو قابل کاشت بنایا۔ آج ان تمام خدمات کا صلہ انھیں یہ دیا جا رہا ہے کہ انسانیت کے حقوق مساوی سے بھی وہ محروم کئے جا رہے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں جو مسئلہ درپیش ہے اس کی کوئی علیحدہ نوعیت نہیں۔ دراصل اختلاف نسل و رنگ کا مسئلہ اس وقت عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور یہ خیال ایک بڑی حد تک درست ہے کہ اس مسئلہ کے صحیح حل پر موجودہ مغربی تہذیب کی موت و حیات کا انحصار ہے۔ نسلی تعصب انسان کی فطرت کی گہرائیوں میں اس طرح جاگزیں ہے کہ اس کے دور ہونے کی بہت کم امید ہے۔ امریکہ میں باوجود مساوات اور حریت کے بلند آہنگ دعووں کے کالے رنگ والوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے اس پر جتنی ملامت کی جائے بجا ہے۔ اسی طرح کالے اور گورے رنگ والوں کا جہاں کہیں آپس میں معاملہ پڑا ہے بہت ہی ناگوار واقعات وجود میں آئے ہیں

جنوبی افریقہ میں جن قوانین کو یونین گورنمنٹ کو منظور کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی یورپین اقوام سے تجارت میں مسابقت نہ کر سکیں۔ عجیب بات ہے کہ ہندوستانیوں کی سادہ زندگی کی جو خوبیاں ہیں وہی دوسری قوموں کو برائیوں کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستانی نہایت کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں شراب نوشی کی عادت نہیں۔ وہ لباس پر بیجا نمائش و نمود کے لئے روپیہ خرچ کرتے

چونکہ یہیں کے گورے رنگ والوں کی معاشرتی زندگی کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ان کے لئے بہت سے اخراجات لازمی ہیں۔ اس طرح ہندوستانی اپنی کفایت شعاری اور جفاکشی کے باعث گورے رنگ والوں سے بہت جلد تجارت میں بازی لیجاتے ہیں۔ اب گورے رنگ والوں کے پاس اور کوئی آلۂ کار نہ رہا تو مجبوراً قانون کی آڑ میں پناہ لی ہے۔ اور اس طرح اپنے حریفوں کو تجارت میں شکست دینا چاہتے ہیں۔

گورے رنگ والوں کو کالے رنگ والوں سے ایک اور بہت بڑا خطرہ یہ بھی ہے کہ کالے رنگ والوں کی آبادی گورے رنگ والوں سے کئی گنی زیادہ بڑھتی ہے۔ چنانچہ اگر کالے رنگ والوں کو جنوبی افریقہ میں پورا موقع دیا گیا تو کچھ عرصہ کے بعد گورا رنگ اس علاقہ سے ناپید ہو جائیگا کسی شاعر کا یہ مصرع اس حالت پر صادق آتا ہے ؎

ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

چنانچہ جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ میں جو قوانین پیش کئے گئے ہیں ان میں اس امر پر زیادہ خیال رکھا گیا ہے کہ کالے رنگ والی آبادی کی روک تھام کے لئے ہر ممکن صورت اختیار کیجائے اور ان کی نقل و حرکت اور قیام کے متعلق قانونی پابندیاں عاید کیجائیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گورنمنٹ ہند ان قوانین کے خلاف کیا کارروائی کریگی اگر آج دنیا کے کسی مہذب ملک کے باشندے کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جائے تو ایک حشر برپا ہو جائے لیکن ہندوستان جو خود غلام ہے اپنے مظلوم اور مجبور بھائیوں کے ساتھ سوائے ہمدردی کے اور کیا کر سکتا ہے۔ گورنمنٹ ہند کی حیثیت امپیریل گورنمنٹ کے

لیکن ماتحت شعبہ سے زیادہ نہیں۔ امپیریل گورنمنٹ جنوبی افریقہ کے داخلی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرنا چاہتی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے پاس سوائے اِن قوانین کے خلاف ستیاگرہ کریں اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ آج سے بارہ سال قبل بھی جنوبی افریقہ کی مغرور گورنمنٹ کو اس حربہ کے آگے جھکنا پڑا تھا اور اس کے بعد سمٹس گاندھی معاہدہ کیا گیا تھا لیکن آج جبکہ اِس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کیجا رہی ہے تو سوائے اِس حربہ کے استعمال کے جو ہر مظلوم اور مجبور کا نہیں بلکہ بقول مہاتما جی ہر بہادر اور خود دار کے لئے بھی واحد حربہ ہے۔ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

تصانیف مولانا حافظ محمد اسلم صاحب

تاریخ الامت :۔ ماقبل اسلام کی مکمل مسلسل مبسوط تاریخ جو نہایت تحقیق کے ساتھ سلیس اردو میں لکھی گئی ہے۔

حصہ اول :۔ سیرۃ الرسول قیمت . . . عمر

حصہ دوم :۔ خلافت راشدہ . . . . . عار

حصہ سوم :۔ خلافت بنی امیہ . . . . . . عمر

حصہ چہارم :۔ خلافت عباسیہ . . . . . . عار

حصہ پنجم :۔ عباسیہ بغداد . . . . . عار

تاریخ القرآن :۔ ابتدائے نزول سے قرآن کریم کے آج تک کے محقق تاریخی حالات اور علمی تحقیق۔ عہ

سیرۃ عمرو بن عاص رضؓ :۔ مشہور صحابی فاتح مصر و طرابلس کے حالات اور ان کے مجاہدانہ و مدبرانہ کارنامے قیمت . . . . عہ

حیات حافظ :۔ خواجہ حافظ شیرازی کی دلکش تحریری عمر

حیات جامی :۔ مولانا جامی کے حالات اور انکی تصانیف اور شاعری پر مفصل تبصرہ قیمت ۸

الوراثۃ فی الاسلام یعنی میراث میں مولانا کا بے نظیر مجتہدانہ کارنامہ عربی زبان میں قیمت ۸

محجوب الارث :۔ مسئلہ ہذا کی ناقابل انکار دلائل سے تردید قیمت ۴

جواہر ملیہ :۔ مولانا کی ان دس بے نظیر تاریخی و ملی نظموں کا مجموعہ قیمت ۳

علوم ملیہ :۔ جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کے حصہ سوم کا ترجمہ جس میں مسلمانوں کی علمی ترقی کا حال ہے قیمت . . . . عمر

تصانیف خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی

شیخ التفسیر جامعہ

الخلافۃ الکبریٰ :۔ سورۂ بقرہ کی مکمل و مبسوط تفسیر ہدیہ للعہ مجلد . . . . . صہ

الصراط المستقیم :۔ سورۂ انفال و توبہ کی تفسیر شروع میں جہاد پر مقدمہ۔ قیمت عار مجلد . . . . عمر

بیان :۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر قیمت عمر مجلد . . . . عمر

سبیل الرشاد :۔ سورۂ حجرات کی تفسیر

ذکریٰ :۔ تیسویں پارہ یعنی پارہ عم کی تفسیر (زیر طبع)

بصائر :۔ حضرت موسیٰ و فرعون کے واقعات قیمت ۶

تصانیف مولانا محمد الیاس برنی صاحب

ادیب جامعہ

ازہار العرب :۔ عربی کی ادبی و اخلاقی سہل نظموں کا مجموعہ۔ جامعہ کے نصاب درس میں داخل ہے ۸

قواعد عربی :۔ (حصہ اول علم صرف) اس کتاب میں صرف کے تمام اشکال رفع کر دئے گئے ہیں۔ ابتک عربی صرف میں اس سے بہتر کوئی کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی عار

مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی

مطبوعات مکتبہ جامعہ ملیہ

مبادی معاشیات:- اکناکس پر لیس دفیمد ترجمہ از پروفیسر ذاکر حسین صاحب استاد جامعہ کتابت وطباعت اور کاغذ عمدہ تقریباً ۱۵۰ صفحے قیمت .. عمر

انتخاب جوہر:- طلبائے جامعہ کے لئے سالہا سال جوہر کا دلکش انتخاب نظم و نثر معہ تازہ فوٹو مولانا محمد علی مرحوم قیمت .... عمر

انتخاب میر:- میر تقی کے کلام کا بہترین انتخاب معہ مقدمہ مشتمل بر حالات میر و کلام میر از نور الرحمن صاحب بی اے۔ خوبصورت جلد قیمت ..... عمر

اورنگ زیب عالمگیر:- سائز ۱۲۶ صفحے۔ کاغذ سفید۔ کتابت وطباعت عمدہ شامل آرٹ پیپر رنگین و دیدہ زیب قیمت ۱۲/

دیوان غالب:- سائز طبع نفیس و خوبصورت و مضبوط جلد کے ساتھ قیمت عہ/

مسدس حالی:- سائز طبع نفیس و خوبصورت و مضبوط جلد قیمت ..... عمر

ہمارے نبی:- سلف اسلام کے سبق آموز حالات بچوں ہی کے لئے۔ از پروفیسر سید نواب علی قیمت ۸/

ترکوں کی کہانیاں:- بچوں میں محبت و غیرت پیدا کرنیوالی چند ترکی بچوں کی سچی کہانیاں قیمت ۴/

شعر و شاعری:- سائز کاغذ و طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت ۶/

اسلامی تہذیب و قومی تعلیم:- ڈاکٹر ایس سی رائے کا خطبہ جلسہ دوم تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت ۴/ اصل انگریزی معہ مقدمہ عبد المجید خواجہ قیمت ۱۰/

خطبہ شیخ الہند مرحوم تقریب افتتاح جامعہ قیمت ۴/

خطبہ مسیح الملک صاحب تقریب جلسہ دوم اسناد جامعہ ۲/

تاریخ ہند قدیم:- از مسٹر ایم کے پانیکر ایم اے (آکسن) ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز کا سلیس اردو ترجمہ قیمت ...... عمر

تاریخ اندلس:- مصنفہ پی سی اسکاٹ ترجمہ مولوی خلیل الرحمن صاحب تین ضخیم جلدوں میں نہایت اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت ہر سہ حصص .... عہ

مولدین:- یہ گویا سلسلہ تاریخ اندلس کی چوتھی کڑی ہے۔ قیمت مجلد ...... عمر

تاریخ علامہ ابن خلدون:- علامہ موصوف کی مشہور تاریخ کا ترجمہ حکیم احمد حسین صاحب الہ آبادی نے گیارہ ضخیم جلدوں میں کیا ہے۔ جلدیں علحدہ علحدہ بھی مل سکتی ہیں قیمت مکمل للعہ/

حیات صلاح الدین:- فاتح بیت المقدس کی مفصل سوانحعمری مصنفہ حکیم احمد حسین صاحب

ان کتب کے علاوہ کتب نصاب اور ہندوستان کے مشہور مکتبوں دار المصنفین، انجمن ترقی اردو، الناظر، نظامی، دائرہ ادبیہ، دار الاشاعت پنجاب، مکتبہ ہائے مصر و بیروت، مسلم یونیورسٹی بک ڈپو، صدیقی بک ڈپو، ظل السلطان، ظفر بک ایجنسی کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ فہرست مفت طلب کیجئے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی

مطبوعہ جامعہ پریس قرول باغ دہلی

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

اسلم جیراجپوری

و

یوسف حسین خاں بی اے (جامعہ)

قیمت سالانہ — چار روپیہ

مطبوعات شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

وجہ دین: حکیم ناصر خسرو کی مشہور تصنیف مسائل اسلامی پر فلسفیانہ تنقید اور مفصل بحث معہ سوانح حکیم ناصر خسرو۔ وحالات تصانیف ... للعہ

زاد المسافرین: حکیم ناصر خسرو کی عدیم المثال اور نادر الوجود تصنیف فلسفہ و حکمت اسلامی پر پہلی بار بکمال اہتمام و شان سے چھپی ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات سے زائد قیمت ملے

سفرنامہ ناصر خسرو: حکیم مرحوم کے چشم دید حالات اور چوتھی ہجری کے مفید معلومات معہ مثنوی روشنائی نامہ وسعادت نامہ۔ طباعت و کاغذ اعلیٰ ترین۔ سرنامہ مطلا ورنگین۔ قیمت .... سے

تذکرہ شاہ طہماسپ: شاہ موصوف کا خود نوشتہ تذکرہ نہایت دلچسپ۔ قیمت .... ۸؍

طہران مخوف: فارسی کا نہایت دلچسپ ناول مصنفہ مرتضیٰ مشفق کاظمی قیمت .... عا

دستور تار: علم موسیقی میں ستار کا درجہ سب سے بلند ہے۔ اس کتاب میں ایرانی و یورپی طریقہ ساز علیحدہ علیحدہ دئے ہوئے ہیں اور ہر سُر کے متعلق نقشے دئے گئے ہیں قیمت ۱عہ

حمائل چھوٹا سائز: اصل نسخہ حافظ عثمان کا فوٹو لیکر جست کی پلیٹوں پر چھاپی گئی ہے۔ کاغذ سبزی مائل نہایت خوبصورت جلد مطلا قیمت ...... للعہ

بدائع سعدی: سیبوکس وائٹ کنگ سی ایس آئی۔ ایل ایل ڈی۔ پروفیسر فارسی ڈبلن یونیورسٹی نے بدائع سعدی کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے قیمت .... صہ

دیوان غالب مطبوعہ کاویانی پریس

مکتبہ جامعہ نے دیوان غالب جرمنی سے چھپوایا تھا جو بہت مقبول ہوا اور تھوڑے عرصہ میں ختم ہو گیا دوسرا ایڈیشن نہایت اہتمام سے چھپوایا گیا ہے۔ مگر جرمنی کی گرانی کی وجہ سے اخراجات پہلے سے ڈیوڑھے آتے ہیں۔ اسلئے اسکی قیمت سے کی بجائے للعہ کر دی گئی ہے۔

تیاتر: مرزا ملکم خان کہ جنکی قلمی و علمی جدوجہد سے ایران دوبارہ زندہ ہوا تین مختصر ڈراموں کا دلکش مجموعہ قیمت .... عا

موش و گربہ: عبید زاکانی مشہور ہجوگو کی تصنیف جو بلی کی کہانی ہے ابنائے عصر کی ہجو ملیح اور عہد حاضر سے تطبیق۔ ہر صفحہ رنگین و لطیف مضحک بلاکس سے مزین نہایت دلچسپ قیمت .... ۵؍

رہنمائے پسران: فارسی جدید کے نمونے در بچوں کو خط و کتابت کے پیرایہ میں مفید نصائح از مرزا محمود خاں قیمت .... عہ

تلگراف بے سیم: بے تار کی تار برقی کے متعلق کارآمد معلومات معہ چند نقشوں اور بلاکس کے۔ عہ

لغات المانی بفارسی: فارسی و جرمنی زبان کے لغت کا جرمنی ایڈیشن قیمت ... عا

دوست داران بشر: بعض مرد صفت خاتونوں کی ملی و ملکی خدمات۔ بطور سوانحات۔ نہایت مفید مستند معلومات قیمت ..... عا

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ۔ دہلی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ

جامعہ

جلد ۶	ماہ شعبان ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۲۶ء	نمبر ۲

اہل نجد

عالم اسلامی کی گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ میں نجد کی تاریخ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس مقام سے مسلمانوں کی ایک عظیم الشان اصلاحی تحریک کی ابتدا ہوئی۔ بدقسمتی سے زبان اردو میں نجد کی کوئی تاریخ موجود نہ تھی، گذشتہ چند ماہ سے ہندوستان میں نجد اور حجاز کے واقعات سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار شروع ہوا چنانچہ احباب نے مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اصرار کیا کہ وہ تاریخ نجد کے مرتب کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں۔ بحمداللہ کہ کتاب تیار ہوگئی ہے اور پریس میں جاچکی ہے اور عنقریب چھپکر تیار ہو جائے گی اگرچہ یہ تاریخ بہت مفصل اور مبسوط نہیں لیکن ضروری معلومات کو فراہم کرنے کی پوری کوشش کیگئی ہے۔ ایک روپیہ فی نسخہ پر مکتبہ جامعہ سے مل سکتی ہے۔ اس کی کیفیت کا اندازہ کرنے کیلئے اس کے ابتدائی ابواب میں سے ایک باب

ہم جامعہ میں نقل کرتے ہیں۔ کتاب اِسی رسالہ کے ساتھہ ساتھہ شائع ہوجائیگی۔

(یوسف)

معاش

نجد میں زراعت بھی ہوتی ہے۔ باغ ونخلستان بھی ہیں۔ مویشی کی کثرت ہے۔ اور یہی چیزیں ان کا ذریعہ معاش ہیں۔ کچھہ لوگ صنعت وحرفت وتجارت سے بھی لبسر اوقات کرتے ہیں۔ اُن کی غذا کا بڑا حصہ کھجور ہے جو دنیا بھر سے بہتر اُن کے ہاں پیدا ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ دودھ، گھی۔ گوشت چاول، گیہوں۔ جو اور جوار بھی کھاتے ہیں۔ ٹڈی کے بڑے عاشق ہیں جب اس کا دَل کہیں سے آجاتا ہے تو بڑی مقدار میں شکار کرکے نمک لگاکر اُن کو بھون لیتے ہیں اور ذخیرہ جمع کرکے رکھتے ہیں۔ چاے وقہوہ کا بھی عام رواج ہے لیکن تمباکو سے نفرت رکھتے ہیں۔ تمام ملک میں اس کا استعمال ممنوع ہے۔ جو شخص حقہ، سگریٹ یا سگار پیتا ہوا پکڑا جائے اس کو "بسط" کی سزا دیجاتی ہے۔ یعنی زمین پر ڈال کر کھجور کی تازہ چھڑی یا بید سے مارتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ اپنے گھروں میں مخفی طور پر تمباکو کا استعمال کرلیتے ہیں۔ امرا یا شیوخ کسی قدر چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ہاں الریاض کے اس محلہ میں جس میں علماء کی سکونت ہے ممکن نہیں کہ کوئی شخص اپنے گھر میں بھی سگریٹ جلاسکے۔ کیونکہ اُن کی قوت شامہ دیواروں کو پھاڑ کر اس کی بو سونگھہ لیتی ہے اور مجرم پکڑ لیا جاتا ہے پھر بسط سے نہیں بچ سکتا۔

سیر وسیاحت کا باشندوں کو بہت کم شوق ہے۔ خاصکر دور ودراز ممالک جیسے یورپ یا امریکہ کی طرف نہیں جاتے۔ اسی وجہ سے تجارت بھی کم ہے۔ بیشتر اپنے ملک کی پیداوار یا گھوڑوں کی سوداگری کرتے ہیں۔ بعض صاحبانِ دولت ہیں جو بصرہ، عمان یا ہند میں کاروبار رکھتے ہیں

لباس

اہل نجد نہایت سادہ لباس عبا وقبا پہنتے ہیں۔ علماء عمامے باندھتے اور عوام الناس مندیل پر عقال (سربند) استعمال کرتے ہیں۔ پاؤں میں جوتے اور ہاتھوں میں عصا رکھتے ہیں۔ خوشبو یعنی مشک وعطر وغیرہ بہت ملتے ہیں اور اس کا بڑا شوق رکھتے ہیں۔

بہ نسبت عرب کے دیگر حصص کے وہ صورت میں مقبول اور معتدل ہوتے ہیں بالعموم ان کا رنگ گندمی یعنی سرخ وسپید ہوتا ہے۔

فضائل

اوضاع واطوار میں عربی شرافت کا نمونہ ہیں۔ شجاعت۔ کرم راستبازی۔ پاس حق و عہد ومہمان نوازی میں مشہور اور ذہن، ذکا وعلم وفہم میں ممتاز ہیں شہسواری اُن کا خاص فن ہے اور گھوڑوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ باشندوں میں ثروت اگرچہ عام نہیں ہے لیکن قناعت صبر اور شکر کے ساتھہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

دینی شغف

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر عہد میں جزیرۃ العرب کے اکثر ملکہ سارے حصوں میں اسلام پھیل گیا تھا۔ اسی وقت سے اہل نجد مسلمان ہیں۔ ایک زمانہ کے بعد طول عہد نبوی جہالت دینی اور تقلید زمانہ کے اثرات سے دیگر اسلامی ممالک کی طرح وہاں بھی مشرکانہ رسوم اور بدعات پھیل گئیں اور فرائض شرعیہ وسنن سے غافل ہوکر انھوں نے بعض خرافات اور توہم پرستیوں کو دین سمجھہ لیا۔ بارھویں صدی کے نصف اول تک ان کی یہی حالت رہی یہانتک کہ شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کا ظہور ہوا جنہوں نے ان کے اصلاح کی کوشش کی اور بتائید الٰہی ان کو جہالت کی تاریکی سے اسلامی روشنی میں نکال لائے۔ اب بجز تھوڑے سے

اہل تشیع کے جو الحساء میں ہیں اور جن کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ نہیں ہے اس سرے سے اُس سرے تک تمام اہل نجد خالص موحد اور متبع سنت ہیں۔ اصول میں عقائدِ سلف کے پابند اور فروع میں حنبلی مذہب کے پیرو ہیں۔

دین میں ان کو انہماک ہے اور علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے نہ صرف اس میں توغل بلکہ غلو رکھتے ہیں۔ توحید کے فدائی۔ کتاب وسنت کے شیدائی اور شرک و بدعت کے سخت دشمن ہیں۔ ترکِ صلوٰۃ تو کجا ترک جماعت پر بھی وہاں سزا ملتی ہے۔ ہر ہر محلہ کی مسجد میں ایک جریدہ ہوتا ہے جسمیں نمازیوں کے نام مندرج ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص جماعت سے غیر حاضر ہوتا ہے تو لوگ بیمار سمجھکر اسکی عیادت کو جاتے ہیں۔ اگر وہ تساہل کی وجہ سے نہیں آیا ہے تو سمجھاتے ہیں۔ جو اس پر بھی شریک نہیں ہوتا تو "بسط" کی سزا پاتا ہے۔ خواہ کوئی ہو۔

تعلیمی چرچا۔

اہل نجد بالعموم خواندہ ہیں اور علومِ دین کا ان میں کثرت کے ساتھ رواج ہے۔ ہر شہر میں علماء کی جماعت ہے جن کے پاس کثیر تعداد میں طلبہ پڑھتے ہیں۔ حکومت نجد بھی تعلیم میں سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتی ہے۔ محلہ محلہ اور قبیلہ قبیلہ بلکہ نخلستانوں میں بھی مدرسے ہیں اور بدوی قبائل میں بھی معلم بھیجے جاتے ہیں جو لوگوں کو اس قدر تعلیم دیتے ہیں کہ وہ حدیث و تفسیر وغیرہ کی کتابیں پڑھ سکیں۔ بڑے بڑے شہروں میں تکمیل علوم دینیہ کے لئے مدارس ہیں جنمیں نامور علماء و فضلا درس دیتے ہیں اور دیار و امصار کے طلبہ کی کثرت رہتی ہے۔

علمی ذوق

اہل نجد چونکہ حنبلی ہیں اس وجہ سے علماء سلف میں سے طبعاً ان کو ائمہ حنابلہ کی کتب سے ذوق ہے۔ مثلاً علامہ ابن جوزی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور ابن رجب

صاحب طبقات الحنابلہ وغیرہ خاصکر ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں علامہ ابن القیم حافظ عماد ابن کثیر۔ امام ذہبی وغیرہ کی کتب سے بہت عشق رکھتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ دیگر فرقوں کے علمائے اعلام کی کتابوں کو بھی پڑھتے ہیں۔ مثلاً حافظ ابن حجر۔ غزالی۔ سبکی اور سیوطی وغیرہ۔ اور اُن سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

تفسیریں ابن جریر طبری۔ ابن کثیر۔ امام بغوی۔ بیضاوی۔ خازن حدادی وغیرہ سے مدد لیتے ہیں اور حدیث میں صحاح ستہ اور اُن کی شروح مثلاً عسقلانی یا قسطلانی شرح بخاری۔ نووی شرح مسلم۔ منّادی شرح جامع صغیر وغیرہ کو سند سمجھتے ہیں۔ ادب۔ لغت۔ نحو اور تاریخ وغیرہ سے بھی بڑا ذوق رکھتے ہیں اور ان علوم کا چرچا وہاں عام ہے۔ اس علمی فضا کی وجہ سے بعض بعض علماء نجد کے پاس اچھے اچھے کتبخانے بھی ہیں اور وہ لوگ علوم دین کی مفید کتابیں بھی تصنیف کرتے رہتے ہیں۔ ادبا و شعرا کی بھی کثرت ہے اور باوجود خراب ہونے کے بھی آج اہل نجد کی زبان عرب کے ہر حصہ سے زیادہ فصیح اور اُن کا لہجہ ہر جگہ کے لہجہ سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

نظام عمومی

باشندے چونکہ بالعموم متدین اور متقی ہیں اور فسق و فجور اور جرم و گناہ سے بوجہ خوف الٰہی ڈرتے اور پرہیز کرتے ہیں اور حکومت بھی پوری قوت کے ساتھ قوانین شرعیہ اور حدود کے اجرا میں سختی کرتی ہے اس لئے جرائم شاذونادر ہی ہوتے ہیں۔ غارتگری یا سرقہ معدوم ہے اور فحش و زنا مفقود۔ حالانکہ ملک میں نہ حرس ہے نہ شرطہ (چوکیدار و پولس) اور مسکرات کا استعمال نہ صرف وہاں ناپید بلکہ ناممکن ہے۔

حریت۔ بجز شرعی پابندیوں کے ہر شخص کو کامل آزادی حاصل ہے اور امیر و مامور

سب کے حقوق کا یکساں احترام کیا جاتا ہے۔ مشہور انگریزی سیاست داں مسٹر بلنٹ جو ۱۸۸۱ء میں کسی غرض سے نجد گیا تھا اپنی کتاب " سیکریٹ ہسٹری آف دی برٹش اکوپیشن آف ایجپٹ " میں لکھتا ہے۔

میں نے دنیا کے اکثر شہروں کی سیر کی ہے مگر جو چیز باوجود تلاش کے مجھے مشرق یا مغرب کے شہروں میں نہ حاصل ہوئی وہ نجد کے گلی کوچہ میں خود بخود مل گئی۔ اس کے تین بڑے عنوان ہیں ۔ حریت ۔ مساوات ۔ اخوت جنکا ذکر ہم یورپ والے نہایت فخر و مباہات کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر یہ وہ الفاظ ہیں جو کبھی شرمندۂ معنی نہوئے لیکن نجد میں میں نے اُن کو حقائق ثابتہ پایا۔

فرانس کے تمام در و دیوار پر تم جلی حروف میں اِن الفاظ کو لکھا ہوا دیکھو گے مگر نجد میں ہر شخص عملاً ان سے بہرہ اندوز ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں نہ محصول اور لگان نے لوگوں کو تباہ و برباد کر رکھا ہے نہ جبری[1] فوجی خدمت نے۔ لوگ ہر قسم کے جبر و اکراہ سے کامل طور پر آزاد ہیں۔ رائے عامہ[2] اس ملک کا قانون ہے۔ یہاں اگر کوئی دستورالعمل ہے تو صرف یہ کہ ہر شخص ذمہ دار اور مسئول ہے اس لیے وہ اپنی عزت و خود داری کو اپنے ہر قول و فعل میں پیشِ نظر رکھتا ہے۔ یورپ کے تخیل پسند اصحاب نے اس قسم کی حکومت کا نقشہ دینی کتابوں میں کھینچا ہے مگر بادیہ نجد میں ہم نے اس کو حقیقت کا لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے۔

---

[1] بیشک ان معنوں میں نہیں جو یورپ میں سمجھی جاتی ہے ورنہ ہر مسلمان جس میں صلاحیت ہے دینی حیثیت سے فوجی خدمت پر مجبور ہے۔

[2] اس لحاظ سے کہ نجد کا قانون شرع ہے جسکو وہاں کا ہر شخص جان و دل سے تسلیم کئے ہوئے ہے۔

امین ریحانی لکھتا ہے۔

میں نے اپنی تحریر میں ابن سعود کے لئے امیر اور اس کے محل کے لئے قصر کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے ناظرین کرام عرفی معنے نہ سمجھیں کیونکہ امیر نہ امیر ہے نہ قصر قصر۔ بلکہ اہل نجد کے نزدیک امیر صرف وہ شخص ہے جو اکیلے اللہ کی عبادت کرتا ہے اور قصر اگر کوئی ہے تو وہ مسجد ہے۔

حکومت۔

نجد میں حکومت اگرچہ خاندانی اور شخصی ہے لیکن وہاں کا قانون صرف کتاب و سنت ہے، اور امیر جملہ مہمات میں اہل علم و عقل کی ایک جماعت سے مشورہ لیتا ہے۔ کوئی کام صرف اپنی رائے سے نہیں کرتا۔ اس کی طرف سے شہروں میں امرا اور قضاۃ بھیجے جاتے ہیں جو نہایت لائق اور ایماندار ہوتے ہیں اور بلارو رعایت شرع کے مطابق اوامر و فیصلہ جات کی تنفیذ کرتے ہیں۔ امیر و غریب اور بعید و قریب اُن کے نزدیک ایکساں ہے۔

رعایا سے اصول اسلام کے مطابق بجز شرعی زکوٰۃ کے اور کسی قسم کا محصول نہیں لیا جاتا حدود شرعیہ جاری ہیں یعنی ڈاکو و باغی کے لئے قتل وغیرہ۔ چور کے لئے قطع ید اور زانی کے لئے حد۔

فوج۔

بجز چند ہزار انتظامی دستوں کے جو سلطان یا امراء امصار کے پاس متعین ہیں۔ نجد میں کوئی باقاعدہ ملازم جنگی فوج نہیں ہے۔ ضرورت کے وقت قبائل و عشائر سے رضا کار مجاہد شیوخ کی قیادت میں جمع ہوجاتے ہیں۔

علامہ آلوسی زادہ نے لکھا ہے کہ امیر نجد بوقت جنگ ایک لاکھ آدمی فراہم کرسکتا ہے

لیکن یہ قصہ ماضی کا ہی۔ اب اس کی فوجی طاقت اس سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہی۔ مزید براں الاخوان کی جدید جماعت ہے جس کا شمار دشوار ہے۔

الاخوان

"توحید کے سپاہی اور موحدوں کے بھائی" یہ جماعت خالص بدوی قبائل کی ہی جنمیں اصلی عربی شجاعت اور دینی فدائیت ہی اور موجودہ سلطان ہی کے عہد میں عالم وجود میں آئی ہے۔ پندرہ سال بھی نہیں گذرے کہ ارطاویہ[1] کے چند شخصوں سے اس کی ابتدا ہوئی اور جنگل کی آگ کیطرح تمام ملک میں پھیل گئی۔ آج اس میں لاکھوں آدمی شامل ہیں جو ازالۂ منکر بالید خامکر محو شرک کے لئے اپنے آپ کو وقف رکھتے ہیں۔ اور جسطرف امام کا اشارہ ہوتا ہی پرندوں کی طرح اڑتے ہیں۔ علم دین اُن کی اولین شرط ہی۔ چنانچہ ان میں سے تقریباً ایک ثلث حافظ قرآن ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو بخاری شریف یا کم ازکم بلوغ المرام کو ازبر رکھتے ہیں۔

اُن کے افراد تین قسموں پر منقسم ہیں۔ اہل علم۔ متعلمین۔ مطاوعہ۔ علما مطاوعہ کو پڑھاتے ہیں وہ ملک میں جاکر اپنے بھائیوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ جنگ میں سب ایک ساتھ جمع ہوجاتے ہیں۔

شرع کی پابندی۔ تدین۔ تقویٰ۔ قناعت۔ صبر اور جہاد میں ممتاز ہیں اور کسیقدر بدویانہ قسوۃ کے ساتھ امور دین میں سختی برتتے ہیں۔ جس بستی میں پہونچ جاتے ہیں وہاں کے لوگ اُن کے احتساب کے خوف سے لرزنے لگتے ہیں۔ زاہدانہ لباس اور سفید عمامہ سے جو اُن کا امتیازی شعار ہے یہ تمام ملک میں پہچانے جاتے ہیں۔

سقوط حائل کے بعد جبل شمر کے تمام بدوی قبائل کو جبراً موحد بناکر اپنی جماعت میں

---

[1] یہ قبیلہ مطیر کی ایک نو آبادی ہے۔

شامل کرلیا ہے۔ اب ایک بڑا حصہ اس میں انہیں لوگوں کا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ابھی تک توحید میں پختہ نہیں ہوئے ہیں اس لئے انہیں اہلِ ارطاویہ یا غطغط وغیرہ کی سی شدت نہیں پائی جاتی۔

امین ریحانی نے ان کے متعلق ایک پوری فصل لکھی ہے۔ اس کی چند باتوں کا خلاصہ یہ ہے

یہ الاخوان جماعت کیسی ہے؟ یہ نجدی وہابی جنکا نام لیتے ہوئے لوگ اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ کون لوگ ہیں؟ کمتر اشخاص ہیں جو ان کی حقیقت سے واقف ہوں۔ کیا یہ ہول یا موت کے فرشتے ہیں؟ یا دین کے محتسب؟ جنکی نگاہ میں بجز اللہ اس کی کتاب اور سنت رسول وصحابہ کے اور کچھ نہیں۔ ان دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے متعدد مواقع پر انھوں نے اس کا ثبوت دیا ہے کہ وہ واقعی ہول یا موت کے فرشتے ہیں۔ نہ حجاز ان کو ابتک بھولا ہے نہ عراق نہ کویت۔

یہ غازیوں اور مجاہدوں کا گروہ ہے۔ یہ توحید پر مرجانے والوں اور جان دینے والوں کی جماعت ہے جو حمیت وعصبیت دینی میں نہایت شدید ہے۔

کل تک یہ لوگ جاہل بدو تھے۔ لیکن توحید کا سبق سیکھ کر آج اس کے علم بردار اور ابن سعود کی اصلی قوت بن گئے ہیں۔ وہی ہر امر میں ان کا امام ہے۔ وہی ان سے کام لیتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے مراتب اور اوصاف سے بھی واقف ہے۔

ان کے کندھوں پر بندوقیں ہوتی ہیں اور ہاتھوں میں بیرقیں۔ جن پر اللہ کا نام لکھا ہوتا ہے اور یہ ہر اس قبیلہ پر حملہ کرتے ہیں جو توحید سے ناآشنا ہے۔ ان کے نزدیک وہ زندگی بیکار ہے جس میں اللہ کے لئے جہاد نہ ہو۔

ان کی فدائیت کی بنیاد وہ مستحکم یقین اور پختہ ایمان ہے جس نے ان کو ایسا شجاع بنا دیا ہے کہ سوائے اللہ کے کسی کا خوف ان کے دلوں میں باقی نہیں چھوڑا۔ تلواروں کے

سایہ میں ان کو جنت نظر آتی ہے اور پیچھے مڑنے جہنم کی آگ ۔ پھر کیوں نہ آگے بڑھیں اور کون ہے جو اُن کو شکست دے سکے ۔

اُن کا نعرۂ مجاہدانہ یہ ہے ۔

عودوا الی اللہ ایہا المشرکون ۔ عودوا الی النبی والسنۃ ۔ عودوا الی دین التوحید ۔ نحن الاخوان علیکم ۔ انّ سیفنا بتار وبومنا عصیب ۔

پلٹو اللہ کی طرف اے مشرکو ! پلٹو نبی اور سنت کی طرف ۔ پلٹو دین توحید کی طرف ہم تمہارے اوپر مسلط ہیں ۔ ہماری تلوار تیز ہماری لڑائی کٹھن ہے ۔

اور ترانہ جنگ یہ

ھبت ہبوب الجنۃ ۔ این انت یا باغیہا

جنت کی ہوائیں آرہی ہیں ۔ اے کہ تو اس کا آرزومند ہے کدھر ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ الاخوان ایک ہولناک طاقت ہے ۔ اس میں اگر کمی ہے تو صرف نظام کی جس سے یہ خطرہ ہے کہ کسی وقت یہ خود نجد ہی کیلئے وبال نہ بنجائیے ۔

امن وامان ۔

نجد میں عدل شرعی قایم ہے ۔ اس وجہ سے تمام ملک میں امن عام ہے ۔ علامہ ابن لبشر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے ۔

بلاد میں ہر سمت کامل امن وامان ہے ۔ ایک معمولی مسافر جس موسم میں چاہے مال ومتاع لئے ہوئے نجد سے تمامہ حجاز ۔ یمن ۔ عمان وغیرہ تک سفر کرے ۔ اُس کے لئے مطلقاً کسی ڈاکو یا چور کا خوف نہیں ۔ خطہ نجد کے تمام باشندے اپنے مویشیوں کو موسم ربیع میں بلا کسی چرواہے کے بادیہ میں چھوڑ رکھتے ہیں ۔ وہیں وہ چرتے ہیں اور بچے جنتے ہیں ۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا ۔ موسم گذر جانے پر مالک اگر اُن کو مع بچوں کے

بٹھاتے ہیں۔ صرف گھوڑوں کے گلوں پر نگہبان رکھتے ہیں تاکہ نوزائیدہ بچوں کی خبرگیری اور حفاظت رکھیں کیونکہ اُن کو گھوڑوں سے بہت محبت ہوتی ہے۔

ایک بار ایک عجمی زائر وادیِ سبیع کے قریب فروکش ہوا اور وہاں اس کا ایک بیگ جس میں دس قرش کی قیمت کا کوئی معمولی سامان تھا چوری گیا۔ اس نے امیر کو اطلاع کی۔ امیر نے اس دیار کے رؤسا و قبائل کو بلاکر حکم دیا کہ چور کا پتہ لگاؤ۔ ان لوگوں نے اس کو دشوار سمجھ کر کہا کہ مال مسروقہ کا ٹنی گنا تاوان ہم سے لے لیا جائے لیکن اس زحمت سے معاف رکھا جائے۔ مگر امیر راضی نہیں ہوا۔ اور کہا کہ چور کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ آخر ان لوگوں نے اس کا سراغ لگا لیا اور پکڑ کر لائے۔ امیر نے اس کو سزا دی۔

عجمی اس وقت جا چکا تھا۔ اس لئے اس کا سامان حاکم زبیر کے پاس بھیج دیا کہ مالک کے پاس پہونچا دے۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ چند عرب جن کا پیشہ غارتگری تھا نجد کے ریگستان سے میں گذر رہے تھے اور سخت بھوکے تھے۔ وہاں انھوں نے چند بکریاں چرتی ہوئی دیکھیں۔ جن کا کوئی چرواہا نہ تھا۔ کہنے لگے کہ ان میں سے ایک پکڑ کر ذبح کریں اور کھائیں۔ لیکن کسی کی ہمت پکڑنے کی نہیں پڑی اور ایک دوسرے پر ٹالتا رہا۔ آخر میں ان میں سے ایک نے کہا کہ بھائی ان کو نہ چھیڑو۔ ان کا چرواہا خود عبد العزیز ہے۔

عجم۔ عراق۔ عمان وغیرہ ہر طرف سے قافلے۔ کارواں۔ تاجر اور سیاح نجد میں برابر آتے رہتے ہیں۔ اور بڑے بڑے بیابانوں میں سے ان کا گذر ہوتا ہے لیکن کہیں کوئی خطرہ پیش نہیں آتا۔ نہ حکومت کی طرف سے اُن سے کسی قسم کا محصول لیا جاتا ہے اکیلا شتر سوار بلا کسی ہتھیار کے ایک چھڑی ہاتھ میں لئے بادیہ عرب کا یمن سے شام تک بلا کسی خوف کے جب چاہے سفر کرسکتا ہے۔

ایک بار شام کی زکوٰۃ جو چھ شتر بار ریال تھی جذوب حلب سے لیکر درعیہ میں آئے۔ راستہ میں جہاں رات کو ٹھہرتے تھے ان کو زمین پر اِدھر اُدھر ڈال کر اونٹوں کو کھول دیتے تھے اور خود کھانا کر بیخوف سو رہتے تھے۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا لئے جا رہے ہو۔ درعیہ میں امیر کی طرف سے عبید بن یعیش نامی ایک شخص اس لئے مقرر ہے کہ تمام جزیرۃ العرب کے آوارہ گرد لاوارث جانور لا کر اس کے سپرد کر دئے جائیں۔ وہ چرواہوں کے ذریعہ سے ان کی نگہداشت کرتا ہے۔ مالک جب تلاش کرتا ہوا آتا ہے اور اپنے جانور کی شناخت دیدیتا ہے تو وہ اس کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ بسا اوقات وہ ایک کا دو پاجاتا ہے کیونکہ مادہ جو بچے جنتی ہے وہ بھی ساتھ میں ملتے ہیں۔ اس امن و امان کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دیانت اور تقویٰ اہل نجد کے دلوں میں بھر دیا ہے اور امیر کا رعب حاضر و بادی پر مسلط کر دیا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسا امن بجز عہد فاروقی کے اور کہیں نہیں ملتا۔

یہ کیفیت امام عبد العزیز[1] اول کے عہد کی ہے جو ۱۲۱۸ھ میں مقتول ہوئے جو اب تک بدستور بلکہ روز بروز بہتر ہوتی چلی آتی ہے چنانچہ اب موجودہ امیر امام عبد العزیز ثانی کے عہد کی کیفیت امین ریحانی کی زبان سے سنئے۔ وہ لکھتا ہے۔

"ملک میں ہر سمت احساء سے تہامہ تک۔ ربع خالی سے جوف تک سلطان نجد کے عدل کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ہر قافلے میں اس کا چرچا اور ہر مسافر کی زبان پر اس کا ذکر ہے۔

ابن سعود کا عدل کیا ہے؟ وہی عدل جو شرع کا ہے۔ وہی عدل جو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

[1] ناظرین امام کے عربی معنے نہ سمجھیں بلکہ یہ ایک اصطلاح ہے۔ جسطرح ایران میں فرمانروا کو شاہ ترکی میں سلطان اور مصر میں خدیو کہتے ہیں۔ اسی طرح اہل نجد اس کو امام یا امیر کہتے ہیں۔ اہل یمن صرف امام اہل حجاز شریف کا لقب دیتے ہیں خواہ وہ غیر ہاشمی ہی کیوں نہ ہو۔ بحرین اور کویت والے شیخ بولتے ہیں۔

کا تھا۔ نہ مقدمات کے جھمیلے ہیں نہ مرافعات کے بکھیڑے۔ صاف صاف بیانات ہیں اور ان پر شرعی احکام جنکی تنفیذ بلاتحاشا کیجاتی ہے۔

ابن سعود کے عدل کا ایک ادنی نمونہ یہ ہے کہ جب میں اس کے ساتھ مقام عقیر میں تھا تو سلطانی مطبخ میں لکڑیوں کی ضرورت پڑی۔ ایک بدو چار جمل لکڑیاں لایا جنکی قیمت معمولی نرخ کے مطابق آٹھ آنہ فی جمل تھی۔ اس نے داروغۂ مطبخ سے دو روپیہ فی جمل مانگا۔ وہ بولا کہ قیمت زیادہ ہے۔ اس پر وہ ڈیڑھ روپیہ پر اتر آیا لیکن یہ بھی زیادہ سمجھی گئی۔ اب وہ اپنے اونٹ پھیر کر لے چلا۔ داروغہ نے واپس بلاکر ایک روپیہ فی جمل دینا چاہا۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اسوقت غصہ سے داروغہ نے کہا کہ کاش امیر کا ڈر نہ ہوتا تو آج میں اس کو ٹھیک کر دیتا کیا تم سمجھتے ہو کہ کسی یورپین یا ترکی سلطنت کے امیر یا وزیر کے معسکر میں ایک لکڑہارے کے ساتھ خدام مطبخ اسطرح کا برتاؤ کرتے۔ وہ تو جس قیمت پر چاہتے لے لیتے اور اس کو مع اونٹوں کے بیگار میں الگ پکڑ لیتے۔ یہ صرف نجد اور سلطانِ نجد کا عدل ہے کہ وہاں ایک ادنیٰ بدو کا بھی حق محفوظ ہے کہ وہ جس قیمت پر چاہے اپنی چیز فروخت کرے۔

آج ہم نجد میں جو امن و امان دیکھتے ہیں اس سے وہ ممالک جو خوشحال اور متمدن کہلاتے ہیں قاطبۃً خالی ہیں۔ گو میں بادیۂ نجد میں خود پانچ ماہ تک سفر کرتا رہا۔ دہناء کو دوبار قطع کیا اور میرے بیگ اور صندوق سب کھلے ہوئے تھے کیونکہ ان کے قفل ٹوٹ گئے تھے اور وہ ہمیشہ بدوؤں کی حفاظت میں مجھ سے الگ رہے لیکن کبھی میری کوئی ادنی سے ادنی چیز بھی ضائع نہ ہوئی۔ مگر میں اپنی مثال پیش کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں مہمان کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا اور میرے ساتھ دس پندرہ سلطانی آدمی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امن کا مظہر نجد میں اسقدر نمایاں ہے کہ اس کے لئے کسی مثال اور بیان کی ضرورت ہی نہیں

ابن سعود کی حکومت میں قافلے۔ کاروان تجارت اور مسافر وغیرہ ایک طرف سے دوسری طرف یعنی قطیف سے ابہاتک یا وادی دوآسر سے وادی سرحان تک چالیس دن کی مسافت طے کرتے ہیں لیکن کبھی کسی سے کوئی بدو آکر یہ بھی نہیں پوچھتا کہ تمہارے پاس کیا مال ہے اور تم کہاں سے آتے ہو اور کہاں جاؤ گے۔

ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ احساء ترکوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت فوجی قوت کو ساتھ لئے یا بدوؤں کو رشوت دیئے بغیر اس بیابان سے گذرنا محال تھا۔ خاصکر عقیر اور احساء کے درمیان کا راستہ جس سے نجد اسفل کے کاروان گذرتے ہیں سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ غارتگر قبائل نے آپس میں اس کے حصے تقسیم کر لئے تھے۔ مسلمان عربی تاجر جب عقیر میں قدم رکھتا تو عجمان اس سے "خوۃ" (رشوۃ طلب کرتے پھر نخیل پہونچنے پر بنی مرہ پچاس ریال لیتے۔ علاقہ میں جانے پر اسی قدر بنی ہاجر وصول کرتے۔ الغرض احساء تک پہونچتے پہونچتے اس طریقہ سے اگرچہ اس کی جان تو بچ جاتی لیکن مال پھر بھی پورا نہیں پہونچتا تھا کبھی کبھی وقوعہ یا حادثہ ہوجانے پر ترکی سواروں کا دستہ اُن کی گوشمالی کے لئے بھیج دیا جاتا لیکن اکثر یہی ہوتا کہ بدو فوج کے گھوڑے اور سپاہیوں کے کپڑے وغیرہ سب چھین لیتے اور وہ خراب وخستہ برہنہ پاؤں پیدل واپس جاتے۔ دوسرے روز وہی لیٹرے انہیں گھوڑوں پر سوار ہوکر شہر میں آکر جلوہ نمائی کرتے اور ترکی حکومت اُن کو دیکھکر سوائے خاموشی کے اور کچھ نہ کرسکتی۔

مگر یہی احساء جب سے ابن سعود کی حکومت میں آیا ہے یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ جب بیابان سے ہم گذر رہے تھے تو نفوذ کے قریب میں نے دیکھا کہ ایک ناتوان اونٹ سامان لیکر گرا پڑا ہے معلوم ہوا کہ یہ لاغری اور تھکن کی وجہ سے گر گیا ہے اور اب اسی جگہ مرجائے گا۔ اس لئے

اس کا مالک اس کو چھوڑکر اپنے گھر واپس گیا ہے کہ دوسرا اونٹ لاکر سامان لاد کر لیجائے اب وہ دس روز میں آئے گا اسوقت تک اس کا یہ سامان اسی گذرگاہ پر پڑا رہیگا۔ اور کیا مجال ہے کہ کوئی انسانی ہاتھ اس کو چھو سکے۔

سلطان یہ امن وامان کس طرح قایم کرسکا صرف دو باتوں سے۔ ایک امور حکومت میں شرع کی پابندی۔ دوسرے ان کی تنفیذ بلا تردد اور رعایت۔

یہ صرف سلطان ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس کے تمام امرا بھی بلا استثنا اسی قسم کے ہیں۔ ان سب میں احسا، کا امیر **عبدالله بن اجلوی** خاص طور پر ممتاز ہے۔ شخص عدل پروری میں اپنے ابن عم **سلطان عبدالعزیز** سے بھی بڑھکر ہے۔ اس میں عدل فاروقی ہے اور قسوۃ بدویانہ۔ عدالت کی کرسی پر تنہا بیٹھتا ہے جہاں نہ رحم ہوتا ہے نہ رعایت۔ سب پر اس کا رعب چھایا ہوا ہے۔ بڑے سے بڑے جری بدو تھراتے ہیں۔ مجرم اس کے نام سے کانپتے ہیں بلکہ سارا خطۂ احساء لرزتا ہے یہانتک کہ مائیں اس کے نام سے اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں۔

ایکدن اس کے سامنے ایک شخص نے فریاد کی کہ مجھے ایک لڑکے نے گالیاں دیں اور پتھر مارا۔ اس نے نام پوچھا بولا کہ نام تو میں نہیں جانتا۔ کہا کہ اگر لڑکے جمع کئے جائیں تو تم اس کو پہچان لوگے۔ جواب دیا کہ ہاں۔ امیر کے حکم سے فوراً اس محلے کے لڑکے جمع کردیے گئے۔ فریادی نے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے کہا یہ تو خود امیر کا لڑکا ہے وہ ڈر گیا۔ اب جو امیر اس سے پوچھتا ہے تو وہ کچھ بھی نہیں بولتا۔ اس لئے خود لڑکے سے سچی کیفیت دریافت کی۔ اس نے جرم کا اقرار کیا۔ حکم دیا کہ مستغیث کے ہاتھ میں چھڑی دوکہ وہ اس کو مارے۔ لیکن غلام رکے اور وہ شخص بھی پیچھے ہٹا۔ یہ دیکھکر امیر خود اٹھا اور یہ

کہتے ہوئے کہ اگر ہم اپنی ذات سے نہ شروع کریں گے تو دوسروں پر کیا عدل کر سکیں گے۔
اپنے ہاتھ سے لڑکے کو بید لگائے۔

ایکبار چند اشخاص بنی مرہ کے جو جنوبی نجد میں سب سے زیادہ وحشی قبیلہ ہے۔ الریاض میں سلطان کے پاس اپنا وظیفہ لینے گئے۔ واپسی میں راستہ میں سے کسی کے چند اونٹ بھی ہانک لیچلے۔ مالک کو جب خبر ہوئی تو اس نے الریاض میں جاکر سلطان کو اطلاع دی۔ اُس نے فوراً ایک تیز رفتار سوار امیر عبداللہ کے پاس دوڑایا۔ ابھی تک یہ وراہ میں ہی تھے کہ سوار نے الحساء میں آکر واقعہ کی اطلاع دی۔ یہاں غیرت عدل کو تاب کہاں تھی فوراً سو سواروں کے چار دستے بیابان میں چاروں سمت بھیجے۔ ۲۴ گھنٹے بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ مجرم معہ اونٹوں کے گرفتار ہوکر آگئے۔

اس کے بعد چند سوالات تھے اور چند جوابات۔ پھر "الساحہ" کا حکم جہاں ایک مجمع نے دیکھا کہ آفتاب کی روشنی میں چمکتی ہوئی تلواریں تطرائیں اور پھر آٹھ لاشیں زمین پر تڑپنے لگیں۔

یہی وہ عدل ہے جسکے بدولت ابن سعود کی حکومت میں آٹھ آٹھ سو میل شرقاً وغرباً وجنوباً وشمالاً قافلے امن کے ساتھ آتے جاتے ہیں۔ اُس کو دعائیں دیتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

لہ مقام ہفوف میں جہاں امیر عبداللہ کا مستقر ہے الساحہ اُس میدان کا نام ہے جس میں خونیوں اور ڈاکوؤں سے قصاص لیا جاتا ہے۔ یہاں کے واقعات برقی رو کی طرح تمام ملک میں سرعت کے ساتھ پھیلتے ہیں اور امن و امان قایم رکھتے ہیں۔ ترکوں نے اس خطہ میں چھ قلعے تیار کئے تھے جنمیں فوجیں رہتی تھیں اور ان کے اوپر یہاں کی تقریباً ساری آمدنی صرف ہوجاتی تھی۔ ان سب سے وہ کام نہ ہوسکا جو آج الساحہ اور اس کے چند سیافوں سے ہورہا ہے اور وہ سب قلعے خالی اور بیکار پڑے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے لوگ شرعی حدود کے مصالح سمجھ سکیں۔

سیّد علی حیدر صاحب طباطبائی

اور

مرزا غالب کی دردناک رسوائی

(گذشتہ سے پیوستہ)

شعر
نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

اس شعر کا مطلب تو صحیح تحریر فرمایا ہے لیکن بلاوجہ یہ اعتراض جڑ دیا ہے کہ "کھینچ کی لفظ شراب اور انتظار دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن انتظار کھینچنا تو اردو کا بھی محاورہ ہے۔ شراب کھینچنا محض فارسی کا ترجمہ ہے" سید صاحب نے اپنے دل سے یہ فرض کر لیا ہے کہ غالب یہ کہتا ہے کہ اگر شراب کھینچنے کو نہیں ملتی تو ساغر کا انتظار ہی کھینچ۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ "اگر شراب نہیں ہے یا نہیں ملتی ہے تو ساغر کا انتظار کھینچ" تو اس میں کیا قباحت ہے۔ ہم خواہ مخواہ "کھینچنے کو نہیں ملتی" اپنی طرف سے کیوں داخل کر دیں۔

شعر
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

تشریح۔ "یعنی سوگ میں مہندی ملنا چھوڑ دی"۔ محتاج کے معنی حاجتمند کے ہیں نہ کہ تارک کے۔ اس لئے شعر کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ مجھے اس بات کا صدمہ ہے کہ آہ اب میں نہ رہا تو ان کے ناخنوں کو رنگینی کے لئے حنا کا محتاج ہونا پڑا ہے۔ ورنہ یہ خدمت میرے خون کے سپرد تھی

شعر غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

تشریح " یعنی اس غم سے مرتا ہوں کہ کوئی میرے بعد مہر و وفا کو میرا پرسا بھی دینے والا نہیں ہے -

تعزیت کے معنی رنج وغم کرنا ہیں نہ کہ پرسا دینا - اور بالفرض اگر تعزیت کے معنی پرسا دینا بھی ہوتے تو تعزیتِ مہر و وفا میں جو اضافت ہے اس کے معنی "کا" کے "کو" کس قاعدے سے ہو گئے ؟ پرسا دینا بھی معنی ہوں تو شعر کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ مہر و وفا کا پرسا کون دیگا - حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب شعر کا مطلب ہی نہیں سمجھے اور زبردستی کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ معنی گھڑ دئے - شاعر کا مقصد یہ ہے کہ مہر و وفا تو زمانے سے کبھی کے معدوم تھے مگر میں ان کا ماتم کرنے والا موجود تھا - اب میں مرجاؤنگا تو کوئی اتنا بھی نہ رہیگا کہ مہر و وفا کے نام پر دو آنسو ہی بہا دیا کرے -

شعر
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

تشریح - " یعنی رکنے کے بعد جو طبیعت رواں ہوتی ہے تو زیادہ تر رواں ہوتی ہے - جسطرح چڑھے ہوئے نالے کو جب راستہ ملجاتا ہے تو بہت زور سے بہتا ہے "-

شاعر نے ہرگز یہ نہیں کہا ہے کہ جب چڑھے ہوئے نالے کو رستہ ملجاتا ہے " وہ تو یہ کہتا ہے کہ نالوں کے چڑھنے کا باعث ہی یہ ہوتا ہے کہ انھیں راستہ نہ ملے - اسی طرح میری طبیعت اگر رکجاتی ہے گویا اسے راستہ نہیں ملتا تو وہ اور چڑھ جاتی ہے - یعنی اس میں بلندی اور عالی خیالی آجاتی ہے

شعر
ہم اور وہ بے سبب رنج آزاد شمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشم روزن پر

تشریح " یعنی روزن میں سے جو شعاع آتی ہے اسے دیکھ کر وہ مجھسے آزردہ ہوتا ہے کہ تیری نگاہ بھی

ہمارے سید صاحب کو اس سے واسطہ ہی نہیں ہوتا کہ ایک غلط انداز ہی سی نگاہ شعر
کے الفاظ پر ڈال لیا کریں۔ اس شعر میں تو کسی لفظ یا جملے کے یہ معنی ہیں ہی نہیں کہ شعاع کو دیکھ کر
وہ مجھ سے آزردہ ہوتا ہے کہ تو نے مجھے جھانکا۔ نہایت صاف شعر ہے اور اس کا واضح مطلب
یہ ہے کہ وہ سوراخ میں شعاع مہر کو دیکھ کر یہ شک کیا کرتا ہے کہ روزنِ دیوار اسے جھانک رہا
ہے اور یہ شعاع اس روزن کی نگاہ ہے، اور جس کی بدگمانی کا یہ عالم ہو اس سے ہمیں سابقہ
پڑا ہے۔ شاعر تو کہتا ہے کہ "تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر" آپ فرماتے ہیں "تہمت نگہ کی
مجھ پر" آخر اس زبردستی کی کوئی حد ہے!

شعر
فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

تشریح :- صبح استعارہ ہے شبِ عمر کے گذر جانے سے اور جیبِ کفن کو بھی گریبانِ سحر سے
تشبیہ دی ہے"

عجب تماشہ ہے کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ جیب کفن کو گریبان صبح سے تشبیہ دی ہے
اور خود ہی یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ صبح استعارہ ہے شب عمر کے گذر جانے سے۔ آخر شبِ عمر آپ نے
کہاں سے ٹھونس دی۔ صاف سیدھی بات ہے کہ جسطرح جیب صبح میں سورج ہوتا ہے اسی
طرح میرے جیبِ کفن میں داغ عشق ہے۔ کفن چونکہ سفید ہوتا ہے اس لئے صبح سے اسے
تشبیہہ دیگئی ہے۔ خواہ مخواہ "شبِ عمر" کا اضافہ کیوں کیا جائے۔

شعر
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

تشریح " اے لاف سادہ دلی تیرا وصف تو یہ مشہور ہے کہ تو تمکین فریب ہے، تو کچھ خبر لے کہ

"میرے دل میں ایسے راز ہیں جو سینہ گداز ہیں۔ یعنی انھیں فاش کردے کہ اُن کا بوجھ میرے دل پر سے اتر جاے۔ حاصل یہ ہے کہ سادہ دلی سے اپنے ضبط و تمکین کی غمازیت اور یہ ظاہر ہے کہ سادہ دلی کا مقتضا افشاء راز اور تمکین و وقار کی شان اخفائے راز ہے"

سید صاحب نے یہ مطلب غالب کے شعر کا لکھا ہی یا سادہ دلی سے اپنے کسی شعر کا مطلب بیان فرما گئے ہیں۔ ہم تو اس تشریح کے قائل ہیں کہ جسکا مطلب سمجھنے کے لئے ایک اور تشریح کی ضرورت ہی۔ کیا کوئی صاحب ازراہِ کرم اس طرف توجہ فرمائیں گے کہ سید صاحب کی تشریح کی ایک تشریح لکھ ڈالیں۔ مجھے تو افسوس ہے کہ وہ میری فہم سے باہر ہے ورنہ شاید میں ہی خود ہمت کر لیتا۔ سید صاحب کی یہ خاص ادا ہی کہ جو شعر اُن کی سمجھ میں نہیں آتا اُس کی تشریح بھی وہ ایسی ایسی کیا کرتے ہیں جو خارج از فہم ہو۔ نقل مطابق اصل ہونی بھی چاہیئے اوّل تو آپ نے لاف کو منادیٰ قرار دیا ہی اور اپنی طرف سے "اے" اس پر اضافہ کر دیا ہی پھر کمال یہ ہے کہ اُسے مضاف مانکر اس کا مضاف الیہ "سادہ دلی" کو قرار دیا ہی۔ آخر سید صاحب غالب کو کیا سمجھتے ہیں۔ کیا غالب کو اتنی بھی فارسی نہیں آتی تھی کہ انھوں نے مضاف اور مضاف الیہ کے بیچ میں دو لفظ اور داخل کر دئے۔ کیا کسی غلط سے غلط قاعدہ کے مطابق بھی اس مصرعہ میں "لاف" اور "سادہ دلی" مضاف اور مضاف الیہ ہو سکتے ہیں اور پھر تمام اصلاح یا یوں کہئے کہ تخریب کے بعد بھی اگر کوئی مطلب نکل آیا ہوتا تو صبر ہوتا۔ سید صاحب سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ لیکن شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق میں تمکین اور وقار کا لاف محض سادہ دلی کا فریب ہوا کرتا ہی۔ ہم اگر شیخی ماریں یا دعوائے ضبط کریں تو وہ محض ہماری سادہ دلی ہی جو ہمیں دھوکے میں ڈال رہی ہی۔ ورنہ ہمارے سینہ میں جو راز ہیں وہ سینہ کو گداز کر دینے والے ہیں گویا دعوائے ضبط محض سادہ دلی پر مبنی ہی۔ رازہائے عشق ایسے نہیں جو ضبط ہو سکیں۔

شعر

فروغ حسن سے ہوتی ہے حل ہر مشکل عاشق
نہ نکلے شمع کے پاسے نکالے گر نہ خار آتش

تشریح " شمع کے ڈورے کو خارِ شمع کہتے ہیں اور اس کا نکالنے والا شعلہ شمع ہے اور لفظ حل کو بہ تانیث باندھا ہے۔ شاید مشکل کے ہمسایہ میں ہونیسے دہوکا کھایا ورنہ محاورہ یہ ہے کہ میں نے اس کتاب کا حل لکھا"

سید صاحب کا مطلب یہ ہے کہ "ہر مشکلِ عاشق حل ہوتی ہے" کہنا غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ "ہر مشکلِ عاشق حل ہوتا ہے" حیدرآباد کا زبان شاید ایسا ہی ہو مگر دہلی اور لکھنو کی محاورہ وہی ہے جو غالب نے لکھی ہے

شعر

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

تشریح " یہ بات مشہور ہے کہ نمک زمین پر گرے تو پلکوں سے اٹھانا چاہئے اس شعر میں "میں" کی جگہ "تو" زیادہ مناسب ہے اس سبب سے کہ جب یہ کہتے ہیں کہ تمہیں وہ بات یاد ہے تو وہ بات اکثر ایسی ہوتی ہے جو مخاطب پر گذری ہوئی ہو۔ اپنی گذری ہوئی کوئی دوسرے کو یاد نہیں دلاتا"

جو بات مشہور ہے وہ یہ نہیں ہے کہ نمک زمین پر گرے تو پلکوں سے اٹھانا چاہئے بلکہ گھر کی بڑی بوڑھیاں لڑکیوں کو احتیاط اور کفایت شعاری کا سبق سکھانے کے لئے اکثر یہ کہا کرتی ہیں کہ اگر نمک زمین پر گراؤ گی تو قیامت کے دن پلکوں سے چننا پڑیگا۔ سید صاحب مصرعۂ ثانی میں اس طرح اصلاح فرمانا چاہتے ہیں کہ "میں" کے بجائے "تو" کر دیا جائے گویا مصرعۂ ثانی اس طرح ہو کہ زخم سے گرتا تو تو پلکوں سے چنتا تھا نمک۔ "تو" اور "تو" ایک جگہ جمع

ہوکر اسقدر پر لطف ہو گئے ہیں کہ بیان سے باہر ہے۔ اس تو توئیں میں کا مزہ کوئی سید صاحب سے پوچھے۔ ایک عام قاعدہ ارشاد ہوتا ہے کہ اپنی گذری ہوئی کوئی دوسروں کو یاد نہیں دلایا کرتا۔ گویا اردو میں اس فقرہ کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ تمہیں وہ بھی یاد ہے کہ جب میں چھوٹا سا تھا اور گھوڑے پر چڑھا کرتا تھا۔ اور گھوڑا مجھے گرا دیا کرتا تھا۔ آیندہ اگر کوئی شخص اپنی گذری ہوئی باتیں دوسروں کو یاد دلائیگا تو طبا طبائی عدالت سے سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔

شعر
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے ترے زلف کے سر ہونے تک

تشریح " یہ محاورہ ہے کہ ہم اس بات کے سر ہو گئے یعنی سمجھ گئے یعنی جب تک تیری زلف میرے حال سے باخبر ہو میرا کام تمام ہو جائیگا "

محاورات سے باخبری سید صاحب پر ختم ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ چتوڑ کا قلعہ اکبر کے ہاتھوں سر ہوا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ چتوڑ کا قلعہ اکبر کے حال سے باخبر ہو گیا۔ عربی اور فارسی کے ساتھ سید صاحب کو جو غلو ہے اس نے انھیں غریب اردو کی طرف سے اس قدر بے پروا کر دیا کہ وہ یہی بھول گئے کہ "سر ہونا" کے معنی "مسخر ہونا" ہیں۔ اور ریختہ گو غالب نے یہ کہا ہے کہ جب تک تیری زلف مسخر ہو اس وقت تک کون جئے گا۔ کسی چیز یا کسی بات کے سر ہو جانا بھی محاورہ ہے مگر اس کے معنی بھی سمجھنا نہیں ہیں بلکہ پیچھے پڑ جانا ہیں

شعر
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تشریح " یعنی محفل میں کیسا ہی رنگ نشاط ہو مگر شمع کے جلنے کا اس سے کچھ علاج نہیں ہو سکتا۔ اس کا بجھنا ہی اس کے جلنے کا علاج ہے۔

اس توضیح مطلب پر غالباً غالب کی روح سعید صاحب کو دعائیں دے رہی ہوگی۔ ذرا سے ردوبدل سے شعر کو کیا سے کیا کر دیا۔ شاعر کہتا ہے کہ غم ہستی کا علاج موت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب تک موت نہیں آتی مجھے مجبوراً جینا پڑیگا اور غم ہستی میں مبتلا رہنا پڑیگا شمع کو بھی بطیب خاطر یا بجبر واکراہ صبح کرنی ہی پڑتی ہے اور اس وقت تک جلنا ہی پڑتا ہے یہ شعر "شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن" کی ایک حد تک تشریح ہے۔ شاعر آپ کو یہ بتانا نہیں چاہتا کہ غم ہستی کا علاج موت ہے۔ یہ تو ایک بالکل مبتذل اور پیش پا افتادہ بات ہے جو ہر شخص جانتا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ شمع کی طرح ہم بھی سحر ہونے تک جلنے پر مجبور ہیں اور باوجود اس کے کہ مرض کا علاج معلوم ہے پھر بھی علاج کرنے پر قادر نہیں ہیں یہ جبر و اختیار کا دقیق مسئلہ ہے اور ایک پیش پا افتادہ بات نہیں ہے۔

شعر

ہے کسقدر ہلاک فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہائے گل

تشریح :- یعنی بلبل اس دھوکے میں مری جاتی ہے کہ رنگِ گل میں وفا و ثبات ہے

اس شعر سے تو کسی طرح یہ مطلب نہیں نکلتا کہ بلبل رنگ گل کو دائمی خیال کر رہی ہے بالکل صاف مطلب یہ ہے کہ بلبل کو گل کی وفاداری پر اعتبار ہے اور وہ اس فریب میں مبتلا ہے کہ گل وفاداری کریگا اور اتنا نہیں سمجھتی کہ حسن اور وفا ایک جگہ جمع نہیں ہوا کرتے۔

شعر

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دام ہوائے گل

تشریح :- ہوائے گل بمعنی شوق گل ہے۔ گل شگفتہ کو حلقۂ دام سے تشبیہ دی ہے اور نسیم سے خوشبو مراد ہے جو گل کے حلقۂ دام شوق کو توڑ کر آزاد ہو جاتی ہے یعنی بوئے گل

کو آزادی مبارک ہو کہ سب پھول شگفتہ ہو گئے۔"

اس تشریح میں کئی غلطیاں ہیں اول تو نسیم سے مراد بوئے گل لینا سید صاحب کی زبردستی ہے۔ پھر اگر اُن کے قول کے مطابق گل شگفتہ کو حلقۂ دام سے تشبیہہ دیگئی ہو تو پھر اب یہ دام کس طرح لوٹے گا۔ جب کھلا ہوا پھول دام ہی تو پھر اب وہ اور کس طرح کھلے گا کہ جسے دام کا لوٹنا کہا جاسے۔ کلیاں کھلا کرتی ہیں گل شگفتہ کس طرح کھل سکتا ہے۔ غالباً سید صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے حلقہائے دام سے گل شگفتہ کو تشبیہہ دیگئی ہے۔ لیکن مطلب اب بھی کچھ نہیں نکلتا پھول کے شوق کا جو جال تھا کہ جس میں بوئے گل قید تھی، گویا بوئے گل پھول کے دامِ شوق میں گرفتار تھی۔ لیکن اس کا ثبوت کیا ہے کہ بوئے گل عشق گل میں مبتلا ہے۔ کوئی کیوں مان لیگا کہ بوئے گل عشقِ گل میں پھنسی ہوئی ہے۔ بوئے گل جہاںتک مجھے معلوم ہے بلبل کو تو نہیں کہا کرتے۔ پھر اس کا پھول کے ساتھ عشق کیسا؟ ۔اس کی بجائے اگر ہم ہوائے گل کے معنی بہار کے لیں تو اچھے خاصے صاف معنی نکل آتے ہیں۔ بہار نے ایک جال پھیلایا تھا۔ اس جال کے حلقے کھلے ہوئے پھول تھے۔ ان پھولوں کی وجہ سے نسیم بھی ہر وقت باغ میں گھسی رہتی تھی۔ اب خزاں آگئی اور وہ کھلے ہوئے پھول یا بہار کے جال کے حلقے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑے نسیم کے لئے بھی باغ میں اب کوئی سامان دبستگی نہ رہا لہذا اُسے آزادی مبارک ہو۔

شعر

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

تشریح " یہ شعر ایک سوال مقدر کا جواب ہے یعنی میرا شراب پینا اور باغوں کی سیر کرنا لوگ برا سمجھتے ہیں مگر ایسا نہ کروں تو مجھے بادِ بہار سے شرمندگی ہوتی ہے۔"

سید صاحب نے اس شعر کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ شاعر اپنی شراب نوشی کا یہ عذر بتا رہا ہے

کہ شراب نہ پیوں اور گل و گلشن کی سیر نہ کروں تو بہار سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ یہاں پھر سید صاحب نے ایک بلند خیال کو ایک پست اور مبتذل خیال میں تبدیل کر دیا ہے۔ شاعر اپنی اس حسرت پر آنسو بہا رہا ہے کہ ہائے بہار آگئی اور میری یہ حالت ہے کہ نہ بوتل میں شراب اور نہ دل میں سیر و تفریح کا شوق۔ بہار اپنے دل میں مجھے کیا کہیگی اور مجھے اس سے کیسی کچھ شرمندگی ہوگی۔ بلا ضرورت ایک سوال کو مقدر مان کر اس کا جواب اس شعر کو خیال کرنے میں آخر کیا خاص خوبی ہے؟

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر سعید احمد سعید۔ بریلوی

نوشتۂ تقدیر

(۱)

۲۔ اگست ۱۹۱۴ء کو قسطنطنیہ میں جرمن ترکی معاہدہ پر جرمن سفیر اور ترکی وزیر اعظم کے دستخط ہو گئے۔ اس معاہدہ کی رو سے سلطنت عثمانیہ نے جرمنی اور اس کے حلفا کو جنگ میں مدد دینے کا وعدہ کر لیا۔

کمانڈر انچیف مارشل انور پاشا نے تمام فوجی افسران کی ایک مجلس منعقد کی جس میں مختلف موچوں کی اہمیت اور مواقع پر غور کر کے قابل و مستعد افسران فوج کو متعین کیا گیا۔ اور باقاعدہ احکامات صادر ہو گئے۔

جواد بک کو معہ اپنے توپخانہ اور رسالہ کے علاقہ جارجیا میں قارص اور طفلس کے درمیانی مورچہ پر خیمہ زن ہونے کا حکم ملا۔

جواد بک نے اپنی لیاقت اور مستعدی کی بدولت اپنے افسر اعلیٰ جنرل عباس بے کی نظروں میں ایک خاص وقعت پیدا کر لی تھی۔ یہ بوڑھا افسر جو جنگ طرابلس اور دیگر لڑائیوں میں داد شجاعت دے چکا تھا بڑا دانشمند اور تجربہ کار تھا اس نے جواد میں وہ خصوصیات پائیں جو ایک ہونہار، لائق اور بہادر سپاہی میں فطرتاً ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر وہ جواد سے بہت محبت اور عزت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

جواد بک کی عمر اس وقت ۲۴ سال کی تھی اور فوجی ملازمت میں داخل ہوئے صرف ۳ سال کا زمانہ گذرا تھا اس کا قد کسیقدر لمبا، سینہ چوڑا اور بازو قوی تھے۔ چہرہ سفید اور گول، رخسار سے بھرے ہوئے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور قدرے نیلی جنمیں شجاعت اور پاک باطنی

نے ایک خاص کشش پیدا کر دی تھی۔ چہرہ پر ابھی سبزے کا آغاز تھا اور نرم دبیگوں موچھوں نے اس کے مردانہ حسن میں مناسب اضافہ کر دیا تھا۔

شام کے ۹ بجے جواد بک جنرل عباس کے کیمپ پر پہونچا تاکہ اپنی روانگی اور دیگر امور کے متعلق ضروری ہدایات حاصل کرے۔ جنرل عباس اس وقت معہ چند ماتحت افسران کے قہوہ نوشی میں مصروف تھا۔ یہ قدآور اناطولی ترک آج سے ۴۷ سال قبل ترکی فوج میں ایک معمولی افسر کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اب ترقی کرتے کرتے جنرل کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو گیا۔ جنگ طرابلس کے بعد عباس کو بے خطاب ملا اور ایک زبردست فوج کی کمان اس کے سپرد ہوئی۔ عباس کے چوڑے گندمی چہرے سے بڑھاپے کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ سر کے بال اگرچہ سفید ہو گئے تھے لیکن اس کی بڑی بڑی بھوری موچھوں، لمبی ناک اور چمکدار آنکھوں سے بہادرانہ وقار ٹپکتا تھا۔ اس نے خبر پاتے ہی جواد کو ملاقات کے کمرے میں بلوالیا اور مسکراتے ہوئے کہا:۔

جنرل عباس ۔ جواد! تمکو ایک ہفتہ قبل اطلاع دی گئی تھی کہ تمہاری فوج فلاں مقام پر جائیگی۔ مگر اب میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ رؤف بک اور حقی بک رسالے نمبر ۷، ۸ اور ۱۱ اور توپخانہ نمبر ۷ اکے ہمراہ کل روانہ ہو جائیں اور تم میرے ساتھ بقیہ فوج لیکر چلو کیونکہ میں تمہاری رجمنٹوں کو طفلس کے محاذ پر رکھنا چاہتا ہوں (قہوہ کی پیالی دیتے ہوئے) لو قہوہ نوش کرو۔

جواد بک ۔ (ادب سے قہوہ کی پیالی لیکر) جناب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری ناقص رائے میں جناب والا کی یہ تجویز نہایت مناسب ہے۔

جنرل عباس۔ جواد! دیکھو اس میں ایک خاص مصلحت ہے۔ اس مقام سے ہم دریائے کرا

کی تاکہ بندی کرکے قارص تک بہت مستحکم مورچہ قائم کریں گے جو یقیناً
کوسکوں (روسی فوج) کے لئے ناقابل تسخیر ثابت ہوگا۔

جوادبک۔ بے شک جناب! یہ موقعہ ہمارے لئے فوجی نقطۂ نظر سے بیحد مفید اور اہم
ہے........ اچھا اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ جوادبک، جنرل عباس
بے اور دیگر افسران سے مصافحہ کرکے رخصت ہوا۔

(۲)

احمد ارسلان اپنے عالیشان مکان کے ایک بالائی کمرے میں جو ایشیائی وضع پر ایرانی
غالیچوں اور دمشقی قالینوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ایک گاؤتکئے سے سہارا لگائے کتب بینی میں
مصروف ہے۔ اس کے سنجیدہ چہرہ سے شرافت اور نسلی خصوصیات نمایاں ہیں۔
ڈاڑھی اور سر کے سنہرے بال، سفید رنگ، پتلی اور لمبی ناک۔ بڑی آنکھیں اور باریک و
خوبصورت دانت صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ نجیب الطرفین کوہ قافی ہے۔ کمرے کی کھڑکیاں
ایک پر فضا مختصر پائیں باغ میں کھلتی ہیں جو مکان کی پشت پر چہار دیواری سے گھرا ہوا ہے وسیع
دروازے کے سامنے صنوبر کا سرسبز شاداب جنگل میلوں تک پھیلا ہے جس کے اختتام پر
سلسلۂ کوہ قاف کی پہاڑیاں آسمان سر پر اٹھائے کھڑی ہیں۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے
کمرہ معطر ہے۔ سامان آرائش کی لطافت اور خوبی سے صاحب خانہ کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے
احمد ارسلان طفلس کا رئیس اعظم اور ملک التجار ہے۔ اس کی شہد اور سمور کی تجارت ایران اور
شام تک ہی محدود نہیں۔ ترکی کے علاوہ یورپ کے مختلف ممالک میں بھی ایک وسیع
پیمانے پر جاری ہے۔

اس وقت احمد کے زیر نظر ایک کتاب "اسلام پر ایران کا اثر" تھی جس کا پانچواں

باب " فرقۂ باطنیہ کی ابتدا " کھلا ہوا تھا۔ اُس کی سفید پیشانی غور وفکر کے اثر سے چمک رہی تھی جس سے سنجیدہ و متین چہرہ دلکش ہوگیا تھا۔ اُس نے یکایک دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ غلام نے نہایت ادب کے ساتھ سینہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گردن کو خم کیا۔ پھر کمرے میں آہستہ سے داخل ہو کر کہا:۔

غلام ۔ میرے آقا! ایک نوجوان ترک سوار خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔

احمد ارسلان ۔ خاور! (یہ غلام کا نام ہے) کیا تمکو معلوم ہے کہ اِس نوجوان کو مجھسے کیا کام ہے؟

خاور ۔ میرے آقا! وہ شاید کسی کا خط آپ کی خدمت میں پہونچانا چاہتا ہے۔

احمد ارسلان ۔ اچھا خاور جاؤ اور اسے ملاقات کے کمرے میں اپنے ہمراہ لے آؤ۔ میں بھی آتا ہوں۔

خاور ادب سے سلام کر کے واپس ہوا۔ احمد دل ہی دل میں کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے اٹھا اور عبا کے دامن سنبھال کر زینہ سے نیچے اتر گیا۔ یہ ابھی کمرے میں پہونچا ہی تھا کہ خاور معہ نوجوان ترک کے اندر داخل ہوا۔ احمد نے از راہِ خلق اسلامی بڑھکر مصافحہ کیا اور مزاج پرسی کے بعد دونوں ایک خوبصورت قالین پر بیٹھ گئے۔ ترک نے ایک ملفوف خط مودبانہ انداز سے احمد کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا:۔

نوجوان ترک ۔ جناب میں جنرل عباس بے کے باڈی گارڈ کا افسر دوم ہوں یہ خط جنرل عباس بے کا ہے۔ اس کی نسبت مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں خود آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

احمد ارسلان (ترک سے خط لیکر) جناب مجھے جنرل عباس بے کا خط پاکر بڑی مسرت ہوئی۔ کیونکہ یہ ایک مدت دراز کے بعد موصول ہوا ہے۔ میں اُن کی

خیر و عافیت سے ابتک بالکل بے خبر رہا۔ کیا اس خط کا جواب ابھی تحریر کر کے آپ کے سپرد کر دوں۔

ترک افسر - جی ہاں بیشک میں جواب ہی کا منتظر ہوں۔

احمد آرسلان نے اسی وقت لفافہ چاک کر کے خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا

دیا، بکر

(صدر) محب محترم سلمکم اللہ تعالیٰ

میں یہ خط اپنے ایک معتمد افسر کے ذریعہ آپ کے پاس روانہ کر رہا ہوں جس سے آپ خط کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ حکومت عثمانیہ نے فیصلہ کر لیا ہی کہ متوقعہ جنگ میں شریک ہو کر روس کے خلاف جرمنی کی مدد کرے۔ اس غرض سے مملکت عثمانیہ کی مختلف سرحدوں پر فوجی نقل و حرکت شروع ہو گئی ہی۔ میری ماتحت افواج علاقہ جارجیا میں سرحد پر جنگ کرینگی تاکہ اس جانب سے روسی افواج پیشقدمی نہ کر سکیں۔ فوج کا کچھ حصہ کل روانہ ہو چکا ہی۔ تین ہفتے کے بعد میں خود اپنی افواج سمیت آرمینیا سے گذرتا ہوا حوران (طفلس کے شمال میں ۱۰ یا ۱۵ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہی) پہونچ جاؤنگا۔ جمعہ کے دن انشاء اللہ آپ سے طفلس میں ملاقات ہوگی۔ میں خود معہ اپنے ایک فوجی افسر کے چار یا پانچ یوم کے لئے آپکے دولتکدہ پر قیام کرونگا۔ فقط

آپ کا قدیمی دوست

عباس بے

احمد آرسلان نے مناسب جواب تحریر کر کے ترک افسر کے حوالہ کیا۔ اس نے خط کو جیب میں رکھا

اور سلام کرکے رخصت ہوا۔

(۴)

جمعہ کے روز علی الصبح جبکہ سورج کی سنہری کرنیں پہاڑیوں کی اونچی چوٹیوں پر نقش بکھیرنے میں مصروف تھیں۔ جنرل عباس بے اور جواد بک جورن سے روانہ ہو گئے۔ طفلس میں جس وقت پہونچے تو سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ اور صبح کی سردی آہستہ آہستہ گرمی میں تحلیل ہو رہی تھی۔ احمد آرسلان نے اپنے شاندار مکان کے صدر دروازہ پر معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ عباس بے نے اپنے رفیق اور میزبانوں میں تعارف کراتے ہوئے کہا۔

جنرل عباس : (ہمراہی افسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) احمد! یہ میرے ماتحت افسران میں سب سے زیادہ قابل اعتماد، لائق اور بہادر ہیں۔ ان کا نام جواد بک ہے۔ میں ہمیشہ ان کو اپنے ہمراہ رکھنا پسند کرتا ہوں۔

(پھر احمد آرسلان کی طرف اشارہ کرکے)

اور جواد! میں جو تم سے گاہے گاہے اپنے ایک عزیز دوست کا ذکر کیا کرتا تھا وہ یہی احمد آرسلان ہیں۔ اس صوبہ میں آپ کا سب سے زیادہ اثر ہے اور آپ ترکی کے بڑے وفادار امراء میں سے ہیں۔

تعارف کے بعد ہی جواد بک اور احمد آرسلان نے ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہوئے اس اتفاقی ملاقات پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔

ارسلان نے اپنے مہمانوں کو بالائی منزل کے دو جدا جدا کمروں میں ٹھیرایا جن میں صرف ایک ایک قیمتی قالین کا فرش تھا۔ دیواریں شمالی روس کے عجیب و غریب جانوروں کی خوبصورت اور نرم رونگٹے دار کھالوں سے سجی تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر مختلف قسم کے پردے لٹک

رہا ہے تھے جنہیں سے دھوپ چھن چھن کر قالین پر پڑتی تھی -

(۴)

جواد بک، احمد ارسلان اور عباس بے کے ہمراہ قہوہ نوش کر کے ان کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر چلا آیا - اگرچہ معمولاً وہ بھی ان کی گفتگو میں حصہ لیا کرتا تھا لیکن آج اس کی طبیعت ذرا سست معلوم ہوتی تھی - اس نے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھولدیں اور کچھ دیر تک کمرے کے اندر ہی چہل قدمی کرتا رہا - اس کمرے کی شمالی کھڑکی سے شہر کی بڑی بڑی سنگین عمارتیں اور انگوروں کے دو تین سبز باغات نظر آ رہے تھے - جواد اس کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور مفلس کی سفید سادہ عمارتوں کو دیکھتا رہا - پھر دوسری کھڑکی کے سامنے آکر کھڑا ہوا - اس سے بائیں باغ کے تقریباً تمام تختے اور چمن نظر آتے تھے جنہیں مختلف اقسام کے پھولوں کے بڑے بڑے پودے اور بادام کے درخت قرینے سے لگے تھے - اب ۵ بج چکے تھے - سورج کی طلائی کرنیں چمن سے کچھ دیر قبل کمرہ بھرا ہوا تھا آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھیں کہ جواد کی نگاہیں ایک روش پر جم گئیں - یہاں دو عورتیں سیر میں مصروف تھیں - ایک کے ہاتھ میں جس کا قد دوسری سے کسیقدر چھوٹا تھا ایک خوبصورت پھولوں کی ٹوکری تھی جس میں کبھی کبھی کوئی پھول توڑ کر ڈال دیا جاتا تھا - یہ دونوں خراماں خراماں ٹہلتی ہوئی اس چمن میں پہنچ گئیں جس کی روشوں پر ہموار سبزہ اگا تھا اور گلاب کے بڑے بڑے پھول کھل رہے تھے - وہ ایک جگہ کھڑی ہو گئیں اور گلاب کی ایک شاخ جھکا کر جس میں کئی پھولوں کا ایک گچھا لگا ہوا تھا، کچھ باتیں کرنے لگیں حسن اتفاق سے اس وقت وہ ایسے مقام پر تھیں کہ جواد ان کو بخوبی دیکھ سکا - دونوں عورتوں کے چہرے آپس میں بہت مشابہ تھے مگر جسکے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری تھی وہ دوسری سے بہت زیادہ حسین اور کمسن تھی - بڑی کی عمر ۲۷ اور ۳۰ سال کے درمیان تھی لیکن دوسری کی عمر کسی طرح

۱۷ سال سے زائد معلوم نہ ہوتی تھی۔ اُس کے سر پر ریشم کا ایک قرمزی رومال بندھا تھا جس میں سے لمبی لمبی سنہری ریشمیں زلفیں نکلکر دونوں شانوں پر بکھر گئی تھیں۔ سیاہ حریر کی قبا جس پر سبز رنگ کا ٹپکا بندھا ہوا تھا کانوری گردن سے پاؤں تک چھپائے تھی۔ اُس کا سفید بیضوی چہرہ جس میں کہیں کہیں گلابی رنگ جھلکتا تھا حسن اور معصومیت کی زندہ تصویر معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بڑی سرگیں آنکھیں جن پر دراز پلکیں سایہ فگن تھیں جوشِ شباب سے مخمور نظر آتی تھیں۔ ناک کسی قدر لمبی، باریک اور عقابی تھی جسکے نیچے پتلے پتلے عنابی لبوں نے ملکر ایک چھوٹی سی کمان بنادی تھی۔ اس کے حرکات و سکنات اور چہرے کی شگفتگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے مخمصوں سے اتنی ہی بیخبر ہے جتنی کہ خدا کی معصوم ترین مخلوق ہو سکتی ہے دوسری عورت قرینہ سے اُس کی ماں معلوم ہوتی تھی جسکا اظہار اُن کے طرزِ تکلم اور دیگر اطوار سے ہو رہا تھا۔ جواد نے اپنے چہرہ کے سامنے سے کھڑکی کے پردے کو ذرا سرکایا اور کہنیاں ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ اب اسکی نظریں اِن دو ہستیوں کے ہمراہ تھیں۔ وہ اس گلکدہ سے کچھ پھول چنکر سیر کرتی ہوئیں دوسرے چمنوں میں چلی گئیں اور سورج کے آہستہ آہستہ غروب ہوجانے سے رفتہ رفتہ جواد کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئیں۔ اگرچہ اب ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن جواد بُت کی طرح اسی جگہ پر کھڑا ہوا باغ کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک غلام نے ادب کے ساتھ کہا۔ "جناب والا خاصہ تیار ہے اور صرف آپ کا انتظار ہو رہا ہے"۔ جواد غلام کی آواز سے چونک گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا اُسکے ہوش و حواس کچھ دیر کے لئے مختل ہو گئے تھے وہ فی الحقیقت ایک نہایت دلفریب خواب میں محو تھا جس سے بیدردی کے ساتھ اس کو جدا کر دیا گیا۔ اُس کی پیشانی اور ناک پسینہ سے تر تھی۔ اُس نے رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا "اُف مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا اچھا چلو"

لیکن خلاف معمول اس کو طعام اچھا معلوم نہ ہوا اور اس نے جلدی ہی کھانیسے ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانیسے فارغ ہو کر کچھ دیر تک جنرل عباس بے اور احمد آرسلاں کے ساتھ گفتگو کی پھر کسلمندی طبیعت کا عذر کر کے اپنے کمرے پر چلا آیا۔ اس وقت اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد آرام کی غرض سے بستر پر جا لیٹا۔

صبح کو جواد بیدار ہوا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں جن سے صاف ظاہر تھا کہ شب آرام واطمینان سے نہیں گذری۔ ابھی تک وہ لباس شب خوابی ہی میں تھا کہ غلام نے اطلاع کی۔ "جناب والا سواروں کا دستہ آگیا ہے۔ جنرل عباس بے بالکل تیار ہیں اور آپ کے منتظر ہیں" غلام اتنا عرض کر کے واپس ہوا۔ جواد نے جلد جلد لباس پہنا اور ہتھیار لگا کر جنرل عباس کے پاس پہونچ گیا۔ جنرل عباس نے اپنی اور جواد کی طرف سے احمد کی عنایات کا شکریہ ادا کیا اور اس سے رخصت ہو کر دونوں معہ سواروں کے حوران کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۵)

روسی اور ترکی افواج میں نہایت شدید جنگ جاری ہے۔ ہزارہا سپاہی اور سینکڑوں افسر میدانِ کارزار میں کام آگئے۔ ترکوں کی تمام کوششیں روسی سیلاب کے روکنے میں صرف ہو رہی ہیں۔ جنگ شروع ہوئے ۲ ماہ سے زائد گذر گئے۔ لیکن ترک اپنے مورچوں پر بدستور قابض ہیں۔ جواد بک اس عرصہ میں نہایت مستعدی سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا مگر اس کی طبیعت قدرے افسردہ رہتی تھی۔ آج جبکہ وہ ایک توپ کے پاس کھڑا ہوا دمدمہ تیار کرا رہا تھا چند گز کے فاصلہ پر ایک روسی گولہ آگر پھٹا جس سے بہت سے سپاہی مجروح اور کئی شہید ہو گئے ایک گولی اس کے بائیں شانے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تمام زخمی سپاہی طفلس کے فوجی ہسپتال

میں داخل کئے گئے۔ لیکن جواد بیگ کو احمد ارسلان کی خواہش کے مطابق اس کے مکان پر رکھ کر علاج کرانے کی اجازت مل گئی۔ احمد نے جواد کو ایک نہایت آرام دہ کمرے میں رکھا جس میں ایک چوکی پر ضرورت کے مطابق چند ادویات کی شیشیاں اور ظروف رکھے تھے۔ فوجی ڈاکٹر جس سے جواد کے دوستانہ تعلقات تھے اس کی صحت کے لئے بہت کوشاں تھا۔ دوسرے روز تین بجے زخم کی ٹیس دور ہوئی اور چونکہ تمام رات درد کی شدت سے جواد آرام نہ کر سکا تھا اس وقت اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس نیم خوابی کی حالت میں ابھی چند ہی لمحے گذرے تھے کہ وہ کسی کے پاؤں کی آہٹ سے بیدار ہو گیا۔ ایک نوجوان لڑکی سر سے پاؤں تک سیاہ ریشم میں ملبوس۔ جسکی صرف ناک اور آنکھیں پوشیدہ نہ تھیں چوکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور شاید جواد کو خوابیدہ خیال کر کے دواؤں کی طرف دیکھتی رہی۔ کچھ وقفہ کے بعد جھجکتی ہوئی نظروں سے جواد کو دیکھا۔ اسوقت وہ اچھی طرح بیدار ہو چکا تھا اور اس کی نگاہیں نو وارد پر پڑ رہی تھیں اس نے آہستہ سے دریافت کیا "آپ کون ہیں"

وہ لڑکی ۔ (فرش پر دیکھتے ہوئے) جناب میں احمد ارسلان کی دختر ریحانہ ہوں۔ والد صاحب نے مجھے آپ کی تیمار داری کے لئے ارشاد فرمایا ہے۔

جواد ۔ (نرم آواز سے) میں احمد ارسلان کا اور آپ کا نہایت ممنون ہوں یہاں پر مجھے ہر طرح سے آرام ہے۔ تیمار داری کیلئے غلام موجود ہیں۔ آپ کیوں تکلیف فرماتی ہیں!

ریحانہ ۔ (شرم سے گھبرائی ہوئی آواز میں) اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ مجاہدین اسلام کی خدمت ہمارا فرض عین ہے۔ ابا جان چونکہ بڑے ہسپتال میں تشریف لیجاتے ہیں اس لئے ان کو کم فرصت ملتی ہے۔ جس شئے کی ضرورت ہو آپ مجھسے فرما دیا کریں .... میں انشاءاللہ پھر حاضر ہونگی۔

یہ کہکر ریحانہ نہایت شائستگی کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔ اسوقت جواد کی آنکھوں میں اب اسے ساڑھے تین ماہ پیشتر کے واقعات جبکہ وہ کھڑکی میں حیرت زدہ کھڑا تھا پھر گئے۔ اس نے بیک نگاہ ریحانہ کو پہچان لیا تھا کہ یہ وہی مرقعِ حسن وجمال ہے جس کو باغ میں مصروف گلگشت دیکھا تھا۔ اگرچہ جواد کی حالت میں اسی روز سے تغیر پیدا ہو چلا تھا مگر اب اُس کے جذبات و حسیات نے ایک مستقل صورت اختیار کرلی۔

ریحانہ روزمرہ بلاناغہ مریض کی حالت اور اس کی ضروریات معلوم کرنے کے لئے آتی اور چند باتیں زخم، ادویات اور غازیان اسلام کے متعلق کرکے چلی جاتی۔ جواد کو ان سیدھی سادی اور معمولی باتوں میں ہی لطف محسوس ہوتا اور جبتک ریحانہ اس کے کمرے میں کھڑی ہوتی (کیونکہ وہ کبھی بیٹھتی نہ تھی۔ صرف کھڑے ہی کھڑے دوچار باتیں کرکے چلی جاتی تھی) اسوقت تک جواد کی طبیعت بہت مسرور وشادان رہتی اور اُس کے جاتے ہی وہ اپنی تکلیف میں کچھ اضافہ محسوس کرنے لگتا تھا۔ گاہے گاہے احمد ارسلان بھی جواد کی مزاج پرسی اور جنگ کے متعلق خبریں سنانے کے لئے آتا۔ ایک روز وہ اپنے ہمراہ اخبار "وقت" کا ایک پرچہ بھی لیتا آیا اور چیدہ چیدہ خبریں پڑھنی شروع کیں۔ ایک استنبولی خبر یہ تھی۔

"اس وقت فوجی ہسپتالوں میں پانچ ہزار سات سو تینتالیس (۵۷۴۳) عورتیں جنمیں کثیر تعداد شرفا کی لڑکیوں کی ہے مجاہدینِ اسلام کی تیمارداری میں مصروف ہیں۔ صنفِ لطیف میں حب الوطنی اور حمیت ملی کا جذبہ روز بروز ترقی پر ہے جس کا سہرہ محترمہ خالدہ ادیب خانم اور اُن کے رفقاءِ کار کے سر ہے"

جواد اس خبر کو سنکر بہت مسرور ہوا اور جب احمد چلنے لگا تو ہنسکر اُس کا شکریہ ادا کیا۔

اب جواد کا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ صرف خفیف نقاہت باقی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخی

اور آب وتاب بھی آہستہ آہستہ عود کر رہی تھی۔ وہ کئی کئی گھنٹے تک مخملی تکیہ کے سہارے بیٹھ سکتا تھا
ایک روز جبکہ جواد خیالی دلفریبیوں میں غرق بیٹھا تھا۔ احمد ارسلان نے ایک نہایت دلخراش
خبر سنائی۔

احمد ارسلان ۔ جواد! آج جنرل عباس کے حکم سے تمام زخمی سپاہی قارص روانہ کردئے
گئے۔ تمہاری نسبت حکم ہے کہ یہاں سے قارص اور وہاں سے دیار بکر منتقل ہو جاؤ!

جواد ۔ (پریشان ہوکر) ہیں! کیا واقعی یہ صحیح ہے۔ آپ کو اس حکم کی کچھ وجہ
بھی معلوم ہوئی؟

احمد ارسلان ۔ ہاں۔ جنرل عباس نے ایک زبردست کمک اور کافی سامان رسد
طلب کیا تھا لیکن وزارت حربیہ سے ابھی تک کوئی جواب موصول نہیں
ہوا۔ رسد کی قلت کے باعث شاید زیادہ عرصہ تک مقابلہ قائم نہ رکھا
جاسکے .... آپ کے لئے ایک خاص ہسپتالی گاڑی باہر کھڑی ہے

جواد کا دل اگرچہ بیٹھا جاتا تھا لیکن تعمیل حکم پر مجبور تھا۔ اس کے دماغ میں اس وقت خدا
جانے کیا کیا خیالات تھے جن کے اثر سے چہرہ سفید ہو گیا تھا اور پسینہ کے بڑے بڑے قطرے
پیشانی سے ڈھل کر کانوں کے پاس بہ رہے تھے۔ اگرچہ وہ خود اٹھکر چل سکتا تھا لیکن احمد
ارسلان نے از راہِ محبت اس کو سہارا دیا اور گاڑی میں اطمینان سے لیٹ جانے کے لئے
کہا۔ جواد کے چہرہ پہ وحشت برس رہی تھی۔ اس نے احمد ارسلان اور ریحانہ کی عنایات
اور تکلیف فرمائی کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کیا جس کا جواب احمد ارسلان نے نہایت غمگین
لہجہ میں دیا اور فی امان اللہ کہکر رخصت کیا۔

ترکی فوجیں کچھ دنوں تک مردانہ وار جنگ کرتی رہیں۔ بالآخر رسد کی قلت اور کمک

نہ پہونچنے کی وجہ سے پسپا ہو گئیں۔ شکست کے اسباب میں حملۂ نہر سویز کی ناکامی۔ عربوں کی بغاوت اور ترکی طاقت کا عراق عرب اور فلسطین میں منتشر ہو جانا سب سے اہم ہیں۔

(۶)

جوّاد بک کو بروسہ آئے ہوئے آٹھ نو ماہ گذر گئے۔ وہ حالانکہ جنرل عباس کی سفارش سے ایک سال کی رخصت لیکر اپنے مکان پر آیا تھا۔ مگر یہاں اس کی طبیعت نہ لگتی تھی اور ہمیشہ یہی آرزو دل میں رہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح روسیوں کو پسپا کر کے پھر طفلس تک پہونچ جائے۔ اس وقت وہ انھیں خیالات میں غرق اپنی رائفل ایک تولئے سے صاف کر رہا تھا کہ ملازم ڈاک لیکر آیا اور بہت سے خطوط اس کے سامنے میز پر رکھ دئے۔ ایک سفید لفافے کا پتہ کسی اجنبی ہاتھ نے تحریر کیا تھا اس نے طرز تحریر سے راقم خط کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن نہ پہچان سکا۔ لفافہ چاک کر کے خط کھولا تو سب سے پہلے اس لفظ پر نظر پڑی "ریحانہ"

اس کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو گئی۔ آنکھوں میں جوش مسرت سے آنسو بھر آئے چند بڑے بڑے قطرے پلکوں سے دامن چھڑا کر اس خط پر گر پڑے آخر کانپتے ہوئے ہاتھ سے رومال نکالا اور آنکھیں صاف کر کے خط پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

طفلس

پیارے جوّاد

تمہارا یہاں سے رخصت ہو کر جانا اور اس کے کچھ دنوں بعد ہی ترکی فوجوں کا شکست کھا کر پسپا ہونا ہمارے لئے سخت تکلیف کا باعث ہوا۔ ہم سب نظر بند ہیں اور طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ جوّاد! اگرچہ تم ہمارے مکان میں ایک بیگانے کی حیثیت سے مقیم ہوئے تھے لیکن تمہارے چلے جانے سے ہم اپنے گھر میں ایک بڑی کمی محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اس خیال سے بڑی کلفت ہوتی ہے کہ تم ہمارے مکان سے میلوں دور ہو۔ کیا ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تم ہمیشہ

کیلئے ہم سے جدا ہو جاؤ؟ کاش تم ہمارے مکان میں زیادہ عرصہ تک قیام کرتے اور ہم جتنی بھی ممکن ہوتی تمہاری خدمت بجا لاتے۔ میری آرزو ہے کہ تمہاری خیر و عافیت سے مطلع ہوں۔

آپ کی خدمتگزار "ریحانہ"

اس خط کو جواد نے کئی بار شروع سے آخر تک پڑھا۔ اس کی بیتاب نظروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہر ہر لفظ نہیں بلکہ ہر ہر حرف کا بغور مطالعہ کرنا چاہتی ہیں۔ اس نے خط موڑ کر چرمی بٹوے میں رکھ لیا اور اسی روز احباب سے رخصت ہو کر دو بجے دن کی گاڑی سے دیار بکر کو روانہ ہو گیا۔

جنرل عباس نے سب سے پہلے جو خبر جواد کو سنائی وہ یہ تھی کہ روس میں بالشویک انقلاب ہو گیا اور ترکی فوجیں عنقریب آرمینیا کی سرحد پر پھر جنگ کرنے والی ہیں۔ جواد کی تو دلی تمنا ہی یہ تھی۔ اس نے سب سے پہلی فوج کے ہمراہ دیار بکر کو خیر باد کہدیا۔

روسی فوجیں ترکوں کے پہلے ہی حملے میں پسپا ہو گئیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ روس میں انقلابی جماعت نے جنگ کے خلاف سخت تحریک شروع کر دی تھی۔ دوسری وجہ جنرل عباس اور جواد بک کی دانشمندانہ فوجی نقل و حرکت تھی۔ ترک فوجیں برابر قلعہ پر قلعہ اور مورچہ پر مورچہ فتح کر رہی تھیں آخر ایک روز تین دن کی شدید جنگ کے بعد ترکی افواج پھر طفلس میں داخل ہو گئیں اور اپنے قدیم مورچہ پر قبضہ کر لیا۔ اسی شام جنرل عباس کو وزارت حربیہ کا ایک تار موصول ہوا جس کے ذریعہ سے جواد بک کو "بے" کا خطاب دیا گیا۔

دوسرے دن احمد ارسلان نے جنرل عباس بے، جواد بے، عمائدین شہر اور فوج کے تمام افسران کو اپنے مکان پر مدعو کیا۔ غالباً سب مہمان جمع ہو چکے تھے کہ جنرل عباس نے کھڑے ہو کر بصد مسرت و انبساط جواد بے اور ریحانہ کے عقدِ نکاح کا اعلان کیا۔ ترکی فوجی بینڈ نے مبارکباد کے نغموں سے حاضرین کی سامعہ نوازی کی اور اپنے مسحور کن ترنم سے طفلس کی فضا کو معمور کر دیا۔

خاموش

عربی شاعری کی ابتدا

(بسلسلۂ ماسبق)

اب اگر ہم داخلی شہادتوں کی طرف متوجہ ہوں تو بعض ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو کم از کم تعجب خیز ضرور ہیں۔ اکثر اقوام میں شاعروں کے مذہب کے متعلق کسی شبہہ کی گنجایش نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان عربوں کا مذہب جنکے عہد کے کتبے ملے ہیں صاف صاف ظاہر ہے۔ جابجا کتبوں میں ایک سے زیادہ دیوتاؤں کے نام آتے ہیں اور اُن کی پرستش کے تذکرے بھی ملتے ہیں مرزبانی نے ایک کتاب تقریباً پانچہزار صفحے کی جاہلیتہ کے شعرا اُن کے فرقے اور اُن کے مذہب کے متعلق لکھی تھی[1]۔ خیال یہ ہے کہ اس تصنیف کے لئے مواد بہت کم دستیاب ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ جو اشیا ہمارے سامنے ہیں اُن میں مذہب کا ذکر شاذونادر ہی آتا ہے۔ ایک شاعر یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کا مذہب بھی وہی ہے جو دوسروں کا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ کیا ہے[2]۔ کم از کم وہ مشرکانہ انداز جو کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے بالکل ناپید ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جس سے پیری شیخو نے یہ نظریہ قایم کیا ہے کہ وہ سب کے سب عبرانی تھے لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا[3]۔ ان نام نہاد عیسائیوں میں سے بعض اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ کسی دوسرے فرقے کے رکن ہیں۔ مثلاً اعشیٰ بنی قیس جسکا نام شیخو کی فہرست میں بہت نمایاں ہے ایک جگہ کچھ دادخواہوں کا ذکر کرتے ہیں کہتا ہے کہ وہ اپنے آقا کے دروازہ کا طواف اسطرح کر رہے تھے جیسے عیسائی اپنے تبخانے کا کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان چند اشعار میں جنمیں کسی بت کے نام کی قسم کھائی گئی ہے ایک

---

[1] فہرست [2] عمرو بن قمیعہ (۲-۹) [3] آغانی (۲۰-۱۲۹)

شعر اس کی طرف بھی منسوب ہے[1]۔ عیسائی خواہ وہ کہیں بھی ہوں اپنے ساتھ اپنی مذہبی کتابیں ضرور رکھتے ہیں اور اُن کے الفاظ اور اُن کی طرز گفتگو پر ان مقدس صحیفوں کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ان کی شاعری اکثر مناجات کی صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن اسلام کے قبل کی شاعری میں کہیں بھی مسیحی دنیا کے رسم و رواج کا ذکر نہیں ملتا حتیٰ کہ ان شاعروں کے کلام میں بھی نہیں جو عیسائی امرا کے دربار میں رہتے تھے۔

اغانی کا لائق مصنف ایک شاعر کو جو پہلی صدی ہجری کے اواخر میں گذرا ہے عیسائی ہونے کے متعلق یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس نے انجیل۔ راہب اور دین مسیح کی قسم کھائی ہے اور واقعی اس کا خیال صحیح ہے کہ یہ مسیحی قسمیں ہیں۔ جاہلیتہ کے شعرا قسمیں کھاتے تو بہت ہیں لیکن عام طور پر وہ اللہ کے نام کی ہوتی ہیں۔ اور یہی قسم ہے جو ان کے دیوانوں پر چھائی ہوتی ہے۔ جاہلی شاعر عبید بن الابرص تو بالکل قرآن کی زبان میں کہتا ہے کہ "قسم خدا کی بیشک خدا جس پر چاہتا ہے مہربانی کرتا ہے اور وہ غفور رحیم ہے[2]"۔ اللہ کے متعلق ان کے عقائد ایسے ہیں کہ ان پر کسی موحد کو ذرا بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور اکثر مقامات پر وہ حرف بحرف قرآن کے بیانات کے مطابق ہیں اللہ دنیا کو کھولتا اور بند کرتا ہے اس سے محسنوں کو جزا دینے کی[3] اور بچھڑوں کو ملانے کی دعا کیجاتی ہے۔ وہی ہے جسکے احکام کی اطاعت لازمی[4] ہے۔ اسی کو عورتیں تکلیف کے موقع پر پکارتی ہیں[5]۔ اس سے پانی میں برکت طلب کیجاتی ہے[6]۔ اور اسی کو پکار کر بد دعائیں بھی دیجاتی ہیں۔ اللہ سے مانگنے والا بندوں سے طلب کرنیوالے کی طرح ناکام نہیں رہتا۔ وہ ان باتوں سے ڈرتے ہیں جو اللہ کی نظروں میں

---

[1] اغانی (۲۰۔۱۲۹) [2] دیوان (۱/۷۔۱) [3] ذوالاصبع۔ اغانی (۳۔۹)

[4] اغانی (۱۳۔۵) [5] حارث (معلقہ ۴۴) [6] اغانی ۴۔ ۱۵۱ [7] عبید (۱۹۔۸)

گناہ ہیںؔ۔ اور اسی کو اپنے ہر معاملہ میں شاہد ٹھیراتے ہیں[1]۔ اللہ جانتا ہی جو کچھ دوسروں پر پوشیدہ ہی[2]۔ اور وہی بنی نوع انسان کا مالک ہی۔ ایک بت پرست شاعر کہتا ہی قسم خدا کی کہا مسافر کو جبکہ زمین اُسے آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے، علم ہے کہ خدا کیا کرنے والا ہی[3] بعض بعض جگہوں پر قرآن کی طرح اللہ کے بجائے رحمن کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہی۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی مذہب سے جاہلیتہ کے شعرا کا تعلق ظاہر کیا جا سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ پکے موحد ہیں اِس لئے کہ وہ بجز اللہ کے اور کسی معبود کا شکل سے ذکر کرتے ہیں اور کرتے بھی ہیں تو تعظیم کے ساتھ نہیں کرتے[4]۔ بلکہ ان کے اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں ان باتوں کا بھی علم ہے جو قرآن کے بیان کے مطابق نزولِ وحی سے پہلے کسی عرب کو معلوم نہ تھیں۔ چنانچہ سورۂ ہود (۱۱-۵۱) میں مذکور ہے کہ نہ تو پیغمبر کو اور نہ اُن کی قوم کو نوح کے متعلق کوئی علم تھا اور کتبوں کے مطالعہ کے بعد ہم بھی اسی نتیجے پر پہونچتے ہیں اس لئے کہ ان میں ان عربی انساب کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا جو انجیل میں جا بجا بیان کئے گئے ہیں لیکن نابغہ بنی ذبیان جس کی تاریخ عروج (اور ایک بیان کے مطابق تاریخ وفات) شیخو کے خیال میں ۶۰۴ء ہے نہ صرف نوح کے قصے سے واقف ہی بلکہ بعض ان خصوصیات سے بھی آگاہ ہے جسکے لئے قرآن ہی ایک واحد سند ہی۔ وہ کہتا ہے

فَالْفِيتُ الْأَمَانَةَ لَمْ تَخُنْهَا

كَذَالِكَ كَانَ نُوحٌ لَا يَخُونُ

---

[1] ابن قتیبہ ۴۴۔ [2] اغانی (۴-۱۴۴) [3] عبید ۱۰۵

[4] حارث (معلقہ ۵۵) اغانی (۱۳-۷)

[5] عبید بن الابرص (۱۳-۱۴)

اب یہاں صاف طور پر اس لقب کا حوالہ ہے جو قرآن میں نوح کے لئے استعمال کیا گیا ہے یعنی "امین" (۲۶ - ۲۷) اسی طرح بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عنترہ بنی عبس قرآن اور اسلام کی اصطلاحوں سے رسول عربی کی بعثت سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ ایرانی بادشاہ نوشیرواں (متوفی ۵۷۸ء) کی مدح میں جو قصیدہ اس نے لکھا ہے اس میں اسے سائلوں کا قبلہ[1] کہکر مخاطب کیا ہے۔ حالانکہ قبلہ اسلام کی ایک مخصوص اصطلاح ہے جس سے مراد ہے سمت نماز لیکن غالباً یہ استعجاب کا کوئی موقع نہیں۔ اس لئے کہ صاحب اغانی کے خیال میں اسلام سے قبل بھی اہل مدینہ کے یہاں ایک مسجد تھی جس میں قبلہ بھی متعین تھا[2]۔ یہ دوسری بات ہے کہ عام طور پر مسجد اور قبلہ اسلام کی جدت خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ شاعر نماز کے مختلف ارکان مثلاً رکوع، سجود، اور مقام ابراہیم سے بھی واقف ہے حالانکہ ابراہیم کا تعلق حرم کعبہ سے بجز قرآن کے اور کہیں سے ثابت نہیں ہوتا۔ دوزخ کے لئے جو اسلامی نام ہیں مثلاً جحیم اور جہنم، ان سے بھی یہ ناواقف نہیں ہے اور ان محاورات کو بھی جانتا ہے جو قرآن میں یوم الحساب کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً قیامت اور محشر۔ اس کے علاوہ قرآن کے اور فقرے بھی جابجا اس کے اشعار میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً جبار عنید وغیرہ۔ اس طرح کوئی وجہ ایسی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس شاعر کے مسلمان ہونے میں شک کیا جائے۔ بجز اس کے کہ وہ اسلام کے ظاہر ہونیسے پہلے اس دنیا سے گذر چکا تھا۔

یہ جاہلی شاعر غالباً اپنے اسلام کا اظہار بہت نمایاں طور پر کرتا ہے۔ لیکن دوسرے بھی ایک جھلک ضرور دکھا دیتے ہیں۔ قرآن کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی کا فرق عربوں کو سب سے پہلے رسول عربی ہی نے بتایا تھا۔ اس لئے کہ

---

[1] (دیوان مطبوعہ قاہرہ ص۲۵۱) [2] (۱۳ - ۱۱۶ - ۱۲) [3] (دیوان مطبوعہ قاہرہ ص ۱۰۱)

ان کے دشمن اس خیال کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اس لئے ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ لفظ 'دنیا' (قریب تر) جو اس عالم کے لئے قران میں جا بجا استعمال ہوتا ہے قرآن ہی کی ایجاد ہے۔ وہاں یہ لفظ کبھی تنہا لیکن اکثر حیوٰۃ کے ساتھ بولا گیا ہی۔ جو شخص موجودہ زندگی کو قریب تر زندگی کے نام سے موسوم کرتا ہے اس کے ذہن میں ایک دور کی زندگی ضرور ہوگی اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہی جسے سن کر شروع شروع میں قرآن کے مخاطبین نے سخت حیرت اور حقارت کا اظہار کیا تھا۔ لیکن جاہلیۃ کے شعرا اس محاورہ سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں۔ عبید بن الابرص جو نزول قرآن سے بیسیوں برس پہلے گذرا ہے "متاع الحیوٰۃ الدنیا" کا ذکر کرتا ہے[1]۔ اسی طرح ذوالاصبع بھی جو جاہلی شاعر ہی قرآن کا محاورہ "عرض الدنیا" استعمال کرتا ہے[2]۔ اول الذکر ایک دفعہ امراء القیس کے باپ کے سامنے اظہارِ عتاب کرتے ہوئے لفظ قیامت استعمال کرتا ہی[3] اور دوسری جگہ ایک ایسا لفظ بول جاتا ہی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اسلامی قانونِ وراثت سے بھی واقفیت ہی (یعنی رشتہ دار کے لئے ذو سہمۃ) اور موخر الذکر کتاب اور سنت کے فرق سے بھی واقف ہی۔ یہ شعرا جب خدا کی شانِ قہاری کا ذکر کرنا چاہتے ہیں تو بے تکلف اِرم۔ عاد اور ثمود کی وہ مثالیں جو قرآن میں جا بجا آئی ہیں پیش کرتے ہیں[4] اور اکثر عاد و ثمود کو خلط ملط کر دیتے ہیں[5]۔ جس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن میں ان کا ذکر ہمیشہ ایک ساتھ کیا گیا ہی۔ اور وہیں سے غالباً ان کے قصے مستعار لئے گئے ہیں۔ مہلہل بھی جو قصیدہ کا بانی کہا جاتا ہی اور جو رسول عربی سے تقریباً ایک صدی پہلے گذرا ہے قرآن کے محاورے استعمال کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ چنانچہ اس کا

---

[1] دیوان (٨٠-٢٨) [2] اغانی (٣-٩) [3] ابن قتیبہ (٣٤-١٥)

[4] اغانی (١١-٦١)، عمر بن قمیئہ (١٣-٤) [5] زہیر معلقہ ٣٢ - ہذیل

ایک شعر ہے۔

نَعَی النُّعَاۃُ کُلَیْبًا لِی فَقُلْتُ لَھُمْ

مَادَتْ بِنَا الْاَرْضُ اَوْمَادَتْ رَوَاسِیْھَا

اس کا مطلب سورۂ نحل کی اس آیت سے حل ہوتا ہے۔ والقیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم آگے چل کر سورۂ والنّٰزعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد پہاڑ ہیں (وَالْجِبَالَ اَرْسٰھَا) اسی طرح تابط شراً شنفری کے مرثیہ میں قرآن کے الفاظ نقل کرتا ہے[۱]

کبھی کبھی قرآن کا اثر اتنا صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم ناقدین سے بھی کچھ بنائے نہیں بنتی چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ لبید کی اس نظم کی اصلیت مشتبہ ہے جس میں اصحاب فیل کے قصے کا ذکر ہے اور اُن کی شکست خدا کی طرف بجنسہٖ اسی طرح منسوب کیگئی ہے جسطرح قرآن میں ہے[۲]۔ صاحب اغانی نے حُصین ابن الہمام کے اسلامی شاعر ہونے کے ثبوت میں ایک اسی قسم کی دلیل پیش کی ہے[۳]۔ دوسروں کی نظر اتنی ناقدانہ نہ تھی۔ مطہر ابن طاہر جو چوتھی صدی ہجری کا آدمی ہے زید بن عمرو بن نفیل (جاہلی) کی ایک نظم پیش کرتا ہے جس میں اس نے توحید کی تعلیم دی ہے۔ ان اشعار میں ہو بہو وہی مضمون باندھا گیا ہے جو قرآن میں جا بجا موسیٰ اور ہارون کے متعلق فرعون کے مقابلہ میں آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس شاعر نے اپنے اسلام کا اظہار "اسلمتُ وجھی" کے استعمال سے پوری طور پر کر دیا ہے۔ امیہ بن ابی الصلت جو عیسائیوں کے متعلق ایسے خیالات ظاہر کرتا ہے کہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ خود عیسائی نہیں ہے۔ روزِ حساب کے لئے ایک ایسا لفظ استعمال کرتا ہے جو ہمارے خیال میں قرآن ہی کی ایجاد ہے خواہ ہم تھوڑی دیر کیلئے یہ تسلیم بھی کریں کہ زمانہ جاہلیتہ کے عربوں میں اس قسم کے دن کا تخیل

---

[۲] دیوان لبید مولفہ بروکلمین ص۳۲ [۳] (اغانی ۱۲۔ ۱۲۳)

موجود تھا ۔ خنساء اپنے ایک شعر میں لفظ رہبانیہ کا استعمال کرتی ہے جو بظاہر قرآن کی ایک اصطلاح ہے ۔ اسی طرح حاتم طائی جو عیسائی کہا جاتا ہے مسلمانوں کے نعرۂ اللہ اکبر سے واقف معلوم ہوتا ہے۔

یہ بات قرین قیاس ہے کہ محمد (صلعم) سے پہلے بھی عرب میں کچھ ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے بت پرستی کے خلاف آواز بلند کی تھی ۔ اس کے علاوہ بظاہر عیسائیت کا بھی عرب کے بعض حصوں میں کافی اثر موجود تھا ۔ اگر زمانہ جاہلیت کے شعرا عیسائیوں کی طرح شعر کہتے ہوتے یا ان کے کلام میں عیسائی رسم ورواج کی جھلک پائی جاتی تو اُن کے متعلق اگرچہ ہمیں دوسری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ۔ مثلاً یہ کہ اُن کی روایت کسقدر مستند ہے لیکن کم ازکم ان کے مذہب کے متعلق کسی شبہہ کی گنجائش نہ ہوتی ۔ مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی باتیں بالکل مسلمانوں کی سی ہوتی ہیں ۔ وہ ویسے ہی موحد ہیں جیسے کہ رسول عربی کے پیروان کے بعد تھے اور اگر کبھی کسی مقدس کتاب کا اثر ان پر ظاہر ہوتا ہے تو وہ قرآن کا ہے تو اُن کی اصلیت کا یقین کرنا ہمارے لئے مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ کیا وجہ ہے کہ کتبوں سے تو یہ ظاہر ہو کہ عربوں کے دماغ میں ان کے مختلف مقامی دیوتا سرایت کئے ہوئے تھے اور اسی عہد کے شعرا کے کلام سے یہ معلوم ہو کہ الفین بجز اس خدا کے جس کی وحدت کا دعویٰ اسلام کرتا ہے اور کسی معبود کا علم ہی نہیں مانا کہ کتبے دوسرے قبائل کی یادگار ہیں اور شعرا دوسرے قبائل کے نمایندے لیکن پھر بھی رسول عربی کی رسالت کا کیا حشر ہوتا ہے ۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اُن کے مخاطبین ایک خدا کو مانتے تھے اور قیامت کا یقین رکھتے تھے ۔ اگر ہم کتبوں سے قیاس کریں تو یہ اقرار کرنا پڑیگا کہ قرآن کی حجت صحیح ہے ۔ ممکن ہے کہ اہل مکہ اور اُن کے پڑوسیوں کا مذہب بالکل ویسا ہی نہ ہو جیسا کہ ان لوگوں کا تھا جنکے ہاں سے کتبے نکلے ہیں ۔ تاہم انمیں کچھ نہ کچھ یکسانیت تو ضرور ہوگی ۔ مگر جاہلی شعرا کے

خیالات تو مذہبی معاملات میں وہی معلوم ہوتے ہیں جو قرآن نے سکھائے ہیں۔

دوسرا غور طلب مسئلہ زبان کا ہے۔ جتنی نظمیں پیش کیجاتی ہیں سب قرآن کی زبان میں ہیں اگرچہ خال خال الفاظ یا محاورے ایسے بھی ملتے ہیں جنکے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں خطہ یا قبیلہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ اسلام کے عرب پر مسلط ہو جانیسے اُن کی زبانوں میں یکسانیت پیدا ہوگئی اس لئے کہ اس نے ان کے سامنے ایک ایسا ادبی نمونہ قرآن کی صورت میں پیش کر دیا جس کی صحت بالکل مسلم تھی تو اس کی مثالیں اور بھی مل سکتی ہیں۔ روما کی فتح نے اٹلی ہسپانیہ اور گال کے ساتھ یہی کیا تھا۔ لیکن یہ مان لینا مشکل ہے کہ قبل اس کے کہ اسلام کوئی ایسا اثر ڈال سکے تمام عرب میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ایسی زبان رائج تھی جو کتبوں کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ مختلف قبیلوں میں یا کم از کم قبیلوں کے مختلف مجموعوں میں لغت اور قواعد کا ایسا فرق ضرور رہا ہوگا جو آسانی سے معلوم ہو سکے پیری شیخو کے مجموعہ کی ابتدا جنوبی عرب کے شعرا سے ہوتی ہے۔ اُن کے اشعار بھی قرآن ہی کی زبان میں ہیں۔ خود جنوبی عرب کے کتبوں میں متعدد زبانیں استعمال کیگئی ہیں اور بعض کتبے تو رسولِ عربی کے زمانہ سے کچھ ہی پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کتبے بڑی مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں اس لئے کہ عربی ادب اس معاملہ میں کوئی مدد نہیں دیتا۔ باوجود اس کے مسلمان ماہرین آثار قدیمہ حضرموت کے ایک بادشاہ کے جو اشعار پیش کرتے ہیں اور جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے حمیری رسم الخط میں انہیں لکھوایا تھا۔ وہ بھی قرآن ہی کی زبان میں ہیں[1]۔ اس روایت کا ذمہ دار ابن الکلبی ہے جو مستند محققین میں سے ہے۔ ایک حمیری اہل حبشہ کے حملے سے پہلے کا ہونے والا دو شعر لکھکر اُن پر مہر کرتا ہے۔ یہ اشعار نہ اس زمانہ کے کتبوں کے مطابق ہیں

[1] اغانی (۱۔ ۱۲۵)

اور نہ کچھ بعد کے کتبوں کے، بلکہ قرآنی عربی میں ہیں ۔ ان متذکرہ بالا مثالوں میں شاید ہی کسی کو شبہہ بھی ہو کہ اشعار سراسر مصنوعی ہیں اور ان قصوں کی جو ان کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ نہیں ہے ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان نظموں کی سندیں بھی یا تو وہی ہیں جو نشیخو نے یمن کے شعرا کے متعلق پیش کی ہیں یا کسی طرح ان سے کم قابلِ اعتبار نہیں ہیں ۔ اور اغانی کا مصنف جو کہیں کہیں نقد سے بھی کام لیتا ہے انھیں بغیر کسی شبہہ کے روایت کرتا ہے اُسے اِن روایتوں پر اتنا ہی اعتماد ہے ۔ جتنا بعض ان مسلمان متکلمین کو اپنے بیان پر جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اعتقاد کی بنا یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو نقطوں کے پڑھنے میں غلطی ہو گئی تھی ۔ لفظ اصل میں نَبِیّ تھا لیکن غلطی سے بُنَیَّ پڑھا گیا ۔ انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ اعتقاد عربی حروف ہجی کی ایجاد سے کئی صدی پہلے ہی موجود تھا ۔ اور نقطے تو حروف کے تقریباً سو برس بعد عالم وجود میں آئے ہیں ۔ ان عربی اشعار کو جو قرآن کی زبان میں ہیں ۔ یمن کے جاہلی شعرا سے منسوب کرنا بھی اسی قسم کی غلطی ہے ۔ اوّل تو یہ کہ کوئی شہادت جنوبی عرب میں شاعروں کے وجود کی نہیں ملتی اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہاں کچھ شاعر تھے تو وہ اپنی کسی جنوبی زبان میں لالاپتے رہے ہوں گے ۔ نہ کہ قرآن کی زبان میں ۔ اس طرح بعض مقامات پر صریح بد دیانتی کی مثالوں کی موجودگی میں ہمارے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا یقین کریں اور کیا نہ کریں ۔

شمالی عرب میں دو ایک کتبے تو ضرور قرآن کی زبان میں ملے ہیں لیکن دوسرے کتبوں سے بولیوں کی وہی کثرت ظاہر ہوتی ہے جو جنوبی عرب میں ہے اور طرہ یہ ہے یہاں بھی جہاں تک ہمارا علم ہے نظم کا عنصر بالکل مفقود ہے ۔ اسلام کی ابتدا حجاز سے ہوئی ہے اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اِس خطہ کی تاریخ کا جنوب کی تاریخ سے زیادہ علم ہوگا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعض جنوب کا شمال سے زیادہ علم ہے۔ اس لئے کہ یہاں ایسے واقعات بکثرت گذرے ہیں جن کا اثر سارے ہندوستان پر پڑا ہے تاہم اُن کی معلومات جنوب کے متعلق اتنی ناقص تھیں کہ وہ وہاں کے بادشاہوں سے اس زبان کے اشعار منسوب کرتے ہیں۔ جس کے متعلق کتبوں کی شہادت کے مطابق ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اُن کی نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اِن محققینِ سلف نے جس زمانہ میں اپنے مجموعے تیار کئے ہیں اس وقت جنوبی عرب میں اسلام کی بدولت قرآن کی عربی کو ایک ادبی زبان کا رتبہ حاصل تھا۔ لیکن یہاں بھی اُس کے غلبہ کا وہی سبب ہے جو اور حصوں میں تھا۔ اب تک تو یہ یقین کر لینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ قرآن سے پہلے بھی کسی حصہ میں یہ ایک ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔

غزل

سید محمد ہادی مچھلی شہری۔ بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی وکیل علیگڑھ

منت کشِ نسیمِ سحر یہ چمن نہیں — پژمردہ دل میں ایک بھی داغِ کہن نہیں

کیا مطمئن ہوں جلوہ ترا چشمِ غیر میں — ہر دامنِ نگاہ سوادِ وطن نہیں

مایوسیوں نے سارے زمانہ سے کھو دیا — وہ ہم نہیں وہ دل نہیں وہ انجمن نہیں

ہر روئے گل میں باغِ جہاں کی ہے کب بہار — ہر گیسوئے دراز کا دامن ختن نہیں

اے وحشتِ جنونِ محبت خدا گواہ — تو ہے اگر تو مجھکو غمِ پیرہن نہیں

تصویرِ دل ہے یوں تو مری ہر نگاہِ یاس — البتہ چشمِ تر میں فریبِ سخن نہیں

منصور یوں تو سیکڑوں مل جائیں گے مگر — وہ میہماں نوازیِ دار و رسن نہیں

کیونکر ہو حریصِ تمنا مرا خیال — مجبور ہوں کہ تنگ مرا پیرہن نہیں

گلزارِ آرزو میں ہیں کانٹے بھی بیشمار — ہر مرکزِ نگاہ گلِ یاسمن نہیں

واقف نہیں کوئی مرے سوز و گداز سے — بے بہرہ شمع ہے جو سرِ انجمن نہیں

حیرت ہوئی نہ خندۂ گل پر مجھے کبھی — از بسکہ اس میں رنگِ دلِ پیرہن نہیں

پھولوں سے کم نہیں دلِ بلبل کے زخم بھی — کیونکر کہوں کہ کنجِ قفس میں چمن نہیں

نازاں ہیں اپنی ہمتِ پائے طلب پہ ہم — صحرا میں سر کو پھوڑ لوں کعبہ کو کہن نہیں

دل محشرِ خیال ہے اس میں وہ کیا رہیں؟
ہاں دیکھ یہ کوئی بزم نہیں انجمن نہیں

دخترِ نابینا

(پروفیسر سید اطہر علی۔ ایم اے۔ ایم او۔ ایل)

سحرگاہے کہ خرم بود و خنداں — نسیمش جاں دہِ تنہائے بیجاں
سرِ خود را تہی کردم ز بالیں — بدر کردم خمارِ خواب نوشیں
دمِ سردِ سحر از عطرِ بیزی — صبا را دادہ طرفہ شور خیزی
شدم سوئے گلستاں بہرِ گلگشت — بدنبالِ صبائے سرخوش و مست
رسیدم در گلستان و چمیدم — ز بہرِ چشم و دل سرمہ بچیدم
ز رنگِ گل من احسن بر زبانم — ببویش فتنہ از جاں بود جانم
بچشمِ نیم وا نرگس بگلشن — حریفِ غنچہ آزادہ سوسن
شقایق آتشے زد در چمنہا — مہیا آبِ ریزی را تنہا
تماشائے نگارستانِ فطرت — مرا انداخت در گرداب حیرت
ز خود برگشتم و غرقہ دویدم — سرِ زانو دراں گلشن گزیدم
پس از چندے دلم زیں حالم آمد — چو بینم دخترے نوسال آمد
گلے بود از ریاضِ صنعِ حکمت — برنگ و بوئے خود یکتائے خلقت

قدش غیرت دهِ سروِ گلستان — خدش حیرت فزاے ماهِ تابان

طراز حسن آں طرفه نگارے — گلستانِ زماں را نو بهارے

ولے دل داشت پابندِ حرارت — که چشمش بود بے کحلِ بصارت

ببرگ نیل فرمالاے از گل — بمن آورد از بهرِ تحمل

بگفت ایں سبحهٔ ناچیز چیزے — پذیر از دستِ ایں نادیده چیزے

مرا دل موم شد از آرزویش — روا کردم بزوری آرزویش

دو چشمم پر شد و اشکم بیبارید — بیامد ابر بارانے بیبارید

بدو گفتم که اے حسن و لطافت — فدائے ....

دلم بر حال تو بسیار سوزد — چو شمعے بر سرِ بیمار سوزد

تو از خوبیِ ایں گلها چه دانی — که در صورت بایں گلها نمانی

غزل

ہاں تو اے بیدادگر! روز اک نئی بیداد ہو

(از مولانا تمنا عمادپوری)

جبکہ ہر مرغِ چمن محوِ رخِ صیاد ہو — باغباں پھر تجھکو کیا! گلشن اگر برباد ہو

آشیاں پر گر رہی ہو برق، بلبل کا یہ رنگ — جی ہی جی میں خوش رہے اور دل ہی دل میں شاد ہو

ہے یہ کیا حسرت؟ کہ شاید کھول دے صیاد پر — بلبلِ ناداں قفس کو توڑ کر آزاد ہو

کافرِ ملت ہے وہ اس وقت جو خاموش ہے، — چاہیے اپنے وقت کا ابدال یا اوتاد ہو

نوحہ خوانی کر رہے ہوں غیر جسکے دین کی — شادیاں ہوں اُسکے گھر، شورِ مبارکباد ہو!

دین و ملت لٹ چکی عزت بھی کھوئی جا چکی — اور ابھی آگے خدا معلوم کیا افتاد ہو

کھو کے خودداری کو ہوں ساری خدائی میں ذلیل — میں نہ مٹی ہوں تو کیوں مٹی مری برباد ہو

گوشۂ راحت میں خود ہیں سعیِ ظاہر چھوڑ کر — دل میں یہ حسرت کہ میری غیب سے امداد ہو

ہیں نہیقِ خر فغانیں، درد اگر دل میں نہیں — دکھ بھرا دل ہو تو ہاں حسرت بھری فریاد ہو

لذتِ حبّ الوطن سب جانتے ہیں یوں مگر — اسکے دل سے اسکو پوچھو جس کا گھر برباد ہو

کس طرح رہتی ہے تمکو اپنے بیٹوں سے امید — مادرِ دینِ وطن کی تم بھی تو اولاد ہو

ہم خود اپنے ہوں، تو پھر کیا ہمکو بیگانوں کا ڈر — ساری دنیا چاہے بیگانوں ہی سے آباد ہو

ظلم سہنے میں تو ہے اک راحتِ پنہانِ روح — چاہیے مظلوم کو ظالم سے بڑھکر شاد ہو

ہمتو واقف ہو گئے اب لذتِ بیداد سے — ہاں تو اے بیدادگر! روز اک نئی بیداد ہو

جانتے ہیں رحمِ ظالم باعثِ صد ننگ ہے — کیوں خدا ناکردہ ہم پر مہرباں صیاد ہو

آئے میرے خون سے کر لے زبانِ خشک تر — نشترِ فصّاد ہو، یا خنجرِ جلّاد ہو

ہے ہمارے پاس جو کچھ سب ہے نذرِ تیرِ ظلم — لختہائے افئدہ، یا ریزۂ اکباد ہو

ہم تو مر کر بھی حیاتِ جاوداں پاتے ہیں — ہاں، مبارک مرگِ دائم تجھکو اے جلاد ہو

لاکھ زور آور ہو کوئی قوم، پھر کمزور ہے — تم تو خود ہی واقفِ حالِ ثمود و عاد ہو

پہنچ سکتا ہی جہاں میں پھر کسی موسیٰ کو حق — چہ کوئی دنیا میں گر فرعون یا شدّاد ہو

قول پر ایمان، قائل کا نہیں میں معتقد
جانتا ہوں میں تمنا! تم بڑے استاد ہو

غزل

ایضاً

اے قافلۂ دل را ناگاہ زدی در رہ — دیگر نکنم عشقت لو انّ لنا کرّۃ

اے رنج و ملالِ عشق! از تست ہمہ شادی — یا مُحیی مَن اغتنم فالغُنم لقد مرّہ

گرہ شدی اے سالک! قائم چو نہ بر شرع — منزل نہ تواں دیدن ننہادہ قدم بر رہ

چوں من ستم خود را ہر کس شد روادارد — ما یأمرنی افعل بی ذالک قد غرّہ

یا یک خیالِ من یا ایں دلِ زارِ من — تا کوچۂ زلفِ او بردہ ست نہ دیگر رہ

اے یار مگو کز عشق رستگی تو نمیداری — انّ وجہی مصفرّۃ والعبرۃ محمرّۃ

اس حور کا کوچہ ہو، یا گورِ غریباں ہو
مرنا ہی تمنا! جب جا یار کہیں مر رہ

غزل

(از حضرت جگر مراد آبادی)

دہر کی نیرنگیوں کا نوبِ عرفاں ہو گیا
لا شرابِ کہنہ ساقی دل پریشاں ہو گیا

نور لگا رنگیٔ صحرائے امکاں ہو گیا
اپنے جلووں میں مقید آپ انساں ہو گیا

ہر تڑپ کے ساتھ اک جلوہ نمایاں ہو گیا
آج ثابت یار کا قربِ رگِ جاں ہو گیا

برق چمکی تھی کہ برپا جوشِ طوفاں ہو گیا
المدد اے شوقِ نظارہ پریشاں ہو گیا

چھوٹ سکتا تھا کہیں یوں جسم سے دامانِ روح
پھر کبھی ملنے کا شاید عہد و پیماں ہو گیا

دل گلستاں تھا تو ہر شے سے ٹپکتی تھی بہار
یہ بیاباں جب ہوا عالم بیاباں ہو گیا

ایک مرکز پر سمٹ آیا جہانِ آرزو
کثرتِ موہوم سے جب دل پریشاں ہو گیا

ورنہ کیا تھا صرف ترکیبِ عناصر کے سوا
خاص کچھ بیتابیوں کا نام انساں ہو گیا

روح قالب سے نکل کر اصل میں گم ہو گئی
نے سے ہوتے ہی جدا نغمہ پریشاں ہو گیا

دل کے پرتو بن گئے سب نقش ہائے رنگ رنگ
ایک ذرہ موجدِ کل بزمِ امکاں ہو گیا

چشم پرنم زلف آشفتہ نگاہیں بیقرار
اس پشیمانی کے صدقے میں پشیماں ہو گیا

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہو گیا

دامنِ گلچین

غالب

دعویٔ عشقِ بتاں سے بہ گلستاں گل و صبح
ہیں رقیبانہ بہم دست و گریباں گل و صبح
آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر
بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح
زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند اسد
غفلت آرامیِ یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

دلِ ناامید کیونکر بہ تسلی آشنا ہو — جو امیدوار رہئے ہمہ مرگ ناگہانی
مجھے بادۂ طرب ہے بہ خمار گاہِ قسمت — جو ملی تو تلخکامی جو ہوئی تو سرگرانی
نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے ہاں تھی — مجھے طاقت آزمانی تجھے الفت آزمانی
ہزار امیدواری رہی ایک اشکباری — نہ ہوا حصول زاری بجز آستیں فشانی
یوں ہی دکھ کسیکو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

امیر مینائی

ایک جاں اور حسرتیں لاکھوں — ایک دل اور ہزارہا مطلب

منہ لگے کون روز ناصح کے — بات سمجھے نہ بات کا مطلب

ساقی ترے ہجر میں ہی یہ ضعف — توبہ نہیں ہے ٹوٹتی ہے

شورِ محشر امیرؔ کو نہ جگا — سوگیا ہے غریب سونے دے

عشق نے زور دکھایا تھا امیرؔ — کوہکن کو ہکنی کیا کرتا

حسرت

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے — ڈرتا ہے جگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے
ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا — یہ وہم کہیں تم کو گنہگار نہ کر دے
ہوتا ہے برا لذتِ آزار کا ایسا — مرنا بھی کہیں مجھکو یہ دشوار نہ کر دے

عشق ہرچند رامِ حسن رہا — پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس
ہم بھی حاضر ہیں بندگی کے لئے — آپ کو ہو جو صاحبی کی ہوس
بیخودی ہائے عاشقاں کو نہیں — عاقلیہائے آگہی کی ہوس

نامرادوں کو شاد کام کرو — کرم اپنا کہیں تو عام کرو
کارِ عاشق ہے ناتمام سو تم — قتل کر کے اسے تمام کرو
پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو — تم بھی حسرتؔ اٹھو سلام کرو

مطبوعات جدیدہ

دین کامل | مفتی سید عبد القیوم صاحب وکیل جالندھر پنجاب نے مذہب اسلام کی حقیقت اور اس کے علمی و عملی اصولوں کے متعلق یہ کتاب آٹھ جلدوں میں لکھی ہے جسکی پہلی جلد شائع ہو کر ہمارے پاس بغرض تنقید وصول ہوئی ہے۔ اس میں مذہب کی تعریف۔ اس کی ضرورت۔ اس کے فطری ہونے کے دلائل پھر فطری مذہب کی شناخت اور فطری عقلی اور الہامی اسلام کے اصول بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

انداز بیان نہایت معقول اور زبان عمدہ ہے۔ ہمکو تعجب ہوتا ہے کہ نفائس القصص والے ہمارے دوست مولوی فتح محمد خانصاحب کے شہر میں اس قسم کی اچھی اردو لکھنے والے لوگ بھی ہیں۔ چھپائی اور لکھائی بھی نہایت دیدہ زیب ہے اور مصنف سے ۸عہ پر مل سکتی ہے۔

مضامین اور ابحاث جو اس کتاب میں مندرج ہیں وہ اس دینی مذاق کا پتہ دیتے ہیں جو آج سے تیس چالیس سال پیشتر سر سید اور اُن کے رفقا نے ہندوستان میں پیدا کیا تھا۔ مصنف نے آغاز مسئلہ سے ابتدا کیا ہے یعنی یہ کہ مذہب کیا ہے۔ اس کی ضرورت کیا ہے۔ فطرت انسانی میں کہاں تک اس کو دخل ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس وجہ سے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اس کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ مسلمان یا کفار؟

دین (جسکے بجائے اس کتاب میں ہر جگہ مذہب کا لفظ مستعمل ہوا ہے) کے دو طریق ہیں ایک ایمان دوسرا استدلال۔ اس کتاب میں بھی دوسرا طریق اختیار کیا گیا ہے۔ جو خود حکمائے اسلام کے نزدیک عقیم الانتاج مسلم ہو چکا ہے۔ کیونکہ استدلال محض سے نہ دین حاصل ہوتا ہے

نہ اس کی تبلیغ ہو سکتی ہے۔

باقی رہے وہ دلائل جو مصنف نے اس کتاب میں لکھے ہیں نہ فلسفیانہ ہیں نہ دینی بلکہ محض اقناعیات وخطابیات ہیں اور مشہور کسی عالم یا متکلم یا شاعر کے کلام کی نقل کافی سمجھی گئی ہے جو خود محتاجِ دلیل ہے۔

الغرض یہ کتاب اہلِ ایمان کے لئے غیر ضروری ہے اور عوام الناس کیلئے بیکار۔ صرف اُن متشکین کیلئے کارآمد ہے جو اصول وتعلیمات دین کے عمدہ پیرائیہ بیان سے سنبھل سکتے ہیں۔

رسالۂ پیشوا | سید عزیز حسن صاحب بقائی نبیرہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی ادارت میں یہ ماہوار رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ جو ہر انگریزی مہینے کی آٹھویں تاریخ کو کوچہ چیلان دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا نمبر بابت ماہ فروری ۱۹۲۶ء ہمارے پاس بغرض تنقید بھیجا گیا ہے دہلی سے درویش و مولوی وغیرہ نام کے رسالے پہلے سے شائع ہو رہے ہیں اب یہ پیشوا بھی تقریباً اسی رنگ وروش پر نکلا ہے۔ مدیر رسالہ اگر مسلمانوں کی دردناک حالت پر ترس کھا کر اُن کی صحیح پیشوائی کریں تو یہ رسالہ قوم کیلئے بہت کچھ کام کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے شذرات دیکھنے کے بعد جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاتیات کے جھگڑوں کے لئے اڈیٹر اور اس کے رفقا نے آستینیں چڑھا رکھی ہیں ہمکو مشکل سے اس کی توقع ہوتی ہے۔ رسالہ کا حجم ۴۴ صفحے ہے مضامین معمولی ہیں۔ قیمت عہ سالانہ۔

شذرات

ماہ گذشتہ کا سب سے زیادہ المناک حادثہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی اچانک وفات ہے مولانا ئے موصوف اپنی قابلیت کے لحاظ سے اس عظیم الشان علمی خاندان کے ایک گرانمایہ جوہر تھے جس نے ہندوستان میں علوم عربیہ واسلامیہ کی ایک عرصہ دراز سے اشاعت کی اور جس کے فیض سے ہزاروں علما و فضلا اس ملک میں پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔

مولانا کی علمی و تعلیمی کوششیں و قومی و ملی مساعی کبھی فراموش نہیں کیجا سکتیں۔ انکو اللہ تعالیٰ نے علمی تبحّر کے ساتھ عقل و فراست بھی عطا فرمائی تھی۔ اور تدیّن و تفقہ کے ساتھ ملک و قوم کا درد بھی اُن کے سینے میں بھر دیا تھا۔ وہ علمی آدمی بھی تھے اور عملی بھی۔ اور ہادیٔ دین اور رہنمائے ملت بھی۔ قبل از وقت وفات حقیقت یہ ہے کہ تمام مسلمانان ہند کیلئے ایک ناقابل تلافی صدمہ ہے۔ کیونکہ ابھی آپ جوان تھے اور بڑی بڑی توقعات اُن سے وابستہ تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے صورت و سیرت ہر لحاظ سے اُن کی ذات کو دلکش بنا دیا تھا۔

ہم کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی ہے کہ اُن کے اودھ کے احباب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اُن کے نام سے ایک بیت العلم کھولیں جہاں سے مختلف قسم کی مفید علمی و دینی کتابیں شائع کیجائیں۔ اس غرض کیلئے پچیس ہزار روپئے کی فراہمی کی کوشش ہو رہی ہے توقع یہ ہے کہ ایسے عظیم الشان شخص کی یادگار میں یہ حقیر رقم آسانی سے فراہم ہوسکیگی۔

دارالحدیث رحمانیہ دہلی جس کی بابت ہم پہلے کئی بار اس رسالہ میں لکھ چکے ہیں جماعت

اہل حدیث کا سب سے بڑا عربی مدرسہ ہے جو دہلی کے ایک تاجر شیخ عطاء الرحمٰن اور ان
کے بھتیجے شیخ عبد الستار صاحب کی فیاضی سے چل رہا ہے۔ وسط شعبان میں اس مدرسہ
کا سالانہ جلسہ دستار بندی کا تھا۔ دوران سال میں مدرسہ میں طلباء کی کل تعداد ۹۷ تھی
جس میں سے صرف ۱۱ فیل ہوئے باقی پاس۔ نتائج کے لحاظ سے یہ سال مدرسہ کیلئے
بہت اچھا رہا۔ تین طلباء نے درس کی تکمیل کی۔ جن کی دستار بندی ہوئی۔ بقیہ کا نتیجہ
سنادیا گیا۔ اور جو انعام کے مستحق تھے ان کو انعامات دیئے گئے۔ مدرسہ بھر میں سب سے
اول جو طالب علم آیا۔ وہ نذیر احمد مبارکپوری (اعظم گڈھی) ہے جس کو علاوہ اور انعامات کے
ایک گھڑی بھی دی گئی۔

ہمکو خوشی ہوتی ہے کہ یہ مدرسہ کچھ نہ کچھ کام کر رہا ہے۔ اگرچہ مختلف اسباب سے
یہ اس قدر نفع نہیں پہونچا رہا ہے جتنا پہونچانا چاہیئے تھا۔ اور نہ ان ضروریات کو پیش نظر رکھتا ہے
جو اس وقت میں ہونی چاہئیں تھیں۔ لیکن پھر بھی ایک چشمۂ فیض ضرور ہے۔

امتحان کا جو طریقہ ہمنے اس مدرسہ میں دیکھا وہ ہمکو نہایت عجیب مگر نہایت ناقص
معلوم ہوا۔ یعنی ایک ہی شخص ساری جماعتوں اور تمام مضامین کا ممتحن تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک
ہی شخص مختلف علوم مثلاً صرف۔ نحو۔ فقہ۔ اصول۔ منطق۔ فلسفہ۔ ہیئت۔ حدیث و قرآن
ترجمہ وغیرہ سب کا امتحان لینے میں ایک بار عظیم کو اپنے سر سے ٹالیگا۔ اور صحیح توازن
جانچ کے معیار کا کبھی قایم نہ رکھ سکیگا۔ چنانچہ تمام یونیورسٹیاں اس نتیجہ پر پہونچ چکی ہیں کہ ہر
مضمون کا ممتحن جداگانہ لازمی ہے۔ ہمکو امید ہے کہ اس مدرسہ کے منتظمین دوسروں کے
تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اور اس کو تقلید نہ سمجھیں گے۔

انگلستان کا مشہور مصنف ح - ج ویلز اپنی کتاب " رہائی عالم " میں جہاں ایک نئی دنیا کا نقشہ کھینچتا ہی وہاں اس تعمیرِ نو کے لئے تعلیم کو بطورِ سنگِ بنیاد تسلیم کرتا ہی اور اس نئی دنیا کے وزیرِ تعلیم کی طرف سے اساتذہ کے نام جو اعلان شائع ہوتا ہے ہم اس میں سے ذیل کے چند فقرے نقل کرتے ہیں:-

" جو کوئی اپنی روح کی نجات چاہتا ہے وہ پہلے اسے کھو دے " اس تحریر کے سرِ عنوان پر یہ مقولہ کندہ ہے اور یہی ہمارے کام کیلئے نقطۂ افتتاحیہ ہے۔ یہ ایک سیدھا سادا بیان واقعہ ہے اور اسے کچھ اور سمجھنا غلطی ہے۔ یہی ہمارے کام کی اساس ہی۔ آپ لوگوں کو بے نفسی و بے خودی کی تعلیم دینی ہے اور جو کچھ آپ کو پڑھانا ہے وہ اسی مقصد کے ماتحت اور اس کا ممد ہے۔ تعلیم قیود نفس سے انسان کی رہائی کا نام ہے۔ آپ کو اپنے بچوں کے افقِ نظر کو وسیع کرنا، اُن کے شوق اور اُن کے تخلیقی ہیجانات کو ابھارنا اور قوی بنانا، اور اُن کی ہمدردی کو نشو ونما دینا اور وسعت بخشنا ہی۔ بس یہی آپ کی غایت وجود ہے۔ آپ کی رہنمائی میں اور اُن اثرات کے ماتحت جو آپ لوگ بچوں پر ڈالیں گے۔ ان بچوں کو جبلی شہوات جذبات اور خصومت کے آدم کو جدا کرنا اور اپنے کو پھر دوبارہ کائنات کے دائرۂ عظیم میں پانا ہی اُن کی نفسانیت کے چھوٹے چھوٹے دوائر کو یہاں تک وسعت دیتی ہے کہ یہ غایت نوعی کے دائرۂ عظیم کے اجزاء ہو جائیں۔ اور یہ جس کی تعلیم آپ اوروں کو دیں گے یہ سب نہایت کاوش سے خود آپ کو بھی سیکھنا چاہئے۔ فلسفہ، اکتشاف، فنون، ہر قسم کی ہنرمندی، ہر نوع کی خدمت، محبت: یہ ہیں اس تنگنائے آرزو سے، اس نفس اور تعلقات ذاتی پر ہمہ وقت مشغولیت سے نجات کے ذرائع جو فرد کی جہنم، نوع کی خیانت اور خدا سے مہجوری ہے "

یہی مصنف اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "تاریخ اسلام" کے ختم پر مذہب و تعلیم کے تعلق پر یوں رقمطراز ہے :-

" روحِ انفرادی و اجتماعی میں جن قوتوں نے ہمارے خونخوار، کینہ اور شخصی ہیجانات کے خلاف جہاد کر کے ان پر تسلط حاصل کیا ہے وہ مذہب اور تعلیم کی قوتیں ہیں۔ مذہب اور تعلیم کے باہمدگر مربوط اثرات ہی نے ان وسیع انسانی جماعتوں کے وجود کو ممکن بنایا جن کی نشو و نما سے (تاریخ عالم عبارت ہے) اور اس وسعت پذیر تعاون تعاونِ انسانی کی عظیم الشان داستان میں یہی جمع کرنیوالے مذہن رہے ہیں۔ ہمنے ۱۹ ویں صدی کے ذہنی اور دینی تنازعات میں تعلیم سے مذہب کی اس عجیب علیحدگی کی وجہ معلوم کی ہے جو ہمارے زمانہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور ہم نے دیکھا کہ اس مذہبی تنازع اور انتشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسیات بین الاقوام نے پھر وحشی قوم پرستی کی طرف منہ موڑا اور صنعتی اور کاروباری زندگی نے شدید خود غرضانہ اور غیر تخلیقی تلاش نفع کیطرف رجعت قہقری کی۔ ...... لیکن تعلیم و مذہب کی یہ جدائی لازماً ایک وقتی چیز ہے .... اور ہم توقع کر سکتے ہیں کہ خدمت کی عالمگیر آرزو اور قیود ذات سے رہائی جو گذشتہ ۲۵ صدیوں کے تمام بڑے مذاہب کا اصول رہی ہے۔ اور پچھلے ستر اسی سال کی مادی خوشحالی، کاہلی اور تشکک سے بین طور پر زوال پذیر ہو گئی ہے۔ پھر تمام آلائشوں سے پاک ہو کر اپنی سادہ شکل میں رونما ہوگی۔ اور اسے پھر جماعت انسانی کے بنیادی تعمیری ہیجان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائیگا۔"

ہر درسگاہ کی کامیابی کے لئے دو چیزیں سب سے زیادہ ضروری ہیں۔ آدمی اور روپیہ ہماری درسگاہ کو ان دونوں کی عرصہ سے ضرورت تھی لیکن آج ہم نہایت مسرت کے ساتھ

یہ اعلان کرتے ہیں کہ جامعہ کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی؛ ڈاکٹر عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی اور محمد مجیب صاحب بی اے آکسن نے اپنی خدمات جامعہ کے لئے پیش کی ہیں اور عنقریب تینوں حضرات اپنے اپنے شعبوں میں کام شروع کریں گے۔ ان حضرات کے جامعہ میں رہنے سے جامعہ کی ایک بڑی کمی تو پوری ہوگئی،

قیام یورپ کے زمانہ میں ان حضرات کے جو خطوط آتے رہے اُن سے نہ صرف اُن کے بلند حوصلوں اور ارادوں کا پتہ چلتا تھا بلکہ اُن سے افسردہ دلوں کی ڈھارس بھی بندھتی تھی اور وہ لوگ بھی جو جامعہ کے قیام سے ناامید ہو چکے تھے یہ سن کر کہ تینوں حضرات اپنی خدمات جامعہ کے لئے پیش کر رہے ہیں خاموش ہو جاتے تھے۔

جامعہ کی ایک بڑی ضرورت ان حضرات کے آنیسے پوری ہوگئی۔ رہی دوسری ضرورت افلاس کے لئے بھی کوئی نہ کوئی سامان ہو ہی جائیگا۔ ہمیں پوری امید ہے کہ ان تینوں حضرات کے جامعہ میں رہنے سے روپیہ کی کمی ہمیں محسوس نہ ہوگی۔ ہم تینوں حضرات کا دلی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ہم اپنے ناظرین کو یہ بھی بتا دیں کہ آیندہ مہینہ سے رسالۂ جامعہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کے زیرِ ادارت شائع ہوگا۔ موصوف کا نام نامی جامعہ کے ناظرین کے لئے تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کے مضامین اور نظمیں متعدد مرتبہ ہمارے رسالہ میں شائع ہو چکی ہیں اور اُن کا اعلیٰ معیار ہمارے ناظرین پر پوشیدہ نہ ہوگا۔

تصانیف مولانا حافظ محمد اسلم صاحب

تاریخ الامت:۔ ابتدائے اسلام کی مکمل مسلسل اور مبسوط تاریخ جو نہایت تحقیق کے ساتھ سلیس اردو میں لکھی گئی ہے۔

حصہ اول:۔ سیرۃ الرسول قیمت ۸ر

حصہ دوم:۔ خلافت راشدہ ...... عار

حصہ سوم:۔ خلافت بنی امیہ ۸ر

حصہ چہارم:۔ خلافت عباسیہ ...... عار

حصہ پنجم:۔ عباسیہ بغداد ...... عار

تاریخ القرآن:۔ ابتدائے نزول سے قرآن کریم کے آجتک کے محقق تاریخی حالات اور علمی تحقیق۔ عهر

سیرۃ عمرو بن عاص رض: مشہور صحابی فاتح مصر و طرابلس کے حالات اور اُن کے مجاہدانہ و مدبرانہ کارنامے قیمت ...... عهر

حیات حافظ:۔ خواجہ حافظ شیرازی کی دلکش سوانحعمری عهر

حیات جامی:۔ مولانا جامی کے حالات اور انکی تصانیف اور شاعری پر مفصل تبصرہ قیمت ۸ر

الوراثۃ فی الاسلام: فن وراثت میں مولانا کا بے نظیر مجتہدانہ کارنامہ عربی زبان میں قیمت ۸ر

محجوب الارث: مسئلہ ہذا کی ناقابل انکار دلائل سے تردید قیمت ۴ر

جواہر ملیہ:۔ مولانا کی ان دس بے نظیر تاریخی و ملی نظموں کا مجموعہ قیمت ۳ر

علوم ملیہ:۔ جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کے حصہ سوم کا ترجمہ جس میں مسلمانوں کی علمی ترقی کا حال ہے قیمت ...... عهر

تصانیف خواجہ عبد الحی صاحب فاروقی

شیخ التفسیر جامعہ

الخلافۃ الکبریٰ:۔ سورۂ بقرہ کی مکمل و مبسوط تفسیر ہدیہ للعہ۔ مجلد ...... صر

الصراط المستقیم:۔ سورۂ انفال و توبہ کی تفسیر۔ شروع میں جہاد پر مقدمہ۔ قیمت عار۔ مجلد ...... عهر

بیان:۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر قیمت عهر۔ مجلد ...... عهر

سبیل الرشاد:۔ سورۂ حجرات کی تفسیر

ذکریٰ:۔ تیسویں پارہ یعنی پارہ عم کی تفسیر (زیر طبع)

بصائر:۔ حضرت موسیٰ و فرعون کے واقعات قیمت ۶ر

تصانیف مولانا محمد السورتی صاحب

ادیب جامعہ

ازہار العرب: عربی کی ادبی و اخلاقی سہل نظموں کا مجموعہ۔ جامعہ کے نصاب درس میں داخل ہے ۸ر

قواعد عربی: (حصہ اول علم صرف) اس کتاب میں صرف کے تمام اشکال رفع کر دئے گئے ہیں۔ ابتک عربی صرف میں اس سے بہتر کوئی کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی عار

مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی

مطبوعہ جامعہ پریس قرول باغ دہلی

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری | ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۶	مارچ سنہ ۱۹۲۶ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

مطبع جامعہ ملیہ دھلی

جلد ۷ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۲۶ء | نمبر ۳

جمہوریت ترکیہ
کا
نظامِ اساسی
(Conslitution)

اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے میں صرف اسی امر کو کافی نہیں سمجھتا کہ ترکی جمہوریت کے قانون اساسی کا ترجمہ یہاں کردوں، بلکہ قارئین کرام کے سامنے اس مضمون کو واضح کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس قانون اساسی کا فلسفہ اور اصول بھی بیان کئے جائیں۔ نیز اس کا دنیا کے دوسرے اہم قوانین سے مقابلہ و مقائسہ بھی کیا جائے تاکہ اس کے محاسن و معائب پر بخوبی روشنی پڑ سکے۔

دنیا میں اس وقت حکومت کے دو اہم اصول رائج ہیں:-

(۱) "پارلیمنٹری" (جس کا ترجمہ ہم 'ایوانی' کرسکتے ہیں) جس پر دو قسم یا طرز کی حکومتیں قائم ہیں یعنی (الف) جمہوری جیسے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور فرانس کی حکومت ہے اور

(ب) مشروط ملوکیت (یا بالفاظ دیگر آئینی پادشاہت (Constitutional Monarchy or Limited Monarchy) جس کی بنیاد ڈالنے والے انگریز ہیں۔

اس اصول پر قایم شدہ حکومتوں کا اعلیٰ حاکم خواہ ایک رئیسِ جمہور (پریزیڈنٹ) ہو یا ایک آئینی بادشاہ ہو۔ حکومت یا حاکمیت "قوم" کی یا بالفاظ دیگر "جمہور" (People) کی مانی جاتی ہے جو جمہور کے ذریعہ اور جمہور کے فائدے کے لئے کیجاتی ہے۔ جمہور ایک اپنا ایوان (پارلیمنٹ) بنالیتے ہیں جس میں مختلف سیاسی نظریے اور عقیدے رکھنے والے فریق (پارٹی) اپنے نمائندے بھیجتے ہیں۔ قوت عاملہ (Executive power) جس کو ہم قوتِ اجرائیہ بھی کہتے ہیں کابینہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس کا صدر یعنی وزیر اعظم، رئیس جمہور یا آئینی بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے اور عموماً ایوان میں اکثریت رکھنے والے سیاسی فریق کا سرگروہ (لیڈر) ہوا کرتا ہے۔ کابینہ، ایوان کے روبرو عموماً مشترک طور پر ذمہ دار ہوتی ہے یعنی ایک وزیر کی حکمتِ عملی (پالیسی) پر بھی اگر اکثریت ایوان کو اعتماد نہ رہے تو ساری کابینہ مستعفی ہوجانے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ مگر جماہیر امریکہ میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہے۔ وزرا، رئیس جمہور کے معتمد (سکریٹری) ہیں اور اسی کے روبرو فرداً فرداً مسئول و ذمہ دار ہیں۔ ایوان عموماً ایک سال سے زیادہ عرصہ کے لئے منتخب ہوتا ہے اور ارکین ایوان کو ان کے منتخب کرنے والے ایوان کی حق رکنیت سے کسی صورت میں بھی محروم نہیں کرسکتے۔ خواہ وہ اپنے مواعید انتخاب کو پورا کرنے کی کوشش کریں یا نہ کریں، وہ ایوان مذکور کے مین حیات میں اس کے رکن رہیں گے ارکین ایوان کا انتخاب گو عمومی حق رائے پر مبنی ہوتا ہے مگر طریق انتخاب ایسا ہے کہ آبادی کی مختلف صنفوں (یعنی دہقانوں، مزدوروں، زمینداروں، تاجروں، کارخانہ داروں، اور ساہوکاروں) کو ان کی تعداد آبادی کے تناسب حق نیابت ملنے اور محنت کش صنف

(یعنی دہقانوں، مزدور اور غریب تعلیم یافتہ لوگوں، کو جن کی آبادی میں اکثریت ہے، نمایندگی میں اکثریت حاصل ہونے کی بجائے، عموماً مالدار صنفوں ہی کی ایوان میں اکثریت رہتی ہے طریقۂ انتخاب کی اس خرابی کی وجہ، اصول ایوانی (پارلیمنٹری اصول) کا وہ بنیادی نظریہ ہے جس کو ہم "حق ملکیت شخصی" کا نام دیسکتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ہر شخص کو اپنی ذاتی ملکیت کے غیر محدود طور پر بڑھانے کی آزادی حاصل ہے اس آزادی کی وجہ سے سوسائٹی (ہیئت اجتماعیہ) میں ایک قسم لوگوں کی ایسی پیدا ہو گئی ہے جو نہایت ہی مالدار ہے مثلاً زمیندار، کارخانہ دار تاجر اور ساہوکار، اور دوسری قسم ایسی بن گئی ہے جو بہت غریب ہے۔ مثلاً دہقان، مزدور اور غریب منشی۔ معلم اور دیگر مفلوک الحال تعلیمیافتہ افراد۔ مالداروں کو اتنا رسوخ حاصل ہوتا ہے کہ غریب خواہ مخواہ اُن کے لئے رائے دیتے ہیں اور انھی کو اپنی طرف سے ایوان کا رکن چنتے ہیں مثلاً مزارع اور کسان اپنے زمیندار کو، مزدور اپنے آجر اور کارخانہ دار کو، قرضدار اپنے قرضخواہ اور ساہوکار کو۔ اسی وجہ سے ایوانی حکومت کو مالداروں کی حکومت (Burgeois Govt) کہا جاتا ہے اور اس کے زریں مقولات مثلاً "حریت"۔ "مساوات"۔ "انصاف"۔ "اخوت" وغیرہ کو عملاً ایک ڈھکوسلے سے زیادہ وقعت نہیں دیجاتی۔ ایوانِ حکومت میں "مذہب کو سیاست سے جدا کر دیا گیا ہے"، یعنی حکومت کا قانون بنانے والے نظریتہً مذہبی احکام سے ملہم نہیں ہوتے نظریتہً یہ ضروری نہیں کہ ان کے قوانینِ ملکی اُن کے احکام دینی کے ضرور مطابق ہوں اور احکام الٰہی کو اپنا منبع و مرجع قرار دیں۔

(۲) اب اس کے مقابل اور اس کی بالکل ضد لیجیئے جس کو اصول سویٹ Soviet کہا جاتا ہے اور جس کا ترجمہ ہم "پنچائتی" حکومت کر سکتے ہیں (اگرچہ لفظ "پنچائت" جو عام طور پر ہمارے ملک میں استعمال ہوتا ہے اس مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔ مگر مطلب سمجھانے

کے لئے کافی موزوں ہے) اس اصول پر موجودہ روس کی حکومت متشکل ہے

اِس اصول کی حکومت میں ایوانی حکومت کا بنیادی نظریہ یعنی شخصی ملکیت جمع کرنے اور بڑھانے کا لا محدود حق" اڑا دیا گیا ہے، کیونکہ سوویٹ اصول کے حامی "حق ملکیت" ہی کو مالداروں کی فوقیت اور باقی اصناف کی مغلوبیت کا باعث مانتے ہیں چنانچہ روس کی سوویٹ حکومت میں دراصل قانونی طور پر کوئی شخص ایسی شخصی ملکیت نہیں رکھ سکتا جس کے ذریعہ وہ دوسرے کے ثمرِ محنت کو اپنے قبضہ میں لے سکے۔ مثلاً زمین سوائے سوسائٹی (ہیئت اجتماعیہ) اور اس کی نمائندہ حکومت کے اور کسی کی ملکیت نہیں ہے: اسی طرح بڑے کارخانے اور بنک کا سرمایہ اور بڑے بڑے گھر، ہوٹل وغیرہ کو جو کرایہ پر دئے جا سکتے ہیں سب قوم کی اور حکومت کی ملکیت ہیں۔ پرانی حکومت کے ماتحت جائدادیں اور دولت کے رکھنے والوں کو اب تمام سیاسی اور نیابتی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے! تاکہ وہ دوبارہ حکومت، دولت اور ذرائع پیداوار پر قبضہ ہی نہ کر سکیں۔ قصہ مختصر سوویٹ اصول پر جو حکومت آج قایم ہے اس میں سوائے صنعتی مزدوروں اور ایک حد تک کسانوں اور غریب تعلیمیافتہ لوگوں کے اور کسی کو حقِ نمایندگی حاصل نہیں ہے۔ یہ حکومت اصل میں تو فقط مزدوروں کی حاکمیت مطلقہ (Dictatorship of the Proletariat) ہے جس میں مزدوروں کو ان کی تعداد آبادی سے بھی زیادہ حق نیابت ملا ہوا ہے۔ مگر ضرورت اور مصلحت کی وجہ سے کسانوں اور غریب تعلیمیافتہ لوگوں کے اشتراکِ عمل پر مبنی اور قایم ہے۔

روسی سوویٹ جو ایوانی حکومت کے زیرین ایوان (Lower House) کے ہم پلہ ہے۔ مزدوروں، کسانوں، سپاہیوں اور غریب تعلیمیافتہ لوگوں کے نمایندوں پر مشتمل ہے

ایوانی حکومت اور سوویٹ حکومت میں عملاً بڑے فرق یہ ہیں:۔

(الف) سوویٹ اپنی ہیئت اجرائیہ اور کابینہ خود منتخب کرتی ہے۔ رئیس جمہور ہیئتِ اجرائیہ کا صدر ہوتا ہے اور کابینہ اس کی ہیئتِ اجرائیہ (Executive Body) کے احکام کی نافذ کرنے والی جماعت ہے۔

(ب) سوویٹ فقط ایک سال کے لئے منتخب ہوتی ہے۔ منتخب کرنے والوں کو حق ہے کہ اسی سال کے دوران میں اگر اپنے نمایندوں کو سہل الکار یا خلاف وعدہ پائیں تو ان کو سوویٹ کی رکنیت کے حق سے محروم کر کے اُن کی جگہ نئے اور زیادہ اہلیت رکھنے والے نمایندے بھیج دیں

(ج) سوویٹ میں فقط ایک سیاسی فریق یعنی کومیونسٹ پارٹی ہے باقی پارٹیوں کو حقِ حیات حاصل نہیں ہے کیونکہ (جیساکہ کومیونسٹ یعنی اشتمالی لوگ کہتے ہیں) سوویٹ میں فقط ایک ہی صنف یعنی صنف محنت کش کو حق نمایندگی حاصل ہے اس لئے فقط اسی صنف کی پارٹی کو واحد حق نیابت ہونا چاہئے؛ اگر باقی صنف بھی سوویٹ میں ہوتے تو بیشک دوسری پارٹیاں بھی قایم ہوسکتی تھیں۔ سوویٹ میں دوسرے صنف آ ہی نہیں سکتے کیونکہ ملک میں اُن کا وجود معدوم کر دیا گیا ہے اور "حق ملکیت" کا نظریہ جو صنفوں کو پیدا کرتا ہے، سوویٹ کی حکومت میں پہنچنے نہیں دیا جا سکتا۔ اس طرح پر صرف کومیونسٹ پارٹی سارے ملک کی رہنما اور ساری حکومتِ روس پر حاوی ہے۔

(د) سوویٹ حکومت میں نہ صرف ایرانی حکومت کی طرح مذہب کو سیاست سے جدا کیا گیا ہے بلکہ مذہبی تعلیم پر بہت سی قیود عائد ہیں۔ کیونکہ اول تو مذہب کے مقتداؤں اور ہادیوں نے پرانے نظام یعنی نظامِ سرمایہ داری کی حمایت کی اور روس میں مزدوروں کی حکومت کے قیام کی مخالفت کی اور دوسرے کومیونسٹ پارٹی کے فلسفہ کے مطابق جو مادہ پرستی پر مبنی ہے مذہب کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔

ترکی انقلاب کے رہنما جنھوں نے سلطنت اور خلافت کی جگہ جمہوریت کی بنیاد ڈالی ہے، ۱۷۹۰ء کے انقلاب عظیم فرانس کو اپنا فکری رہنما (Ideological leader) مانتے ہیں۔ ترکی جمہوریت نظریتہً "ایوانی اصول" پر قایم ہے اور جمہوریۂ فرانس کی مقلد ہے، (گو ترکیب حکومت کے لحاظ سے بعض تفصیلات میں جمہوریۂ فرانس سے مختلف ہے جس کا بیان ہم ترکی حکومت کا اساسی نظام لکھتے ہوئے وضاحت سے کریں گے)، مگر عملی طور پر سوویٹ حکومت کی کئی ایک باتیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہاں بھی روس کی طرح ایک سیاسی فریق کی ضرورت ہے جس کو "خلق فرقہ" (Peoples Party) کہا جاتا ہے۔ خواہ یہ امر عارضی ہی ہو۔ مگر اس وقت ترکی "مجلس ملیہ" میں کسی دوسرے فریق کا وجود ممکن نہیں ہے۔ ہاں جیسے سوویٹ میں غیر کومیونسٹ اراکین ہوتے ہیں۔ مگر اپنی پارٹی نہیں بنا سکتے اسی طرح ترکی "مجلس ملیہ" میں بھی بعض ایسے ممبر ہیں جو "خلق فرقہ" سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ مستقل الافکار (Independent) یا مسدود (Suppressed) "ترقی پرور فرقہ" (Progressive Party) کے ممبر ہیں (۲) جس طرح روسی گورنمنٹ کا تمام روسی خارجی تجارت پر اجارہ اور گورنمنٹ کے سوا کوئی بھی بیرونی تجارت نہیں کر سکتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی اس اجارے کی ایک معتدل صورت موجود ہے مثال کے طور پر مٹی کا تیل، شکر، اسپرٹ کی تجارت اس سال سے سرکاری اجارے میں آجائے گی؛ تمباکو کی تجارت اور سگرٹوں کی صنعت سوائے سرکار کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی کرنا چاہے تو اجازت نامہ (لائیسنس) لے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ، "ایوانی حکومت" کا بنیادی نظریہ یعنی "شخصی ملکیت رکھنے اور حاصل کرنے کا لامحدود حق" پوری طرح جاری ہے؛ "اور ہر شخص کا مال محفوظ و مصؤن ہے"

(دفعہ "۷۰" ترکیہ جمہوریت کا قانون اساسی)

ترکی جمہوریت کا قانون اساسی ترکی رعایا کو آزادیِ تقریر، آزادی تحریر، آزادیِ اجتماع، معنونیتِ مسکن وغیرہ کے لحاظ سے ایسی ہی حقوق عطا کرتا ہے جیسے کہ دنیا کی کوئی متمدن ترین گورنمنٹ آج اپنی رعایا کو دے رہی ہے۔ آج کسی یوروپین معترض اور حامیِ حریت کو یہ اعتراض کرنے کی مجال نہیں ہے کہ ترکی قانون میں استبداد کو کوئی دخل ہے یا ترکی قانون نے شخصی آزادی، حریتِ فکری اور حریتِ سعی وعمل پر قیود عاید کر رکھی ہیں۔ ترکی کی "تشکیلات اساسیہ" میں سے "حقوق عامہ" کے متعلق دفعات پڑھ لینے کے بعد یوروپین معترضین کا وہ پرانا ڈھکوسلہ جس کی بنا پر وہ ترکی کے امورِ داخلیہ وخارجیہ میں ہمیشہ دخل اندازی کرتے رہتے تھے خس وخاشاک کی طرح اڑ جاتا ہے۔ ان دفعات کا ضروری خلاصہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

نہ صرف یہی، بلکہ بعض باتوں میں ترکی قانون اساسی نے "حاکمیت ملیہ" کو ایسی مستحکم بنیادوں پر قائم کیا ہے جو یوروپ کے کسی اور ملک میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً دفعہ ۲۵ کا مفہوم یہ ہے کہ رئیس جمہور بھی ایوان (یعنی ترکی مجلسِ ملیہ) کو فسخ نہیں کر سکتا؛ اور نہ کوئی ایسی طاقت ملک میں ہے جو کسی وقت بھی مجلسِ ملیہ کو منسوخ کر سکے۔ ہاں ضرورت کے وقت یا خود دورۂ انتخاب کے ختم ہونے پر مجلس اپنی اکثریت مطلقہ کے ذریعے اپنے کو برخاست کر سکتی ہے، جس کے فوراً بعد ہی نئے انتخابات شروع ہو جائیں گے۔ حکومت کے اعلیٰ افسر کے اختیارات اس حد تک کسی ملک میں بھی محدود نہیں کئے گئے ہیں، اور کسی دوسرے ملک میں پارلیمنٹ کو یہ اقتدار حاصل نہیں ہے جو ترکی پارلیمنٹ کو ہے۔

ان امور کو واضح کرنے کی خاطر، اب ہم ترکی جمہوریت کے نظام اساسی میں سے ضروری دفعات نقل کئے دیتے ہیں تاکہ قارئین بذاتِ خود ایک فیصلہ پر پہونچ سکیں

پہلی فصل

احکام اساسیہ

(دفعہ اول) ترکی حکومت ایک جمہوری حکومت ہے۔

اس دفعہ کے بدلنے کا کسی شخص یا جماعت کو اختیار نہیں دیا گیا ہے حتیٰ کہ مجلس عالیہ ملیہ بھی جو باقی تمام نظامِ اساسی کو تبدیل کر سکتی ہے۔ اِس دفعہ کو نہیں بدل سکتی۔ (دفعہ ۱۰۲)

باقی دفعات کے تغیر و تبدل اور ترمیم کے لئے مندرجہ ذیل اصول رکھا گیا ہے:۔

"قانون اساسی کی ترمیمات" مجلسِ عالیہ ملیہ کے جملہ اراکین میں سے (جن کی تعداد ۲۵۰ ہے) ایک ثلث اراکین کی طرف سے تجویز ہونی چاہئیں اور مجلس میں جملہ اراکین کی دو ثلث اکثریت کے ساتھ منظور ہونی چاہئیں۔ اگر شرائط پوری نہ ہوسکیں تو کسی قسم کی ترمیم یا تغییر عمل میں نہیں آسکتا" (دفعہ ۱۰۲)

(دفعہ ۲) میں مذکور ہے کہ "حکومتِ ترکیہ کا مذہب اسلام ہے اور سرکاری زبان ترکی ہے" ایرانی حکومت کی طرح ترکی جمہوریت نے بھی مذہب کو سیاست سے جدا کر دیا ہے اگرچہ خود قانونِ اساسی میں اُس کے متعلق کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔ اِس علیحدگی کے ثبوت میں یہ امر پیش کرنا کافی ہے کہ اب قانونِ فقہ کے بجائے، سوئٹزرلینڈ کے قانون کو ترکی حالات کے مطابق ڈھال کر جمہوریتِ ترکیہ کا قانون دیوانی (Civil Law) قرار دیدیا جائیگا۔

۔ ملک کی حکومت بلا قید و شرط، قوم کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ ترکی مجلسِ ملیہ، قوم کی یگانہ نمائندہ ہے۔ اور قوم کی طرف سے اِس حقِ حکومت کے استعمال کرنے کی مجاز ہے۔ آئین سازی اور اجراے قوانین کی صلاحیت فقط اِس مجلس کو حاصل ہے۔ اجرائے قوانین کا اختیار یہ مجلس

"رئیس جمہور" کے ذریعے سے جس کو خود مجلس مذکور انتخاب کیا کرے گی، اور کابینہ کے ذریعہ سے جس کو رئیس جمہور تعین کریگا۔ استعمال میں لائیگی۔ عدالتی اختیارات کو حکام عدالت قانون کے مطابق اور قوم کے نام سے استعمال کیا کریں گے" (دفعات ۳۔ ۸)

دوسری فصل
قواعد قانون سازی
(Rules of Legislation)

"ہر عاقل، بالغ (۱۸ سال سے اوپر عمر رکھنے والا) مرد "ترک" جو کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں سزایاب نہوا ہو اور کسی اجنبی کی خدمت میں ملازم نہ ہو مجلس ملی کے اراکین (یعنی مبعوث) انتخاب کرلے کا حق رکھتا ہے" (دفعہ ۱۰ و ۱۲)

"ہر ترک" مرد جو تیس سال سے اوپر عمر رکھتا ہو مجلس ملی کا رکن (مبعوث) انتخاب کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ترکی لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ مجلس کی رکنیت اور سرکاری ملازمت ایک ہی شخص میں جمع نہیں ہو سکتی" (دفعہ ۱۱ و ۲۳)

عورتوں کو ترکی میں حق رائے حاصل نہیں ہے۔ اس کے لئے عورتوں کی انجمن جد و جہد میں مصروف ہے؛ مگر کامیابی کی امید فی الحال بہت کم ہے۔

"ترک" کی تعریف قانونِ اساسی میں یوں کی گئی ہے:۔

"ترکیہ کا ہر باشندہ بلا تفریق مذہب و نسل "ترک" کہلاتا ہے"۔ "ایک ترک باپ کی اولاد جو ترکی حدود سے باہر پیدا ہو "ترک" ہے۔ ایک اجنبی باپ کی اولاد جو "ترک" عورت کے پیٹ سے پیدا ہو اور ترکی میں سن بلوغت کو پہونچے "ترک" ہے۔ ہر شخص جو ترکی تابعیت

اختیار کرے یعنی ترکی رعایا بجائے "ترک" ہے (دفعہ ۸۸)

ترکی غیر مسلم آبادی اب اتنی کم ہے اور ایسی منتشر صورت میں آباد ہے کہ مندرجہ بالا حقوق کے باوجود بھی جو غیر مسلم کو بھی حق رائے اور حق رکنیت مجلس دیتے ہیں، کوئی غیر مسلم مجلس ملی میں مبعوث نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ترکی فوج میں کوئی غیر مسلم افسر نہیں بن سکتا ہاں محض سپاہی کی حیثیت سے خدمت کر سکتا ہے۔

"مجلس ملی کے انتخابات چار سال میں ایک مرتبہ اجرا ہوں گے" (دفعہ ۱۳) رئیس جمہور چار سال کے لئے مجلس کے اعضا میں سے منتخب ہوتا ہے۔ انتخاب میں ایک یہ بڑا نقص ہے کہ ایک رئیس جمہور اپنے کو دوبارہ آسانی سے رئیس منتخب کرا سکتا ہے۔ کیونکہ جو مجلس اس کو رئیس جمہور انتخاب کریگی وہ تو خواہ مخواہ ہی اس کو قابلِ اعتماد پائیگی۔ لیکن جب دوسری مجلس ملی بھی اسی رئیس کے زمانہ ریاست میں انتخاب کیجائے تو بہت ممکن ہے کہ فقط انھی لوگوں کا انتخاب مجلسِ مذکور کی رکنیت کے لئے عمل میں آسکے جو رئیس مذکور کو دوبارہ (دو سال) کے بعد رئیس انتخاب کرنے کو آمادہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ قانوناً اس قسم کی بیجا حرکت کو روکنے کی گنجائش موجود ہے اور وہ اس طرح کہ اگر قوم رئیس جمہور سے ناراض ہو تو اس کو آئندہ مجلس کا رکن انتخاب نہ کرے اور جب وہ رکن کے طور پر انتخاب نہ ہو سکے گا تو رئیسِ جمہور بھی نہ بن سکے گا، کیونکہ رئیس فقط مبعوثوں میں سے انتخاب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی قانونی رکاوٹوں کو ایک ایسے آدمی کے لئے جو برسر اقتدار ہو اپنے اثر اور رسوخ کے ذریعہ اپنے حق میں بے ضرر بنا لینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب اس کو حکومت کے، اقتدار، جاہ اور حشمت کا ایک دفعہ تجربہ ہو گیا اور چسکا لگ گیا تو بہت کم ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ صاحب اختیار ہستی ایک سچی قربانی اور حقیقی ایثار کی مثال قائم کرے اور ان اختیارات سے بہ آسانی دست بردار ہو جائے۔

اس امر کے ساتھ ساتھ ترکی مجلس ملی کے طرز انتخاب میں ایک اور عجیب بات نظر آتی ہے جو "عمومی حق رائے" کے قانون کو بہت کچھ کمزور اور بے اثر بنا دیتی ہے۔ جس وقت مجلس ملی کے عمومی انتخابات عمل میں آتے ہیں تو ایک ممبری کے لئے صرف ایک امیدوار منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ پہلے پانچ چھ یا سات شخص جنہوں نے زیادہ رائے حاصل کی ہوں انتخاب کر لئے جاتے ہیں اور ان کو "منتخب ثانی" کہا جاتا ہے۔ یہ "منتخب ثانی" اپنے میں سے ایک شخص کو بطور رکن مجلس (یعنی مبعوث) چن لیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر یہی جگہ مجلس کے دورۂ انتخابیہ کے زمانے میں (یعنی چار سال کے اندر اندر) مبعوث مذکور کی موت، یا کوئی سرکاری عہدہ جیسے سفارت وغیرہ قبول کر لینے کی وجہ سے خالی ہو گئی، تو ترکی قانون کے مطابق اس جگہ کے لئے نیا انتخاب عام رائے دہندوں کی طرف سے عمل میں نہ آئیگا بلکہ وہی باقی ماندہ "منتخب ثانی" جنہوں نے اپنے میں سے پہلے مبعوث کو چنا تھا پھر اپنے ہی میں سے ایک اور مبعوث انتخاب کر کے خالی شدہ آسامی کو پر کر دیں گے۔

اس طرز انتخاب کے نقائص عیاں ہیں۔ اگرچہ یہ طریقہ قوم کو عمل انتخاب کے اخراجات اور تضییع اوقات سے بچا دیتا ہے۔ "مسدود" "ترقی پرور" پارٹی اس طرز انتخاب کی مخالف تھی۔

"سال بھر میں سے مجلس ملی کے اجلاس کی مدت چھ ماہ ہے؛ سال کے باقی چھ ماہ مجلس مذکور چھٹی مناتی ہے۔ ایام تعطیل میں مبعوث ملک بھر میں دورہ کرتے ہیں کیونکہ وہ نہ صرف اپنے حلقۂ انتخابیہ کے نمائندے ہیں بلکہ تمام قوم اور ملک کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں (دفعات ۱۲ و ۱۴)

قارئین کو مندرجہ بالا دفعات کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیگا کہ ترکی مجلس ملی میں بھی وہی نقص موجود ہے جو باقی دنیا کی پارلیمنٹوں میں ہے یعنی کہ طبقہ محنت کش اپنی تعداد کے مطابق نمائندے نہیں بھیج سکتا۔ مثلاً ترکی ایک زراعتی ملک ہے؛ زراعتی آبادی کو اکثریت قاہرہ

حاصل ہے۔ مگر مجلس میں زراعتی آبادی کے نمائندے بہت تھوڑے ہیں، اگرچہ قانوناً ایسی کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے جو زراعتی آبادی کے نمائندوں کی اکثریت کے مانع ہو۔ یہ خرابی طریقۂ انتخاب کی ہے۔ اسی لئے ترکی میں ایک ایسی تحریک پیدا ہو رہی ہے جو مخلوط انتخاب کے بجائے صنف وار اور بلحاظ پیشہ، انتخابات کی حامی ہے تاکہ ہر صنف کو اپنی تعداد آبادی کے مطابق حق نیابت مل سکے۔

تیسری فصل

جماعت عاملہ (قوت اجرائیہ)

(Executive Body)

"دولت ترکیہ کی جماعتِ عاملہ کا اعلیٰ افسر "رئیس جمہور" ہے جس کو مجلسِ ملّی کے اراکین اپنے زمرے میں سے انتخاب کرتے ہیں۔ رئیس جمہور، خاص اہم اور موقع کے وقت مجلس ملی اور کابینہ کا صدر ہو سکتا ہے۔ مگر مجلس کے مباحث میں نہ تو حصہ ہی لے سکتا ہے اور نہ رائے ہی دے سکتا ہے (دفعات ۳۲ و ۳۳)

" جو قوانین مجلس کی طرف سے منظور ہو چکے ہوں، ان کو رئیس جمہور ۱۰ دن کے اندر اندر اعلان و اجرا کرنے پر مجبور ہے۔ اگر رئیسِ جمہور ضروری و مناسب سمجھے تو قوانین مذکور کو ایک دفعہ پھر مجلس میں نظر ثانی کے لئے بھیج سکتا ہے۔ لیکن قانون اساسی اور میزانیہ (بجٹ) اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی ان دو امور کے بارے میں رئیسِ جمہور کو مندرجہ بالا "حق تردید" (veto) حاصل نہیں ہے۔ اگر نظر ثانی کے لئے بھیجے ہوئے قوانین کو مجلس دوبارہ منظور کر دے تو رئیس جمہور ان کے اجراء پر مجبور ہے"۔ (دفعہ ۳۵)

جس وقت مجلسِ ملی انگورہ نے تین سال قبل قوانینِ اساسی بنانے شروع کئے تھے تو اس دفعہ پر جو رئیسِ جمہور کے "حق تردید" کے متعلق ہے، بہت بحث و مباحثہ عمل میں آیا تھا بعض ممبر یہ چاہتے تھے کہ رئیس جمہور کو کامل "حق تردید" حاصل ہونا چاہئے مگر ان کی کچھ زیادہ پیش نہ گئی اور وہ باقی ممبروں کے ساتھ جو رئیسِ جمہور کو "حقِ تردید" سے بالکل محروم کرنا چاہتے تھے ایک سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئے۔ اگر "حق تردید" کے حامی مجلس میں اکثریت حاصل کر لیتے تو "حاکمیتِ ملیہ" برائے نام رہجاتی اور اصل میں وہی شخصی حکومت ایک نئے لباس میں جلوہ گر رہتی۔

"ترکی افواج کی کمان مجلسِ عالیہ ملیہ کے ہاتھ میں ہے اور رئیس جمہور مجلس کا اس بارے میں ممثل ہے۔ زمانہ حرب میں رئیس جمہور کابینہ کی سفارش پر سپہ سالار مقرر کریگا اور ایام صلح و امن میں ارکان حربیہ کا رئیس عمومی افواج ملکی کا افسرِ اعلیٰ ہوگا" دفعہ (۴۰)

"وزیر اعظم کو رئیس جمہور اعضائے مجلس میں سے مقرر کرتا ہے۔ وزیر اعظم اپنے وزراء مبعوثوں میں سے مقرر کرکے اپنی کابینہ کی رئیسِ جمہور اور مجلس سے تصدیق کراتا ہے کابینہ مشترکاً مجلس کے سامنے مسئول اور جواب دہ ہے مگر ہر وزیر اپنے اپنے صیغہ کے بارے میں شخصی طور پر ذمہ وار ہے۔ ایک وزیر دو وزارتوں سے زیادہ کے قلمدان قبول نہیں کر سکتا مسودۂ قوانین، عہدنامہ جات اور امتیازات وغیرہ کی تحقیق کرنے کے لئے متخصصین، ماہرین اور ارباب علم کی ایک جماعت جس کو "شوریٰ دولت" کہتے ہیں مجلس ملی کے ذریعہ انتخاب کیجائیگی، جو مجلس میں پیش ہونے والے قوانین اور معاہدوں وغیرہ کی تفتیش کرکے ان کی صحت کے بارے میں اظہار رائے کیا کریگی۔

"نئے قوانین کے مسودے مجلس کے اعضا کی طرف سے یا کابینہ کی طرف سے

مجلس میں بحث اور منظوری کے لئے تجویز ہوا کریں گے (دفعات ۴۴، ۴۶، ۴۹ و ۵۱)

اگرچہ مندرجہ بالا دفعات سے معلوم ہوگا کہ کابینہ مجلس ملی کے قبضہ اقتدار میں ہے لیکن چونکہ مجلس میں "خلق فرقہ" کو اکثریت قاہرہ حاصل ہے، اس لئے اگر کابینہ "خلقِ فرقہ" کے جلسہ میں اکثریت کو کھو بیٹھے تو مجلس میں اس کو اکثریت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور وہ اس لیے استعفا دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ موجودہ کابینہ سے پہلے فتحی بے کا بینہ نے "خلق فرقہ" کے جلسہ میں شکست کھاتے ہی، اپنا استعفا رئیس جمہور کو پیش کر دیا تھا۔ اور اِس امر کا بھی انتظار نہ کیا تھا کہ مجلس کے سامنے معاملات کی تشریح کر کے استعفا دے کیونکہ فتحی بے کو معلوم تھا کہ فرقہ کی اکثریت کھو بیٹھنے کے بعد اس کو مجلس میں "رائے اعتماد" کا ملنا ناممکن ہے۔

چوتھی فصل

قوانینِ عدالت

اِن قوانین میں سب سے اہم (دفعہ ۵۴) ہے جس میں مذکور ہے کہ "حکام عدالت اپنے کام میں مستقل اور ہر قسم کی مداخلت سے مامون اور صرف قانون کے تابع ہیں۔ ان کے قانونی فیصلوں کو نہ مجلس ملی اور نہ کابینہ تغیر و تبدیل کر سکتی ہے اور نہ اُن کے نفاذ میں تاخیر کیجا سکتی ہے"

پانچویں فصل

ترکی رعایا کے حقوق عامہ

دفعہ ۶۸۔ "ہر ترک، آزاد پیدا ہوتا ہے اور آزاد زندگی بسر کرتا ہے" ترکی قانون کا

صرف ایک یہی جملہ ساری ترکی قوم میں آزادی کی روح پھونکنے اور ہر ترک بچے کو اپنی شخصی آزادی اور اپنے وطن کی حریت و استقلال پر جان فدا کرنے کا سبق دینے کے لئے کافی ہو۔ آہ محکوم ہندوستان! جس کی فضا میں آزادی کا نام لینا جرم اور جس کے قوانین میں اس قسم کی دفعہ کا آنا بھی "خیانت اور غداری" سمجھا جاتا ہے!!!

دفعہ ۶۹۔ "قانون کی نظر میں سب ترک مساوی ہیں۔ کوئی فرد، صنف، زمرہ یا گروہ (یعنی افراد) اصناف وغیرہ سے برتر اور ورائے فوقیت نہیں ہے۔ تمام قسم کے امتیازات، اعزاز وغیرہ ممنوع اور منسوخ قرار دئے جاتے ہیں"

دفعہ ۷۵۔ "کوئی شخص اپنے دین، طریقت، فلسفہ اجتہاد وغیرہ کی وجہ سے قابل مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک اس کے یہ عقاید امن عامہ اور آداب معاشرت کے مغائر ہوں"

دفعہ ۷۱۔ "بغیر قانونی اجازت کے کوئی کسی کے مسکن میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کسی کے مسکن کی غیر قانونی طور پر تلاشی لی جا سکتی ہے"۔

دفعہ ۷۷۔ "قانون کے دائرہ میں سب مطبوعات آزاد ہیں۔ کسی قسم کا سنسر شپ اور احتساب نہیں ہے"

دفعہ ۸۰ و ۸۱۔ "حکومت کی نگرانی میں ہر قسم کی تعلیم آزاد ہے۔ ڈاک، تار، ٹیلیفون وغیرہ پر بھی کوئی سنسر نہیں ہے"

دفعہ ۸۶۔ "کابینہ، وطن اور جمہوریت کو خطرے کی صورت میں پانے پر ایک ماہ کے لئے مارشل لا (فوجی قانون) کا اعلان کر سکتی ہے۔ مگر اس کی تصدیق فوراً مجلس ملی سے کرا لینے پر مجبور ہے۔ مجلس اس مدت یک ماہ کو کم و بیش کر سکتی ہے۔ مارشل لا کے زمانہ میں مسکن کی معصومیت، آزادیٔ تقریر، تحریر، اجتماع و مخابرہ پر قیود عائد کر دی جائیں گی"۔

دفعہ ۸۰ ۔ "ابتدائی تعلیم سب ترکوں کے لئے مفت اور لازمی قرار دیجاتی ہے"
حکومت ترکی باوجود اپنے ذرائع آمدنی کی کمی کے اپنی رعایا کے لئے ابتدائی تعلیم کو جبری اور مفت قرار دیتی ہے مگر ہندوستان کی مشفق اور مہربان گورنمنٹ ہندوستان جیسے زرخیز اور معمور ملک کے خزانے کی مالک ہوتے ہوئے بھی اس قسم کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتی!!! اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ترکی حکومت اور ترکی قوم دو چیزیں نہیں ہیں بلکہ ترکی حکومت اپنی حفاظت اور مضبوطی کو اس پر موقوف جانتی ہے کہ ترکی قوم تعلیم یافتہ ہو، اپنے ماضی و مستقبل سے باخبر ہو کاروبار کو سمجھنے کے قابل ہو۔ مگر موجودہ ہندوستانی گورنمنٹ اور ہندوستانی قوم کے مغائر عنصر ہیں، ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہے؛ اس لئے ہندوستانیوں کو تعلیم سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

آخر میں بیجا نہ ہوگا اگر ہم بعض ضروری باتوں میں ان تینوں (یعنی ایرانی، سوویٹ اور ترکی) قوانین اساسیہ کا اسلامی قانونِ حکومت سے مقابلہ کریں۔
جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ایرانی حکومت میں "شخصی ملکیت" کا قانون پوری طرح جاری ہے اور اس کی دعاوی مساوات و حریت، تہذیب و اخلاق ایک ریاکارانہ نقاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ دوسری اقوام پر تغلب جمانا اور ان کے ممالک کو اپنی مصنوعات کی کھپت کے لئے منڈیوں کے طور پر اپنے ہاتھ میں رکھنا ان حکومتوں کا مقصد ہے یہ حکومتیں اصل میں سرمایہ داروں صنعت کے ہاتھ میں ہیں۔
سوویٹ طرز حکومت، اس کے برخلاف تفریط کے درجہ پر قائم ہے وہاں صرف صنعتی مزدوروں کی "حاکمیت مطلقہ" ہے (خواہ یہ اشتراکیت کے ابتدائی درجہ اور پہلی منزل ہی کے طور پر ہو)

دہقانوں کے اتنے بڑے گروہ کو جو زندگی کی سب سے ضروری چیز کو ہم پہنچانے میں مصروف ہے، اور جس کو دنیا کی آبادی میں اکثریت حاصل ہے اس حاکمیت مطلقہ میں اصولاً کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ ضرورت کے لئے سوویٹ گورنمنٹ نے اس وقت دہقانوں کو کچھ نیابت دے رکھی ہے۔ مگر اس کو دہقان کافی نہیں سمجھتے اس لئے ان میں بے چینی پائی جاتی ہے وہ پوچھتے ہیں " ہم کو بھی صنعتی مزدوروں کی طرح اپنی سیاسی پارٹی بنانے کی اجازت کیوں نہیں ملتی"؟ " شخصی ملکیت" کو بالکل اڑا دینے سے سوویٹ گورنمنٹ نے دیکھ لیا کہ جب تک بنی نوع انسان کی یہ ذہنیت (Mentality) ہے کہ اپنے شخصی فائدے کی طمع کے بغیر انسان عام طور پر کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ اس وقت تک شخصی ملکیت کا اڑا دینا قابل عمل نہیں ہے اس لئے اس اشتمالی قانون کو چھوڑ کر اس کی جگہ " شخصی ملکیت " کا ایک درجہ عملاً قبول کیا گیا۔ ہمیں یہاں اس قسم کی تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، کہ ملکیت کا یہ درجہ کیا اثر دکھا رہا ہے، یا کہاں تک درست ہے بلکہ صرف سوویٹ نظام کے ضروری پہلوؤں کو جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں یہاں لکھنا منظور ہے۔

ترکی نظام اساسی کی خصوصیتیں ہم مندرجہ بالا دونوں نظاموں سے مقابلہ و مقابلہ کرکے اوپر واضح کر آئے ہیں اس لئے اُن کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔

اب اسلامی قانون کو لیجئے :۔ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے لئے جو قانون بنایا جائے تو اس کی ترویج، ترقی اور بقا کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانوں کی دنیوی اور اخروی ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔ اپنے پیروؤں کو حتی الامکان باہم مساوات کا درجہ دیتا ہو۔ اور اپنے مخالفین یا اپنے سے مغائر عناصر کو سیاسی طاقت پر قابض ہونے سے ہر طرح باز رکھنے میں ساعی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ان کو حق حیات سے محروم نہ کرتا ہو۔

قانون اسلامی نے ایسے عوامل کو جو ایک طبقہ انسانیت کے ہاتھ میں آکر دوسرے طبقے کو زندگی کے آرام سے محروم کر سکیں اپنے پیرووں کی مشترک ملکیت قرار دیا یا بعض دیگر عوامل کو قطعاً ممنوع اور باقی عوامل کو محدود کر دیا۔ تاکہ سب ابنائے بشر کی دنیوی احتیاجات پوری ہو سکیں۔ مثلاً زمین جو زراعت اور صنعت کا منبع ہو اور جس پر حیات کا حقیقتاً انحصار ہے۔ سب مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور اسلامی گورنمنٹ کے قبضہ میں رہتی ہے۔ نظام زمینداری اور مزارعیت کو ممنوع کر دیا ہے؛ کیونکہ اس کی وجہ سے ذرائع حیات ایک گروہ کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں۔ سود ممنوع ہے؛ کیونکہ ایک شخص کی کمائی کو دوسرا اس کے ذریعہ سے غصب کرتا ہے؛ منافع اور ملکیت شخصیہ ایک حد تک تو جائز رکھا ہے تاکہ لوگوں میں کمانے اور دولت پیدا کرنے کا شوق قائم رہے مگر معین حد کے بعد یہ بھی سب مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہو جاتی ہے یعنی ان کی گورنمنٹ اور ان کے بیت المال میں شامل ہو جاتی ہے۔ سیاسی حقوق میں اسلامی قانون کے پابند اور پیرو یعنی مسلمان، بالکل مساوی ہیں اور آپس میں اعلیٰ درجہ کی ڈیموکریسی (عمومیہ) رکھتے ہیں مگر اپنے مخالف اور مغائر عناصر کو سیاسی حقوق سے محروم کر دیتے ہیں یعنی ان پر اپنی "حاکمیت مطلقہ" (Dictatorship) قایم کرتے ہیں۔ اس قسم کی "حاکمیت مطلقہ" کے بغیر کوئی اصول اور قانون اپنی بقا کی امید نہیں رکھ سکتا۔ دنیا میں اگر آج بھی غور سے دیکھا جائے تو ڈیموکریسی، مساوات، جمہوریۃ وغیرہ کے دلفریب نظامات اصل میں ایک نہ ایک فرقہ یا صنف کی "حاکمیت مطلقہ" سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں۔ قانون اسلامی بھی یہی بات کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نہایت صراحت، وضاحت اور صاف گوئی کے ساتھ کہتا ہے کہ اسلامی حکومت مسلمانوں کی "حاکمیت مطلقہ" ہو گی۔ لیکن حریت، مساوات، اخوت اور ڈیموکریسی کے

کے حامی الفاظ کو ریا کارانہ جامہ پہنا کر اپنا مطلب نکا لتے ہیں۔

انسان کی اخروی ضروریات کو جس خوبی سے اسلام پورا کرتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس سے بہتر صورت میں اور کوئی مذہب کر ہی نہیں سکتا۔

ظفر حسین
(از استنبول)

مولوی ظفر حسن صاحب ہندوستان سے کابل و ماسکو وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے آج کل ایک عرصے سے قسطنطنیہ میں مقیم ہیں۔ اہل ہند کو چونکہ ترکی جمہوریت کے متعلق صحیح معلومات ابتک نہیں حاصل ہوئے ہیں اور بعض امور بالکل مبہم تھے اس وجہ سے ہمنے مولانا موصوف کو لکھا کہ وہ اپنے اہل ملک کیلئے اصول جمہوریہ ترکیہ کو واضح طور پر لکھیں۔ چنانچہ اسی فرمائش کے مطابق یہ مضمون ماہ گذشتہ میں ہم کو موصول ہوا لیکن ہم اس کو فروری کے مہینہ میں درج نہیں کر سکے۔

اس مضمون کے پڑھنے کے بعد ترکوں کے متعلق یہ رائے قائم کرتے ہیں آسانی ہو جاتی ہے کہ انھوں نے دنیاوی قانون میں اپنے آپ کو اسلام سے زیادہ یورپ کا شاگرد بنالیا ہے۔ "مدیر"

روزنامچہ اورنگ زیب

مولانا احتشام الدین صاحب ایم اے جو دہلی کے ایک قدیم علمی خاندان کے رکن ہیں اور سر میں علمی دماغ اور ہاتھ میں زندہ قلم رکھتے ہیں مندرجہ ذیل مضمون میں جس نادر خزانہ کا پتہ دیتے ہیں وہ ہر علم دوست کے لئے مسرت کا موجب ہے۔ لیکن جس طریق سے وہ نمایاں ہو کر پھر بے نمود ہو گیا ہے نہ صرف حیرت بلکہ حسرت انگیز ہے۔ ہم کو دہلی کے دیگر ارباب خبرت و بصیرت سے امید ہے کہ وہ اس مخفی گنجینۂ تاریخی کی جستجو کر کے مزید روشنی ڈالیں گے۔

نیز ہم خود خواجہ مصلح الدین صاحب سے توقع رکھتے ہیں کہ اگر ممکن ہو تو ہر قسم کے دعاوی سے دست بردار ہو کر وہ مدعا علیہم کو اس کے اظہار کی اجازت دیدیں کیونکہ اس خوف کے اٹھ جانے سے شاید وہ اخفا نہ کریں۔

"مدیر"

مشہور ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے عہد کی تاریخ لکھے جانے کی ممانعت کر دی تھی اور اسی وجہ سے خافی خاں نے اپنی تاریخ پوشیدہ لکھی اور خافی خاں لقب پایا۔
یہ روایت کہاں تک صحیح ہے اس کی اسناد سے دریافت ہو سکتا ہے لیکن اس وقت یہ اسناد ہمارے پیش نظر نہیں۔ غالباً اورنگ زیب نے اپنے عہد کے ابتدائی چند سال کے واقعات کو حوالۂ قلم ہونے سے روکنا چاہا ہو گا تاکہ وہ آیندہ کسی باپ بیٹے کے درمیان مثال نہ ہونے پائیں یعنی جو کچھ اس کو شاہجہاں کے ساتھ طوعاً و کرہاً کرنا پڑا اس کی مثال نہ قائم ہو جاوے"

تاریخ کے مطالعہ سے یہ عجیب بات جابجا ثابت ہوتی ہے کہ کامیاب اولوالعزموں کے کارناموں کی نقل اتارنے کی ان کے پس ماندگان کوشش کیا کرتے ہیں۔ مثلاً جہانگیر نے اکبر کے آخری برس میں باپ سے ایک قسم کی سرکشی اور وحشت بلکہ بغاوت اختیار کر رکھی تھی۔ شاہجہاں کو بھی ایسا ہی اتفاق ہوا کہ وہ جہانگیر کے آخری چند سال میں جہانگیر سے سرکش وحشی اور باغی بنا رہا بھی وراثت تخت سے پہلے اورنگ زیب کے حصہ میں آئی۔ مگر یہ ایک کامیاب باغی ثابت ہوا جس نے باپ سے زمام حکومت بالآخر چھین کر اُسے محبوس و گوشہ نشین بنا دیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں اس کے فرزندوں کے بھی ایسے ہی ارادے اورنگ زیب کو محسوس ہوئے اور اس کو یہ منصوبے درہم برہم کرنے اور ان کی روک تھام میں بہت کچھ تجربہ، تدبیر اور حکمت صرف کرنی پڑی بالآخر بڑی کامیابی کے ساتھ اس نے بیٹوں کو اپنے آخری عہد میں سرکشی سے باز رکھا۔ اور اپنے آپ آخر تک ان پر قابو یافتہ اور سربلند رہا۔ یہ اورنگ زیب ہی کا حسن تدبر تھا جس نے اس مثال کی جو جہانگیر نے اکبر کے آخری زمانہ میں سرکشی اختیار کر کے قائم کی تھی بیخ کنی کر دی اور اس کے بعد ہم نے نہیں سنا کہ کسی تیموری شہزادۂ ہندوستان نے باپ کے جیتے جی تخت سلطنت پر دست حرص و طمع دراز کیا ہو۔

جس تدبیر سے اورنگ زیب نے اپنے فرزندوں کو اس قسم کی سرکشی سے باز رکھا، اس کا اقتضا یہی ہو سکتا تھا کہ اس ناگزیر واقعہ اور سلوک کی جو شاہجہاں کے ساتھ اس کو ناچار پیش آگیا تحریر میں بھی کوئی مثال باقی نہ چھوڑی جائے۔ پس اگر یہ تاریخی سند سے ثابت ہو کہ اورنگ زیب نے اپنے عہد کی تاریخ لکھنے سے منع کر دیا تھا تو اس کے معنی صرف اس قدر تھے کہ اس کے عہد کے ابتدائی واقعات علی الخصوص شاہجہاں کو نظر بند کر کے تخت سلطنت دبا بیٹھنے کا واقعہ صفحات تاریخ میں اپنا داغ نہ دکھائے ورنہ جیسا کہ تمام سلطنت خانوں میں دستور رہا ہے

اور ہندوستان کی ریاستوں میں آجتک دستور ہے کہ فرمانروائے وقت کے روزانہ مشاغل اور معاملات اور واقعات کا روزنامچہ لکھا جاتا ہے یہ روزنامچہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی اول سے آخر تک لکھا جاتا رہا۔ ہر روز کوئی اہم واقعہ اس میں درج ہونے سے باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ بعض ریاستوں اور سلطنتوں میں تو اس روزنامچہ کی تحریر کے متعلق اس قدر تاکید سنی گئی ہے کہ اگر فرمانروائے عہد کسی اپنی منکوحہ یا غیر منکوحہ عورت سے ہم بستر ہو تو یہ واقعہ بھی روزنامچہ میں بالفرور درج کیا جاتا ہے تاکہ اگر اس محل یا غیر محل سے اولاد ہو تو اس کے صحیح الاصل ہونے کی حقیقت تک روزنامچہ کی یادداشت سے سراغرسانی کیجا سکے۔

اورنگ زیب کا روزنامچہ اس حد تک تو جزرس نہیں تھا مگر جیسا کہ اس کے چند نمونوں سے جو ہم ذیل میں درج کریں گے ظاہر ہوگا۔ روزانہ واقعات انواع و اقسام کے اس میں درج ہوتے تھے اور وہ عہدِ اورنگ زیب کی سب سے زیادہ معقول تاریخ تھی جس میں ہزارہا واقعات جن سے عام تواریخ آشنا بھی نہیں ہیں اور بے شمار اشخاص و اسماء اور معاملات کی تفصیل ونشان اور حوالہ تھا کہ آج اگر وہ مجموعہ موجود ہوتا تو عہدِ اورنگ زیب بلکہ اس زمانہ کی نہ صرف تاریخ بلکہ تہذیب رسوم معاشرت مشاغل سیاسیات حالات واقعات ہر صنف میں داستانیں کی داستانیں اہل تلاش وطلب کو میسر آئیں کہ جن کے مطالعہ سے کبھی سیری نہ ہوتی اور اورنگ زیب کے متعلق جس قدر مباحث اس وقت عقل و قرائن سے فیصلہ ہوتے ہیں اور پھر بھی مبہم رہجاتے ہیں اُن سب کا فیصلہ روزنامچہ مذکور کے مستند حوالہ جات سے کیا جاتا۔

افسوس صد افسوس بلکہ ہزار افسوس کہ تاریخ کا یہ گرانمایہ خزانہ جو ورق ورق جزو و جزو جلد جلد نہیں بلکہ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے تخمیناً اکیاون سال کے فی سال کے ایک مجلد کے اکیاون مجلد پر ختم ہوا تھا۔ اور اس صدی عیسوی کے ابتدائی چند سال تک معلوم اور دہلی میں

موجود تھا اب لاپتہ ہے اور نہیں معلوم اس کو زمین کھا گئی یا آسمان۔

ان اکیاون مجلدات کی مختصر رُوداد یہ ہے کہ بہ پابندی رسم سلطنت جو اب تک ریاستہائے ہندوستان میں قائم ہے فرمانروائے عہد اور شہنشاہ وقت کے حرکات وسکنات احکام اور واقعات و معاملات کا روزنامچہ تحریر ہوا کرتا تھا۔ اور ہر سال کے مجموعے کی ایک علیحدہ جلد بنائی جاتی تھی اور نئے سال میں نئی جلد شروع ہوتی تھی اس طرح اکیاون جلدیں اورنگ زیب کے سالہائے حکومت کی مرتب ہو گئیں ہیں۔

احمد نگر کے قریب اورنگ زیب کی وفات پر یہ روزنامچہ نواب زینت النساء بیگم اورنگ زیب کی بیٹی کے ہاتھ لگا۔ جو اس وقت کیمپ میں اس کے ساتھ تھیں۔ نواب موصوفہ کی ایک یادگار شہر شاہجہاں آباد دہلی میں اندرون فصیل شہر لب دریائے جمن بنام "زینت المساجد" ہنوز جی و قایم ہے۔ اور بیگم کی ہمت و شوکت کا ایک عالیشان نمونہ ہے۔ الغرض زینت النسا بیگم اپنے باپ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس مجموعہ کو دہلی لیکر آئیں۔ اور یہ مجموعہ ایک عرصۂ دراز تک دہلی میں رہا یہاں تک کہ دہلی میں اُن آشوب و آفات کا سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر دہلی سے اکثر عمائد و شرفا کے خانوادوں کے لکھنؤ، حیدرآباد اور دیگر دیار و امصار کی طرف نکلجانے اور دہلی سے ہجرت کر جانے پر منتہی ہوا۔ یعنی محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ کے آخر عہد سے شاہ عالم کے خاتمہ اور نام سلطنت باقی رہجانے تک یہ سلسلہ دراز رہا۔ ۱۱۶۵ھ ہجری سے ۱۲۲۰ھ کے قریب تک دہلی کے عمائد و اشراف ترک وطن کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں اورنگ زیب کے روزنامچہ کے یہ مجلدات جو بجائے خود ایک کتابخانہ تھے دہلی سے کسی امیر کے اسباب کے ساتھ لدکر لکھنؤ پہونچے اور ۱۳۱۵ھ کے قریب وہاں سے ان کے دہلی واپس لانے کا سہرا راس مسعود (صدر المہام تعلیمات حیدرآباد نبیرۂ سر سید احمد خاں مرحوم) کے ماموں صاحب

خواجہ مصلح الدین خاں خلف اصغر نواب شرف الدین احمد خاں مرحوم باعث ہوئے ۱۳۱۵ھ کے قریب سید محمود مرحوم الہ آباد ہائی کورٹ کی ججی سے پنشن یاب ہو کر لکھنؤ میں بشغلہ بیرسٹری سکونت پذیر تھے۔ خواجہ مصلح الدین صاحب موصوف کو اس زمانہ میں لکھنؤ جانے کا متعدد بار اتفاق ہوا اور وہاں اثنائے قیام میں یہ روزنامچہ ان کو اپنے شوق تلاش قلمیات کے سلسلہ میں ایک ضعیف الاحوال شخص کے مکان میں نظر پڑا جس نے اس اکیاون مجلدات کے مجموعہ کو خواجہ صاحب کے معائنہ اور ملاحظہ کے لئے ایک پلنگ پر لا رکھا تھا۔ اور اسے خبر نہ تھی کہ کیا گنج شائگاں اس کے ماچہ پر لدا ہوا ہے اور اس پر جان دینے والے کیسے کیسے انگریز ہندوستانی ہندو مسلمان اس وقت بھی ہندوستان میں موجود تھے جو اورنگ زیب کے متعلق بحث مباحث میں دست و گریباں تھے بے خبر اس سے کہ ان کے مابہ النزاع امور کے فیصلہ کے لئے ایسا بیش بہا اور اتنا کثیر انبار مستند ترین مواد کا موجود ہے خواجہ صاحب کو قلمیات کی قدر و قیمت کی پہچان اور آنکھ خدا نے عطا کی ہے۔ جو اسی نادر الوجود خزینہ کی قدر و قیمت تاڑنے میں خطا نہیں کر سکتی تھی۔ آپ نے اسی جگہ اور اسی وقت اس کی قیمت ڈھائی سو روپے سلے فرما کر صاحب ذخیرہ کے حوالہ کی اور اس مجموعہ کو دہلی واپس لیکر آئے بقول شاعر ؎

جگا چند دادم جاں خریدم
بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم!

اس مجموعہ کی مطلا و مذہب جلدیں بندھی ہوئی تھیں۔ اس وقت کے ڈھائی سو بھی جبکہ ڈیڑھ سیر کا گھی ہندوستان میں فروخت ہو رہا تھا تخمیناً ایکہزار قیمت ہوتی ہے۔ اس غریب مفلوک الحال مسلمان کو دو ڈھائی سو تولہ چاندی اکیاون مجلدات کے بوجھ سے جو اس کے

لئے "مثل اشعار مثل اسفارا" کا مصداق تھا بہت غنیمت معلوم ہوئے ہونگے اور خواجہ صاحب ان مجلدات کو قبضہ میں لاکر پھولے نہ سمائے ہونگے۔ خوش خوش دہلی لیکر آئے۔ دوستوں کو دکھایا۔ بعض قدرشناسوں کے دہن طمع میں اس خزانہ کو دیکھکر پانی بھر آیا اور وہ اس تدبیر میں ہوئے کہ جس طرح بھی ہو سکے اس گنج شایگان کو اپنے قبضہ میں لانا چاہئے۔ خواجہ صاحب سے امید نہ تھی کہ وہ حینِ زندگی اس کی ایک جلد بھی اپنے قابو سے باہر جانے دیں گے۔ ناچار یہ تدبیر کیگئی کہ خواجہ صاحب کی نشستگاہ میں جس کی ایک الماری میں یہ مجلدات چنے ہوئے تھے کسی موقعہ سے چوری کرائی جائے۔

ایک شب کسی تقریب سے (شاید کسی میت کے ساتھ قبرستان تک معیت اور وہاں تدفین میں غیر معمولی تاخیر پیش آنے سے) چوری کرانے کے رزولیشن پر عمل کرانے کا حریص حریفوں کو موقعہ مل گیا۔ چند گمنام شخصوں کو جن میں کوئی یکہ والا کوئی بھاڑ جھونکنے والا تھا باہر کے مکان کی نشستگاہ میں بھیجکر قفل تڑوا دیا گیا اور مجلدات معہ دیگر کتب کے پارکرا دئے گئے اور ایسے پار ہوے کہ ان کی پھر صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!!

پولیس میں رپورٹ کیگئی۔ چوری کرنے والوں کا سراغ بھی لگا۔ بعض لوگ گرفتار کئے گئے۔ اصل محرک بھی حوالات میں دیدئے گئے۔ مگر ان کے احباب ان کو ضمانت چھڑالائے۔ کیونکہ وہ بھی کچھ کم معزز نہ تھے۔ مشہور علمائے دہلی کے نامور خاندان کی تنہا یادگار اور معززین میں قابل اعتبار تھے۔ بہت سے بارسوخ عمائد شہر کے دوست یک رنگ تھے پولیس کی کوششوں کا کل نتیجہ یہ نکلا کہ مہندیوں (مدفن حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب) کے ویرانہ کے بعض کھنڈرات، گڑھوں اور گوشوں میں کچھ اوراق کچھ کتابیں (مطبوعہ)

سلے کار پڑی ہوئی دستیاب ہوئیں۔ کچھ جلی ہوئی کتابوں کی خاک تھی گویا کہ چوروں نے
مال مسروقہ کا اس گورستان کے بھی بچھواڑے ویرانہ میں جاکر بہ تالا ۔ مگر چند کتب اور
کاغذات وغیرہ پاکر چھوڑ چھاڑ کر دیا سلائی دکھاکر چلتے پھرتے نظر آئے۔ اُدہر سرقہ کے معتبر
بانی و اصل محرک کے بارسوخ احباب کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سرقہ کی رپورٹ لاپرواہی
لکھکر داخل دفتر کر دی گئی۔ ماخوذین چھوٹ گئے۔ مگر وہ مجموعہ یعنی مجلدات روزنامچہ اسم بامسمیٰ
النادر کالمعدوم کا مصداق ہو کر ایسے روپوش ہوئے کہ شاید آئندہ کبھی ہیلی صاحب کے
"کامٹ" دمدار ستارے کی طرح کسی وقت پھر طلوع کریں۔ زمانہ کی کھلی ہوا میں آئیں اور کسی
کتب خانہ میں جگہ پائیں۔

صاحب معاملہ یعنی خواجہ مصلح الدین صاحب کا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ مجلدات تلف
نہیں کی گئیں۔ جلی ہوئی کتابوں کی خاک اُن مجلدات کی خاک نہ تھی صرف ناکارہ و بے قیمت
کتابوں کو جو ان مجلدات کے ساتھ ساتھ ناخواندہ چور چرا کر لیگئے تھے جلاکر سراغ کو پولیس کی نظروں
میں مجہول بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ جتایا گیا تھا کہ مابقی کتب اگر کچھ تھیں تو وہ جلادی
گئیں اب کسی کی مزید خانہ تلاشی وغیرہ لاحاصل ہوگی۔

خواجہ صاحب کے اس یقین سے اتنی امید ضرور ہے کہ وہ مجلدات تلف نہیں ہوئیں مگر
چونکہ اس سرقہ کی رپورٹ ہو کر مقدمہ قائم ہو گیا تھا اس لئے وہ اپنے کمین سے جہاں وہ پوشیدہ
ہیں علی الاعلان کبھی موجودہ لوگوں کی زندگی میں باہر نہ آئیں گی۔ ممکن ہے کہ کہیں دور دراز حیدرآباد
کلکتہ بمبئی وغیرہ لیجاکر اُن کو بیچ دیا گیا ہو یا کسی قدر دان انگریز نے ان کو خرید کر ولایت کو بک کر دیا
ہو۔ لیکن اس آخری کارروائی یعنی کسی انگریز کے ولایت بھیجنے کا گمان ہنوز قبل از وقت معلوم
ہوتا ہے۔ ورنہ ولایت کے اہل علم میں اس مجموعہ کی دھوم مچ جاتی وہ کسی کتبخانہ برٹش میوزیم

میں پہونچ کر ولایتی کتب خانوں کے کیٹلاگ میں آچکا ہوتا۔ خیال یہی ہے کہ معزز بانیِ سرقہ نے اپنے مکان کی تلاشی کے خوف سے اپنے معزز دوستوں میں سے علی الخصوص ایک دوست کے گھر میں جو دہلی کے نامور صاحب مطبع گزرے ہیں وہ مجلدات پہونچا دئے اور ان کا گھر اتنا بڑا گھر ہے کہ اس کے نوادرات کے ذخیرہ کے بازار میں آکر فروخت ہونے کا وقت شاید آیندہ صدی میں کبھی آئے ۔ ان کے گھر میں اس کا دیکھنا اس لئے متعذر ہے کہ مالِ مسروقہ تھا پولیس میں رپورٹ اس کی موجود اور مالک اس کے خواجہ مصلح الدین جیسے قائم ہیں ۔ اگر ذرا بو بھی اس کی پا جائیں تو پولیس کی دوڑ بیکر دوڑ پڑیں ۔ ان اندیشوں نے اس نایاب تاریخی ذخیرے کو اورنگ زیب کے مزید حالات کی ہنوز مشتاق دنیا ہندو مسلمان ، انگریز سب کی نظر سے پوشیدہ کر رکھا ہے دعا ہے کہ کم سے کم محفوظ رہے ۔ تلف نہ ہو ۔ اور ہماری نظریں نہ سہی تو آیندہ نسلیں ہی اس کو دیکھ سکیں ۔

خواجہ مصلح الدین خاں صاحب نے کبھی کبھی اس مجموعہ میں سے بعض یادداشتیں ایک علیحدہ کاپی پر نقل کی تھیں ۔ نقل کرنے کی ضرورت ان کو ہی معلوم ہوگی دریافت نہیں کی ۔ اتنا معلوم ہوتے ہیں کہ نقل بعض یادداشت کی خواجہ صاحب نے کی تھی راقم نے اس کی نقل النقل کی خواجہ صاحب سے درخواست کی اور انھوں نے بکمال عنایت و مہربانی پانچ متفرق اوراق پر مطلوبہ نقول مرحمت فرمائیں جن کو راقم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہے کیا ان مجلدات میں سے کہ ہر ایک مجلد سال بھر کے واقعات سے بقید تاریخ و یوم و سن بھرا ہوا اور لازماً ضخیم بھی ہوگا "مشتے نمونہ از خروارے" یہ چند سطور ہیں جو اس وقت دستیاب ہو سکتی ہیں +

(۱) نقل صفحہ اول از ورق اول نقول عطیہ خواجہ مصلح الدین صاحب۔

افتخار خاں بہ فوجداری بنگناش (؟) نامزد گردید ۔ وقت مراجعت از جامع مسجد

اثنائے فرود آمدن از کشتی و سوار شدن بر تخت رواں واژدوں بختے ازلی
از مریدان گرو تیغ سنگہ دھت۔ (خشت؟) انداخت یکے بر تخت رسید
بند ہائے جلو گرفتہ آوردند حوالہ کوتوال شد۔ بست و نہم شعبان سال نوزدہم از
سنین دولت قرین عالمگیری مطابق سنہ یکہزار و ہشتاد ہجری۔

(۲) نقل صفحہ دویم از ورق اول نقول عطیہ خواجہ صاحب ممدوح الشان۔

نفضل علی پسر مرشد قلیخاں قدیمی بافزائش خطاب خانی و خدمت واقعہ نگاری
کچہری دیوان اعلیٰ سرافراز گردید۔ وقت مرحمت خطاب بر زبان دربار گزشت:۔" بہ
پرسید بر نام "خانی" میخواہی یا خطابِ پدر موی الیہ؟ بلحاظ خواطر مرشد قلی اختیار
کرد۔ فرمودند:۔" من و مادر و پدر من قربان علیؑ! این نادان بگوئید علی گذاشتہ
قلی میشود!! فضل علیخاں بہتر است"

اورنگ زیب کے آخری جملہ پر کہ "من و مادر و پدر من قربان علیؑ" بہت سے شیعان علی
بھی رشک کریں گے۔ ہر چند کہ اہل سنت کو کوئی تعجب نہ ہوگا۔

(۳) نقل ورق دوم از نقول عطیہ خواجہ صاحب ممدوح۔

دوازدہم ذیقعدہ بعرض رسید حمیدہ بانو بیگم والدہ روح اللہ خاں رو در نقاب
عدم کشیدہ عاطفیت (؟) خانہ زاد نوازی بادشاہزادہ محمد کام بخش و اشرف خاں
میر بخشی را بخانہ موی الیہ فرستاد کہ از باغ برداشتہ آورند۔ خلعت آں نوئیں عزت
قرین و برادرانش مرحمت گردید تشتق امرائے (؟) عفت و عظمت زینت النسا
بیگم بموجب حکم عنایت شمیم خانہ او را بہ تشریف شریف دولت کاشانہ فرمودند
سال بست و ششم از سنین دولت قرین عالمگیری مطابق سنہ یکہزار و نود و سہ ہجری

(۴) نقل ورق سوم از نقول عطیہ خواجہ صاحب موصوف

ادہم غرہ رجب بعرضِ رسید خلیل خاں صوبہ دار لاہور کہ عرض (؟) مرض

بدارالخلافہ آمدہ بود درگذشت ، روز دوم از فوتش پرتوِ قدم بسر منزل

بازماندہ ہائے آں مرحوم افگندند و میر خاں و سرح اللہ خاں و عزیز اللہ خاں

پسرانش و اقربائے دیگر را خلاع مرحمت فرمودہ مشمول مراحم ساختند و زوجہ

او حمیدہ بانو دختر ملکہ بانو ہمشیر مہد علیا ممتاز الزمانی را بہ سالانہ پنجاہ ہزار

روپیہ کامیاب نمودند۔ آغاز سال چہارم از سنین عالمگیری مطابق سنہ ہزار و

ہفتاد یک ہجری

(۵) نقل صفحہ اول ورق چہارم از نقول عطیہ مذکور

از واقعہ دارالخلافہ معروض گردید کہ نواب تقدس قباب زیب النسا بیگم در نقاب

رحمت الٰہی کشیدند و در دولت سرائے مغفرت آرامش گزیدند۔ خاقان جہاں را

از مفارقت فرزندگان پیوند دل غم اندود و دیدہ اشک آلود گردید و از بے طاقتی اختیار

نماند۔ ناچار بصابرت ساختند۔ احکام قدسیہ بنام سیادت خاں و شیخ عطاء اللہ و

حافظ (؟) در بذل خیرات و صدقات و عمارت مضجع آنقدسی ذات کہ در باغ سی

ہزاری از متروکات نواب جنت مآب صاحبۃ الزمانی (جہاں آرا بیگم) قرار یافتہ

عز صدور یافت۔

آغاز سال چہل و ششم از دولت والائے عالمگیری مطابق سنہ یکہزار و سیزدہ ہجری

فٹ نوٹ از راقم سطور۔ باغ سی ہزاری سے وہی میدان مراد ہے جو دہلی شاہجہاں آباد کے کابلی

دروازے کے باہر بنام تیس ہزاری میدان کے اب بھی مشہور ہے اور اب جبکہ دہلی انگریزی پایہ تخت

نقل از صفحہ دوم وورق چہارم نقول مذکور الصدر

از واقعہ دار الخلافہ بعرض مقدس رسید کہ نواب قدسیہ پرہیز (پرویز ؟) بانو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۸) ہوئی ہے اس میدان میں اکثر کھیل تماشے نمائشیں وغیرہ ہوا کرتی ہیں اس سے بڑا میدان قریب شہر اور کوئی موجود نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس میدان کا نام تیس ہزاری قدیم سے ہے اور سوائی وحافظ زیب النساء بیگم اورنگ زیب کی لائق فائق بیٹی کی قبر اسی نام کے باغ میں تھی جو اب میدان ہو گیا ہے۔ خافی خاں نے اس واقعہ کو درج کیا ہے اور سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں نیز آبحیات میں تحت احوال استاد ذوق اس تیس ہزاری باغ اور زیب النساء بیگم کی قبر کا حوالہ موجود ہے اور کتبہ قبر کی عبارت بھی نقل ہے۔ مادہ تاریخ انتقال خود اورنگ زیب نے " فاذخلی جنتی" تجویز کیا تھا اور لوح قبر پر وہی کندہ ہوا تھا۔ چند سال ہوئے اسی میدان میں کسی ضرورت سے زمین کھودی گئی تو یہ قبر نکل آئی۔ جاننے والوں نے تصدیق کی کہ یہ قبر زیب النساء بیگم کی ہے۔ بحث شروع ہوئی کہ اس کو درست کیا جائے۔ بیگم صاحبہ والی بھوپال بالقابہا نے بھی کچھ توجہ فرمائی لیکن قیل وقال ہو کر آخر اس قبر کو پھر مٹی پتھر ڈال کر زمین دوز کر دیا گیا۔ کیا خدا کی قدرت ہے کہ زیب النساء کا تخلص مخفی تھا۔ بعد مردن اس کی قبر کی نسبت ارباب حل وعقد دہلی نے تجویز کیا کہ اس کی قبر مخفی ہی رہنی چاہئے! علت اس تجویز کی صرف یہ ہے کہ ایک صاف کھلے وسیع میدان میں قبر کو نمایاں کر دینے سے کھیل تماشوں گھڑ دوڑوں میں گھوڑوں کے پاؤں کو ٹھوکر لگیگی اور نگاہ میں ایک اسلامی مدفن۔ ہر چند کہ وہ زیب عالم نسواں کا ہی کیوں نہ ہو زیبا نہ معلوم ہوگا۔ لہذا مٹی ڈال کر سطح کو جیسی تھی ویسے ہی مکرر ہموار کر دیا گیا۔ اور زیب النساء کے مدفن کو باوجود اسناد معتبرہ ایک مسئلہ مابہ النزاع بنا دیا گیا اور قرار دیا گیا۔ کہ اس کی قبر تو بقول بعض:۔ "لاہور میں ہے" زیب النساء کی قبر غدر سے پیشتر تک تیس ہزاری باغ میں اسی طرح مجھ کے اندر واقع تھی جیسے

بیگم جواہر علائی حضرت (عالمگیر) از بطن قندھاری محل[۱] صبیہ مرزا حسین صفوی کہ بحسب عمر از جمیع فرزنداں اعلیحضرت (شاہجہاں) کلاں بود - فانی سرا را پدرود نمود - و در جوار رحمت آفریدگار آسود - صفی خاں ناظم و جمیع متصدیاں صوبہ بباغ کہ معمار توفیق آں مغفورہ را احداث نمودہ رسانیدند -

آغاز سال نوازدہم از سنین دولت قرین عالمگیری مطابق سنہ یکہزار و ہفتاد و شش ہجری

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۸)

جیسے کہ اس کی پھوپی روشن آرا بیگم کا مزار آج بھی روشن آرا باغ میں سیرگاہ خاص و عام ہے - غدر میں نصف شہر سے زیادہ اور سارا قلعہ مسمار کیا گیا - عمارات کا ملبہ باہر شہر کے میدانوں میں لا کر ڈالا گیا - اور شہر کے گرداگرد تمام قبرستان کو دانستہ پوشیدہ کر کے منظر پیدا کئے گئے - اس گڑبڑ میں زیب النساء بیگم کی قبر بھی مجبر مسمار کر کے دبا دی گئی - وہ زمانہ گڑبڑ کا تھا - مگر اب اس وقت کوئی وجہ اس کے دبا دینے کی نہیں -

فٹ نوٹ - [۱]

قندہاری بیگم جن کا نام اس یادداشت میں آیا ہے شاہجہاں کی ایک محل تھیں - آگرہ میں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے اور مہاراجہ بھرتپور کی ملکیت ہے جنہوں نے اس کو کوٹھی بنا لیا ہے - تعویذ قبر نذارد ہو کر گنبد کے نیچے کا ہال اب ڈرائنگ روم بن گیا ہے -

فاعتبروا یا اولی الابصار !

(بقیہ بر صفحہ ۱۶۰)

(۷) نقل ورق ششم از نقول مذکورۂ بالا۔

سال دہم از سنین خلافت دولت والائے عالمگیری مطابق سنہ ہزار وہفتاد وہشت ہجری بپیرایہ اختتام گرفت و سال یازدہم بہ مبارکی آغاز شد روز دیگر بسیر باغ "صاحب آباد" با مخذرات رفتہ تمام روز مسرت اندوز از طرف ملکہ زماں مالکہ دوران بیگم صاحبہ (جہان آرا بیگم) جہان احسان اقامت(؟)

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۹)

حقیقت یہ ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ نے ہنوز تاریخی یادگاروں کے برآمد کرنے اور انکو اُن کے حال پر بحال کرنے کی بہت کم کوشش کی ہے اور صرف انھیں یادگاروں تک زیادہ تر ان کی نظر رہی ہے جو کسی صورت سے نظر فریب و سیر و تفریح کے لائق ہیں علاوہ ان کے بہت سی معتدبہ یادگاریں فنا کر دی گئیں۔ فنا کیجا رہی ہیں اور ان کی طرف سے دیدہ و دانستہ اغماض کیا جا رہا ہے۔

(فٹ نوٹ ملا م)

باغ صاحب آباد سے مراد وہی تیس ہزاری باغ ہے جس میں زیب النساء بیگم اس واقعہ سے تخمیناً ۴۶ برس بعد دفن ہوئیں۔

اس یادداشت کے وقت جہان آرا بیگم زندہ تھیں اور چونکہ شہنشاہ بھائی ان کے باغ میں گیا تھا ان کی طرف سے یہ عنایات بزرگانہ بحیثیت ایک بڑی بہن کے عمل میں آئی تھیں۔ شہر میں جو باغ اس وقت بنام "عام کمپنی باغ" اور انگریزی میں "کوئین گارڈن" کے نام سے مشہور ہے یہ باغ بھی جہان آرا بیگم کی یادگار ہے جو عہد اورنگ زیب و شاہجہاں میں صرف "بیگم صاحب" کے لقب سے مشہور تھیں

بست ہزار و پنج و ہیزدہ تغور (؟) پارچہ و جمد بر مرصع با پھول کٹارہ و پاندان مرصع با خوانچہ طلا و پیکدان مینا کار و چوگھڑی بو ۔ دو صد قاب طعام وا رنجہ و پان ۔ بر مراتب شد لی افزودہ۔

بقیہ نوٹ صفحہ (۱۶۰)

غدر سے پیشتر تک یہ باغ بیگم کا باغ کہلاتا تھا ۔ اس میں ایک نفیس سرائے بھی بیگم صاحبہ کی تعمیر کردہ تھی جس کی برنیر نے اپنے سفرنامہ مین تعریف کی ہے آج اس سرائے کی بجائے شہر کا ٹاؤن ہال موجود ہے ۔ سرائے غدر کی ڈہایا ڈہری مین مسمار کردی گئی ۔ فقط

(محمد احتشام الدین دہلوی)

مطائبات اکبر

من العلم قلیلا ہی پڑہو من بعد اوتیتم
نہ مانوگے تو اک دن بھائیو کھاؤگے جوتی تم

زندگی اور قیامت مین ریلیشن سمجھو
اس کو کالج تو اسے کانووکیشن سمجھو

ڈوپ کھسکی پروفیسر پہونچے
جب لسو لاہٹا تو رندا ہے۔

مذہبی بحث مین نے کی ہی نہین
فالتو عقل مجھ مین تھی ہی نہین

شیخ کی وہ ہیچ نہین وہ شیخ کی داڑھی نہین
دوستی مذہب سے ہے پر اسقدر گاڑھی نہین

منصورحلاّج

(از مولوی محمد مسلم صاحب ایم۔ اے پروفیسر سینٹ کولمبا کالج ہزاری باغ)

عام طور پر یہ شخص منصور کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن دراصل یہ ہے ابن منصور۔ پورا نام ونشان ابوالمغیث الحسین بن منصور بن محمد البیضاوی ہے۔ آبائی پیشہ ندافی تھا اس لئے الحلاّج کا لقب بھی داخل نام ہوگیا۔ اسکا دادا آتش پرست تھا۔ باپ نے اسلام قبول کیا۔ حسین بن منصور تقریباً ۲۴۴ھ میں فارس کے شہر بیضا میں پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر سے چالیس سال کی عمر تک چوبیس برس حضرت جنید بغدادی، حضرت تستری عمر بن عثمان مکی اور دوسرے مشائخ صوفیہ کے حلقہ میں درویشانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ پھر بقول علامہ ذہبی سودائے علو مرتبت اور حب جاہ و اقتدار نے اسے گمراہ کردیا اور اس حلقہ سے نکل کر قرامطہ یعنی باطنیوں کا داعی بنگیا۔

شعبدے۔

بقول ابن مسکویہ یہ بڑا سیاح تھا۔ پھرتا پھرتا ہندوستان تک پہونچا جہاں اسنے بہت سے شعبدے سیکھے۔ رسی پر چڑھ کر غائب ہوجا سکتا۔ روپیہ برسا سکتا۔ میوے منگوا سکتا۔ ہوا میں ہاتھ پھیلا کر سکون یا مشک سے بھری ہوئی مٹھی کھولتا اور تماشائیوں کے آگے بکھیر دیتا۔ ایک عجیب کرامت کا مدعی تھا کہ "میں اپنے جسم کو اتنا پھیلا سکتا ہوں کہ پھیلاتے پھیلاتے پورے کمرے پر چھا جا سکتا ہوں"[۵] ایک دفعہ ابن نصر القشوری بیمار تھے انکو سیب کی رغبت ہوئی جو ان دنوں ملتے نہ تھے۔ حلاّج نے اوپر ہاتھ لپکایا اور ایک سیب سامنے

---

۵ ابن الندیم۔

رکھ کر کہا یہ باغ فردوس سے توڑ لایا ہوں نوش کیجئے۔ اس میں ایک داغ دیکھ کر کسی نے کہا
بہشت کے میوے تو سڑتے نہیں پھر یہ داغ کیسا ہے؟ اس نے برجستہ جواب دیا۔ کہ یہ
دارالبقا سے دارالفنا کی طرف آیا ہے اس لئے اثنار راہ میں یہ علامت فنا پیدا ہو گئی۔ ایکبار
یہ غیب سے سکہ نکال رہا تھا۔ کسی نے کہا ایسا سکہ نکالو جس پر خلیفہ کی بجائے تمہارا نام
کندہ ہو مگر نہ نکال سکا۔ کسی سفر کے شروع کرنے سے پہلے وہ راہ میں گڑھے کھدوا کر کہیں
پانی۔ کہیں میوے۔ کہیں پکے ہوئے کھانے چھپا دیتا اور پھر سفر میں ہمراہی مسافروں کو
یہ کرامتیں دکھاتا۔

عقائد و اعمال۔

شروع میں یہ حضرت امام رضا کا داعی تھا جس کے لئے اس نے کوڑے بھی کھائے
پھر خود مہدی موعود بن گیا۔ اور آخر میں خدا کے درجے تک ترقی کر گیا۔ باطنی اسمٰعیلیوں یا قرمطیوں
سے بھی ساز باز رکھتا تھا۔ دراصل اس کے دین و مذہب کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ دوسرے
قاعدۂ عجم کی طرح سیاسی انقلاب اور خلافت کی تباہی اس کا اصلی مقصد تھا۔ مختلف
فرقوں میں رسوخ و مرتبہ حاصل کرنے کے لئے کہیں سنی بنتا، کہیں شیعی، کہیں باطنی۔ کہیں
صوفی، موقع پر بے حد نمازیں پڑھنے اور بے انتہا روزے رکھنے لگتا۔

اس کے شعبدے دیکھ کر ہزاروں ہزار عوام الناس اس کے مطیع ہو گئے۔ اس
نے تناسخ۔ رجعت اور حلول کی تعلیم دی، خدائی کا مدعی ہوا، کہا کرتا قوم نوح کو ڈبونے والا
اور عاد و ثمود کو تباہ کرنے والا میں ہی ہوں۔ مقرب مریدوں میں سے کسی کو کہتا تو نوح ہے
کسی کو تو محمدؐ ہے۔ ان کی روحیں میں نے تمہارے بدنوں میں لوٹا دی ہیں[۱]

[۱] ابن مسکویہ۔

اس زمانہ مین باطنیون کے دعاۃ کا بھی یہی ڈھنگ تھا کہ کہین ناہد عبادت گذار بنتے۔ کہین درویش۔ کہین شیعی۔ کہین سنی۔ اور خلافت کے خلاف خفیہ سازش وشورش پھیلا پھرتے۔ حلاج کا بھی یہی طور تھا۔ اپنے دعاوی وعقاید کے ساتھ شعبدون سے اپنی کرامتین دکھاتا ہوا، ریائی زہد وا تقا اور شدید ریاضات جسمانی برداشت کرتا ہوا۔ گاؤن گاؤن اور شہر شہر پھرتا۔ آخر ۲۹۹ھ مین اپنے ساتھیون سمیت گرفتار کیا گیا۔ تفتیش سے بہت سے کاغذات اور خطوط برآمد ہوئے اور وہ بغداد بھیج دیا گیا۔ جہان تقریباً دس سال نظربند رہا۔

خلیفۃ المقتدر عباسی کا زمانہ تھا جب کہ حرسرا کی عورتون لونڈیون اور خواجہ سراؤن کی حکومت چلتی تھی۔ منصور نے ایام قید مین ان سادہ لوح عورتون اور جاہل مسلمانون پر ڈورے ڈالے۔ دعا۔ تعویذ، جھاڑ پھونک اور کرامتون سے صرف انھین کو رام نہ کیا بلکہ نماز روزہ اور زہد وعبادت کی نمائش سے شہر کے بہتیرے اعلیٰ عہدہ دارون، امیرون اور خود نصر حاجب کو اپنا معتقد بنا لیا۔ قریب تھا کہ خلیفہ اسے آزاد کر دے مگر حامد بن عباس وزیر سلطنت نے اس کی خفیہ سازشون اور ملحدانہ عقیدون کو پیش کر کے خلیفہ سے اس پر مقدمہ چلانے کی اجازت طلب کی۔ نصر نے اس کی بہت حمایت کی۔ آخر یہ فوجداری سپرد ہوا۔ کھلی عدالت مین اس کے مقدمے کی سماعت ہوئی۔ کاغذی اور زبانی شہادتون کے علاوہ علمائے وقت نے اس کے قتل کا فتوے صادر کیا۔ چنانچہ ساڑھے آٹھ سال حوالات مین گذارنے کے بعد ۳۱۰ھ ہجری مین اس "خدا" کے ایک ہزار کوڑے لگائے گئے۔ موسلا کیا گیا اور دار پر چڑھا یا گیا۔ سر ہمبرستان یا خداستان ملک خراسان کو بھیجا گیا اور دھڑ پھونک دیا گیا۔

علامہ[1] ابن جوزی نے حلاج کے متعلق یہی حالات بیان کرکے آخر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ قتل کے وقت حلاج نے اپنے مریدون سے کہا "صبر کرو۔ دل تنگ نہ ہو تیس دن میں پھر واپس آتا ہون" اس کے قتل کے تین سال بعد اس کے تین چیلے حیدرہ، الشعرانی اور ابن منصور جنہون نے حلاج کے عقائد سے توبہ کرنے سے انکار کیا دار پر کھینچے گئے۔ اس کے بعد اس کے منتشر مریدون نے اہوازمین ابو عمارہ ہاشمی کے دامن فیض میں اور نیشاپور میں فارس الدینوری کی سرپرستی میں پناہ لی۔ اسی آخر الذکر جماعت میں پہلا صوفی شاعر ابو سعید ابو الخیر مصنف رباعیات ہوا۔

دنیا کے اکثر ناکام انقلاب کوشون کے پیرؤں کی طرح حلاج کے مریدون نے بھی اس کی رجعیت کے عقیدہ کی اشاعت کی مشہور کیا کہ حلاج (حضرت عیسٰی کی طرح) قتل نہیں ہوا، بلکہ اس کا ایک دشمن جس کو حلاج کا قالب دے دیا گیا تھا مقتول ہوا۔ بعضون نے یہ دعوے بھی کیا کہ ہم قتل کے بعد حلاج سے ملے ہیں اور باتیں کی ہیں۔ بعضون نے شہادت دی کہ ہم نے اسے نہروان کی سڑک پر (حضرت عیسٰی کی طرح) ایک گدھے پر جاتے دیکھا ہے۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ "ایک جانور نے میرا قالب اختیار کیا تھا وہی قتل کیا گیا"۔

اگرچہ حلاج کے اقتدار کا آغاز قرمطی داعی کی حیثیت سے ہوا مگر اس کی غیر معمولی کامیابی نے اسے ایک خاص فرقہ کی بنیاد ڈالنے کی جرأت دلائی۔ اس کے شعبدون اور سفسطون سے قطع نظر کرکے سولی چڑھنے کے وقت اس کی بیباکی، دلیری، صبر و سکون نے عوام کے دلون پر جو اثر ڈالا، اس کے قتل نے شہادت سے بڑھ کر

---

[1] حاشیہ صلۂ طبری۔

الوہیت کے جس درجہ پر اسے پہنچا دیا، پھر اس کے زندہ رہنے یا رجعت کے متعلق جو خیالات مشتہر کئے گئے، ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ الحلاجیہ ایک مذہب بن گیا، جس کے مخصوص عقائد یہ ہیں اور اس کی تصنیف کتاب الطاسین سے ماخوذ ہیں:۔

ع۱۔ فقہ اسلام میں حلاجیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ تمام فرائض اسلام روزہ نماز حج زکوٰۃ کا بدل دوسرے اعمال بھی ہو سکتے ہیں جن کو اسقاط الوسائط کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً حج کا بدل یہ عمل ہو سکتا ہے کہ کعبہ کی بجائے ایک صاف ستھری کوٹھری کے سامنے ارکان حج ادا کئے جائیں اور اس میں تین یتیموں کو نہلا کر نفیس کھانے عمدہ پوشاک اور نقد سے ان کی تواضع کیجائے۔

ع۲۔ کلام میں یہ عقیدہ تھا کہ ذات باری تعالیٰ تو طول و عرض وغیرہ ابعاد سے جو حدود مخلوقیت ہیں منزّہ ہے لہٰذا وہ ایک غیر مخلوق ذات، روح ناطقہ کے قائل تھے۔ یہ روح ناطقہ سالک یا ولی کی روح مخلوق سے مل جاتی ہے اس خلط کو حلول اللاھوت فی الناسوت کہتے ہیں۔ اس عالم میں ولی ذات باری تعالیٰ کا حقیقی شاہد بیہانتک کہ ھُوَ ھُوَ ہو جاتا ہے اور کلمہ انا الحق کے معنی یہی ہیں۔

ع۳۔ تصوف میں وہ مصائب کی رغبت اور ان پر صبر و رضا کے ذریعہ سے رضائے الٰہی کے ساتھ وصل کامل یا عین الجمع کے قائل تھے۔

یہ حالات ہم نے بہ ترتیب سوانح منصور کے ہمعصر اور قریب العصر مستند مورخین عریب بن سعد قرطبی متوفی ۳۲۷ھ، مولف صلہ طبری، مسعودی متوفی تقریباً ۳۵۰ھ ابن حوقل متوفی ۳۶۷ھ، ابن الندیم مولف الفہرست متوفی ۳۸۵ھ، ابن مسکویہ متوفی ۴۲۱ھ، ابو ریحان البیرونی مولف آثار الباقیہ متوفی ۴۴۰ھ کے بیانات سے

متفقط کئے ہیں۔ مگر ان مستند و مسلّم الثبوت مورخین اور نیز علمائے شریعت کے مقابلہ میں بعض صوفی مشرب انشار پردازوں اور شاعروں نے جو حلاج سے دو صدی اور تین صدی بعد ہوئے اس کی درویشی اور ولایت کے آوازہ سے ممالک شرقیہ کی فضا میں گونج پیدا کر رکھی ہے۔ یہاں تک کہ امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ نے بھی مشکوٰۃ الانوار میں حلاج کے ہفوات کی تاویل کر کے اس کو دائرۂ اسلام میں پناہ دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر مورخین مذکور کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے بھی خود حلاج کی تصانیف میں سے ایک کتاب الطواسین نے جو کسی یورپی مستشرق نے چھاپ کر شائع کی ہے اس کے عقائد، فلسفہ اور مذہب کو روز روشن کی طرح نمایاں کر کے تمام تاویلات رکیک کو باطل کر دیا ہے۔

شیخ فرید الدین عطار[۱] متوفی ۶۲۷ھ حلاج سے تین صدی بعد اسے شہید راہ حق، شہیر شیوۂ حقیقت، خدا رسیدہ اور ولی کامل قرار دیا ہے۔ اس کے کٹے ہوئے سر سے انا الحق کی آواز اور ازین قبیل مزخرافات منسوب کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے محضر پر حضرت جنید بغدادی سند دستخط کرتے ہوئے رو کر فرمایا کہ "میں جانتا ہوں حلاج کا کلمہ انا الحق حق ہے مگر قانون شریعت سے مجبور ہوں۔ عطار کی روایات صوفیہ اس مقدار میں اور اس وضع کی ہیں جو روایۃً و درایۃً ناقابل قبول ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی

---

[۱] شیخ عطار اپنی منطق الطیر اور تذکرۃ الاولیا میں سنی متصوف نظر آتے ہیں مگر اپنی آخری تصنیف مظہر العجائب میں متشدد شیعی معلوم ہوتے ہیں۔ علمائے سمرقند اس کتاب کے عقاید پر اس قدر برہم ہوئے کہ اسے جلوا دیا۔ عطار پر کفر کا فتوے صادر کیا اور واجب القتل قرار دیا۔ آخر وہ جلا وطن کئے گئے عوام نے جوشش غضب میں ان کے گھر کو اثاثہ سمیت آگ لگا دی۔

اور حضرت جنید بغدادی کی طرف وحدۃ الوجود کی آڑ میں جو کلمات کفر مثلاً انی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدونی سبحانی ما اعظم شانی وغیرہ منسوب ہیں وہ زیادہ تر شیخ عطار کی بے سند روایات پر مبنی ہیں۔ راقم کے خیال میں ان بزرگوں کا دامن تقدس ایسی آلودگیوں سے پاک ہے۔ حلاج کی ولایت بھی وحدت الوجود ہی کے اصول پر منوائی گئی ہے۔ مگر مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ "اس عہد تک صوفیوں میں مسئلہ وحدۃ الوجود پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ بعد کے تذکروں میں اس قسم کے چند فقرے لیس فی جبتی الا اللہ جو مذکور ہیں صحیح اسناد سے ان بزرگوں تک نہیں پہنچتے۔ کہا جاتا ہے کہ حلاج نے تصوف کی تعلیم حضرت جنید، امام ثوری اور حضرت تستری رحمہم اللہ سے پائی تھی۔ ان بزرگوں کے تذکرے تاریخ رجال میں موجود ہیں۔ اس قسم کا ایک حرف بھی ان کی زبان سے نہ سنا گیا"[1]

پھر ملا جامی متوفی ۸۹۸ھ نے نفحات الانس میں لاتعداد درویش صوفیہ اور انکے خوارق کی کہانیاں نقل کی ہیں۔ وہ ان کی دربار نشینی اور حکومت کی سرپرستی کی بدولت ان کی عامیانہ تصانیف کے ساتھ خاص و عام میں پھیل گئیں۔ ہرچند ان کو صحت و واقعیت سے کوئی لگاؤ نہیں پھر بھی عام متصوفین میں ان کو خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

یہاں تک ملاحدۂ عجم کے معتقدات میں تناسخ، حلول، رجعت، تشبیہ کو مشترک دیکھ کر ہمارے ناظر کو حلاج کے معتقدات زیادہ عجیب نہ معلوم ہونگے، اور تین صدی کے بعد اکثر متصوفین نے ان عقائد پر وحدۃ الوجود کا رنگ چڑھا دیا تو اس پر بھی تعجب ہونا چاہئے۔ اصل میں فلسفۂ وحدۃ الوجود کی روح بھی حلول ہی ہے۔ ظاہری شریعت کی رو سے

---

[1] معارف جلد ۴ نمبر ۲۔ بعنوان منصور حلاج۔ یہ اس پر از معلومات اور بصیرت افزا مضمون سے بھی استفادہ کیا۔

چھپنے سے نئے یہ ایک محفوظ نقاب اختیار کی گئی ہے۔ صوفیائے عجم کو اس برقع کے ایجاد وترویج کے سئے کسی خاتون اسشور کی حاجت نہ ہوئی۔ فلاطونی نما neo-Platonic فلسفہ جسے حکمت اشراق کہتے ہین اوائل سیمی صدی سے اسکندریہ مین پیدا ہوا۔ اور آغاز عہد اسلام مین یونان اور شام ومصر مین اس کے بہت سے حامی اور اس موضوع پر کثیر تصانیف موجود تھین۔ یہ لباس حلول کی پوشش کے لئے موزون نظر آیا اور پہنا دیا گیا۔

مسئلۂ وحدۃ الوجود یہ ہے کہ حقیقت صرف ایک ہے اور وہ ذات باری تعالے ہے۔ باقی جو کچھہ ہم دیکھتے ہین غیر حقیقی ہے، وہم وخواب ہے، اصل کا عکس ہے، جوہر کا عرض ہے، اس کی تشخصات وتعینات ہیں۔ یا دہی ہر چیز ہر صورت ہر قالب مین ہے۔ ذات مطلق ایک شخص یا مقام مین محدود نہین۔ ہر شخص اور ہر شے مین حلول ہے۔ گل ہو یا خار، ولی ونبی ہون یا سگ وخنزیر، موسیٰ ہون یا فرعون۔

زانکہ بیرنگی بقید رنگ شد

موسیٔ با موسیٔ در جنگ شد
(رومی)

اس دعویٔ کل مین عقیدۂ حلول ایک جزو کی حیثیت سے بہ آسانی سماجاتا ہے اور ہر قائل ہمہ اوست کو لازمی طور پر ایک طور کے حلول کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ فرق صرف جزو وکل کا رہ جاتا ہے۔

مسئلہ وحدۃ الوجود کی نوعیت خواہ کچھہ ہی ہو اور حلاج اس کا قائل ہو یا نہ ہو، شہادت تاریخی سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ وہ تصوف کی اصطلاحات اور صوفیون کی زبان استعمال کرتا تھا مگر اس کا کوئی ایک روپ نہ تھا۔ اثنا عشری شیعون مین

اثنا عشری اسبعی مین سبعی سنیون مین سنی، قرامطہ مین قرمطی۔ عریب ابن سعد قرطبی ابن مسکویہ اور ابن الندیم بالاتفاق اسے قرامطہ کا داعی بتاتے ہین۔ بقول علامہ ابن جوزی جب یہ سوسن سے گرفتار کرکے بغداد پہونچایا جا رہا تھا تو ایک منادی منادی کرتا جاتا تھا۔ ھذا احد دعاۃ القرامطۃ فاعرفوہ لوگو یہ قرمطیون کا ایک داعی ہے اسے پہچان لو۔ اس زمانہ مین قرامطہ (باطنیون) کا زور و شور تھا۔ ان کے داعی عموماً درویشی کی سیاہ کملی مین جوہر رنگ کی پردہ پوش ہے، پھرا کرتے جس مذہب کا شکار مل گیا اسی کا سا رنگ بھر کر رسوم و کنایات سے اپنا ہم عقیدہ کر لیتے یہان تک کہ اس کو تسخیر بنا کر باطنیت کے مذہب پر لے آتے اسے حکومت کا خونخوار دشمن بنا دیتے اور مذہب کے رنگ مین سیاسی خونریزی تک پر آمادہ کر لیتے جیسا کہ غلاۃ کے بیان مین آئندہ ابواب مین بالتفصیل واضح ہوگا۔ بقول علامہ طنطاوی جوہری غوث۔ قطب۔ اوتاد۔ ابدال دراصل باطنی دعاۃ ہی کے مختلف مدارج کے لقب تھے۔ صوفیون نے یہی اصطلاحات اپنے طبقات درویشی کی تعبیر کے لئے اخذ کر لین۔ عقائد مین سے بھی دنیا جہان کا کون سا عقیدہ ہے جن کے کچھ نہ کچھ اجزا معجون تصوف عام مین شامل نہین۔

سبب قتل۔

صوفیا نے غالباً علمائے شریعت کے فتوے کے لحاظ سے حلاج کے قتل کو ایک مومن کے قتل عمد سے تو تعبیر کرنے کی جرأت نہین کی پھر بھی اسے بے قصور قرار دیا ہے اس کا دعوئے انالحق حق مان کر خطا صرف اتنی بتائی جاتی ہے کہ وہ راز معرفت جس کو ضبط کرنا اور مخفی رکھنا عارف کا فرض ہے اس نے افشا کر دیا اور عرفان کی ایک یا لغو منزل تجلی کی تاب نہ لا سکا۔ عقیدہ وحدۃ الوجود بجائے خود جوہر توحید ہو یا کفر و الحاد قتل حلاج

سکے واقعات تاریخی میں صوفیا کی اس تاویل کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ ایک طرف حلاج سے تین صدی بعد کے متصوف انشا پرداز اس کا سبب قتل صرف بانگ انا الحق بتاتے ہیں جس کی صوفیانہ تاویل اس کی معصومی اور معرفت و ولایت کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف حلاج کے معاصر اور قریب العصر مورخین و علمائے دین اس کے عقائد و اعمال کی جو تفصیل کرتے ہیں وہ کسی تاویل سے حلاج کے دامن سے داغ الحاد و کفر کو مٹا نہیں سکتی۔ پس اگر تاریخی شہادتوں سے آنکھ بند کر لی جائے اور اس عصر کے مورخین و علما کو غیر معتبر سمجھ کر ان کے کلام کو لغو قرار دیا جا سکے تو حلاج ولی کامل تھا ورنہ بقول علمائے عصر وہ کافر خبیث تھا۔

ذیل میں ہم حلاج کے معاصر اور قریب العصر مورخین کے صرف وہ اقوال نقل کرتے ہیں جن کا تعلق اس کے عقائد و اعمال دینیہ سے ہے۔

(۱) **عریب بن سعد**۔ قرطبی متوفی ۳۲۲ھ جو حلاج کے معاصر تھے صلۂ طبری میں فرماتے ہیں۔

كان الحلاج مخرقا رجلا غويا خبيثا	حلاج ایک گمراہ اور خبیث شخص تھا۔ شہر شہر
ينتقل في البلدان ويموه على الجهال	پھرتا اور جاہلوں کو فریب دیتا۔ بعض لوگوں
ويُري قوما أنه يدعو إلى الرضا	سے کہتا کہ میں آل رسولؐ امام رضا کا داعی
من آل محمد ويظهر انه سُنّي من اهل	ہوں سنیوں کے آگے اپنے تسنن شیعوں سے
السنة وشيعي لمن كان مذهبه التشيع	اپنے تشیع اور معتزلہ سے اعتزال کا اظہار
ومعتزلي لمن كان مذهبه الاعتزال۔	کرتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑا چابک دست
وكان مع ذالك خفيف الحركات	شعبدہ باز بھی تھا طب کا دعوے اور کیمیا کا
شعوذيا قد حاول الطب وجرب	تجربہ رکھتا۔ برابر اپنے جادو کا کرتب

الکیمیاء فلم یزل یستعمل المخاریق حتی استوی بہا من استحصیل عندہ ثم ادعی الربوبیۃ وقال بالحلول و عظم افترائہ علی اللّٰہ عز وجل و رسلہ و وجدت لہ کتب فیہا حماقات وکلام مقلوب وکفر عظیم وکان فی بعض کتبہ انی المغرق قوم نوح و المہلک لعاد وثمود۔ وکان یقول لاصحابہ انت نوح وانت موسیٰ ومحمد قد اعدت ارواحہا الی اجسامہم[1]

دکھایا کرتا اور اس طرح ناواقفون کو اپنا گرویدہ کرلیتا۔ پھر خدائی کا دعوے کیا اللہ اور اس کے رسولون کی طرف جھوٹی باتین منسوب کین۔ اس کے پاس سے کتابین نکلین جو حماقتون، الٹی سیدہی باتون اور کفر عظیم پر مشتمل تھین۔ اس کی بعض کتابون مین تحریر تھا کہ قوم نوح کو ڈبونے والا اور عاد وثمود کو ہلاک کرنے والا مین ہی ہون۔ اپنے رفیقون سے کہتا تو نوح ہے، تو موسیٰ ہے، تو محمد ہے۔ انکی روحین مینے تمہارے بدنون مین منتقل کردی ہین۔

(۲) مشہور سیاح وجغرافیہ ابن حوقل جو حلاج کے مقتل (بغداد) ہی کا متوطن تھا اور چوتھی صدی ہجری کے وسط مین وفات پائی۔ اپنے سفرنامہ مین لکھتا ہے:-

کان الحلاج ینتحل النسک والتصوف فما زال یرتقی بہ طبقا عن طبق حتی انتہی بہ الحال الی ان زعم ان من ھذب فی الطاعۃ جسمہ و شغل بالاعمال الصالحۃ قلبہ وصبر

حلاج زہد وعبادت اور تصوف کا مدعی تھا۔ اس ادعا سے درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے یہان تک پہنچا کہ کہنے لگا جو شخص اپنے جسم کو طاعت الٰہی سے درست کرے، دل کو نیک اعمال مین مصروف رکھے لذات دنیاوی سے

---

[1] طبری مطبوعہ مصر صفحہ ۱۵۔

علی مفارقة اللذات و ملک نفسه منعها عن الشهوات ارتقی الی مقام المقربین و منازل الملائکة الکرام الکاتبین ثم لایزال یتردد فی درجة المصافات حتی یصفو عن البشریة طبعه فاذا لم یبق فیه من البشریة نصیب حل فیه روح الله الذی کان منه کعیسی بن مریم فیصیر مطاعًا لا یرید شیئًا الاکان من جمیع ما کان ینفذ فیه امر الله تعالٰی وان جمیع افعاله حینئذ فعل الله تعالٰی وامره۔ وکان یتعاطی لهذا ویدعوا الی نفسه بتحقیق ذالک کله۔

منہ موڑے اور ترک شہوات سے اپنے نفس پر قابو پائے وہ مقربین حق اور کراماً کاتبین فرشتون کے مدارج تک جا پہنچتا ہے۔ پھر صفائی بڑھتے بڑھتے یہان تک پہونچ جاتی ہے کہ اس کی طبیعت بشریت سے پاک ہوجاتی ہے۔ آخر جب بشریت کا کوئی حصہ اس مین باقی نہین رہ جاتا تو اس مین خدائے تعالٰی کی روح حلول کرجاتی ہے جیسے عیسی بن مریم مین حلول کرگئی تھی اس وقت سب اسکے تابع فرمان ہوجاتے ہین اور جہانتک خدا کا حکم نافذ ہوتا ہے وہان تک یہ بھی جو چاہتا ہے ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس کے کل افعال اللہ تعالٰی کے افعال اور حکم ہوتے ہین۔ وہ یہی کرتا تھا اور مدعی تھا کہ یہ سارے مدارج اس کو حاصل ہوچکے۔

---

(۳) ابن الندیم۔

متوفی ۳۸۵ھ بھی بغدادہی کا متوطن تھا۔ الفہرست مین صرف ایک واسطہ سے روایت کرتا ہے۔

سلہ مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۱۰۔

الحلاج كان رجلا محتالا مشعبذا
يتعاطى مذاهب الصوفية يتحلى
الفاظهم ويدعي كل علم وكان
صفرا من ذالك، وكان يعلم شيئا
من صناعة الكيميا ....
وكان جاهلا مقدما متهورا
جسورا على السلاطين مرتكبا للعظائم يروم اقلاب الدول
ويدعي عند اصحابه الالوهية
ويقول بالحلول ويظهر مذاهب
الشيعة للملوك ومذاهب الصوفية
للعامة۔ وفي تضاعيف ذالك
يدعي ان الالهية قد حلت فيه
وانه هو تعالى جل وتقدس عما
يقول هؤلاء علوا كبيرا۔

حلاج ایک حیلہ گر شعبدہ باز شخص تھا۔
بظاہر صوفیہ کے طریقے اختیار کر رکھے تھے
انھین کی زبان بولتا اور ہر علم کا دعوےٰ
رکھتا تھا۔ حالانکہ وہ کل علوم سے معرا تھا
کچھ کیمیا کے کرتب جانتا تھا۔.........
جاہل، دلیر، زمانہ ساز، پادشاہون اور امیرون
تک پر جرأت کر جاتا اور بڑے بڑے کام
کر بیٹھتا۔ سلطنتون کو الٹ دینا چاہتا۔ اپنے
یارون کے نزدیک خدائی کا دعوےٰ کرتا۔
حلول کا قائل تھا۔ پادشاہون سے اپنا
مذہب شیعی اور عوام سے تصوف ظاہر کرتا
اور سب پر مستزاد یہ ادعا تھا کہ خدائی مجھ
مین حلول کر گئی ہے اور مین خود خدا تعالےٰ
ہون (نعوذ باللہ من ذالک) وہ اس بکواس
سے کہین اعلیٰ و ارفع ہے۔

اس کے بعد حلاج کے شعبدے اور وہ واقعات ہین جو اوپر مذکور ہوئے۔ ابن الندیم نے اس کی ۴۶ تصنیفین گنوائی ہین جن مین سے ایک کتاب الطاسین فی المحال[1] یورپ مین

[1] یہ کتاب فرانس سے شایع ہوئی ہے۔ اس مین اس "خدائیت" کے مدعی نے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت علیؓ کی مرموز مدح کی ہے۔ پھر اپنی نسبت تصریح کی ہے کہ مد استادی فرعون و ابلیس" دیکھو صفحہ ۱۷۵

ہاتھ آئی ہے۔ اس سے اس کے تمام ملحدانہ عقائد و دعاوے الوہیت کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۴) ابن مسکویہ متوفی ۴۲۱ھ نے ابن الندیم اور عریب قرطبی کے بیانات کی تکرار کے بعد اتنا اضافہ کیا ہے کہ "عوام پر اس نے جادو کیا تھا اور وہ معتقد تھے کہ حلاج مردوں کو زندہ کر سکتا ہے، وہ جو کچھ چاہے اس کے موکل حاضر کر سکتے ہیں اور انبیائے سلف کے تمام معجزے دکھا سکتا ہے۔ تین شخص ایک السمری، ایک ہاشمی، اور ایک کاتب اس کے نبی تھے اور وہ خود خدا بنا تھا۔ یہ لوگ گرفتار کر کے حامد کے پاس لائے گئے تو انھوں نے شہادت دی کہ ہم دین حلاجیہ کے مبلغ ہیں اور حلاج کو خدا مانتے ہیں جو مردہ زندہ کر سکتا ہے"

اس کے بعد اس کے شعبدوں کی تفصیل ہے منجملہ اور ہفوات کے اس کا ایک کفر عامہ نے اس کی ایک تصنیف میں یہ پایا کہ فریضہ حج کا عوض دوسرے اعمال ہو سکتے ہیں جن کی تفصیل اوپر گذر چکی۔ یہ اور اس کے ساتھ اور خرافات کی سند میں اس نے حضرت حسن بصری کی ایک تصنیف کا نام لیا مگر یہ صریح افترا ثابت ہوا اور قاضی نے قتل کا فتویٰ صادر کیا اور جمہور علماء نے کفر کے فتوے پر دستخط کر دئے۔

(۵) ابو ریحان البیرونی متوفی ۴۴۰ھ آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ میں حلاج کی نسبت لکھتا ہے[1]۔

بقیہ صفحہ ۱۷۴۔

اس شاگرد رشید نے اپنے ان اساتذہ کی تعریف ہی کی ہے۔ جنکو قرآن نے بالتصریح ملعون ٹھرا دیا ہے۔ اس سے اس کی عمیق جہالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ باقی اس کتاب کا بڑا حصہ لایعنی اور محض مجنونانہ ہذیان ہے۔ اسلم جیراجپوری۔

---

[1] مطبوعہ لیپزک باب ۸۔

یہ ایک صوفی مشرب آدمی تھا۔ پہلے مہدی بنا۔ شعبدہ اور فریب خوب جانتا تھا۔ ہر مذہب اور فرقہ کے آدمیون کے سامنے انھین کا ہم عقیدہ بن جاتا۔ پھر اس نے دعوے کیا کہ مجھ مین خدا کی روح حلول ہے۔ اور اپنے کو خدا کہتا۔ خطوط مین اپنے مریدون کو لکھتا "از خداے ازلی بہ بندۂ فلان" اس کے مرید اسے یون خطاب کرتے "اے وہ ذات جو ہر عہد مین مختلف قالبون مین جلوہ نما ہوتی ہے اور اب حسین بن منصور کی شکل مین ہے" .... اس وقت تک اس کے مذہب کے پیرو موجود ہین۔

(۶) ابن اثیر صاحب الکامل۔ (۷) کتاب العیون (۸) الفخری نے کم وبیش مورخین بالا کے بیان کی تکرار کی ہے۔

(۹) مسعودی بھی حلاج کا معاصر ہے۔ اور بانیان مذاہب پر اس نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس مین حلاج کے عقائد اور سوانح پر مفصل بحث ہے مگر یہ تصنیف نایاب ہے کتاب التنبیہ مین اس کی نسبت مجملاً جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی سبب قتل نمایان ہے۔ قتل کی تاریخ کے بعد وہ سبب یہ بتاتا ہے[۱]:-

لمقالات حکیت عنہ فی الدیانۃ۔ کثر متبعوہ علیہا والمنقادون الیہا وکان یظہر التصوف والتالہ۔	قتل کا سبب یہ تھا کہ دین مین اس کی طرف سے بہت سی باتین نقل کی گئین ان باتون مین بہت لوگ اس کے پیرو ہوگئے اور مرید بنگئے بظاہر وہ تصوف اور خدا پرستی کا اظہار کرتا تھا

[۱] کتاب التنبیہ صفحہ ۳۸۷۔

(۱۰) طبقہ آئمہ وعلمائے دین مین علامہ ابن جوزی اسے قرمطی داعی بتاتے ہین۔

(۱۱) امام الحرمین کی کتاب الشامل سے ابن خلکان نے نقل کیا ہے کہ یہ ان لوگون مین تھا جنہون نے سلطنتون کو برباد کرنے اور حکومتون مین انقلاب پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔

(۱۲) علامہ ذہبی نے اپنی تاریخ مین حلاج کا جو مختصر حال لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :۔

"پہلے یہ شخص حضرت جنید بغدادی، عمر بن عثمان کی اور دوسرے مشائخ کے حلقہ میں شریک ہو کر عبادت و ریاضت مین مصروف ہا مگر حب جاہ اور رسوا ہو کر رفعت واقتدار سے گمراہ ہو کر احاطۂ دین سے نکل گیا" علامہ ذہبی نے کوئی پچیس مستند علما کی سند سے ثابت کیا ہے کہ حلاج کا فر خبیث" تھا۔

ان زبردست سندون سے حلاج کا سبب قتل نہ عقیدہ وحدۃ الوجود ظاہر ہوتا ہے نہ مجرد کلمہ انا الحق پھر مسئلہ وحدۃ الوجود کے بہانے سے اس کی برات ذمہ کیونکر ممکن ہے؟ اسلام کے قریب قریب ہر طبقہ و فرقہ کے ائمہ و علمائے کبار نے اس کی تکفیر کی ہے

(۱) فقہائے ظاہریہ مین ابن داؤد اور ابن حزم نے،

(۲) فقہائے مالکیہ مین طرطوشی، عیاض اور ابن خلدون نے،

(۳) فقہائے حنبلیہ مین ابن تیمیہ نے،

(۴) فقہائے شافعیہ مین جوینی اور ذہبی نے،

(۵) متکلمین معتزلہ مین جبائی اور قزوینی نے،

(۶) متکلمین اشاعرہ مین باقلانی نے،

(۷) صوفیہ مین عمرو مکی اور تمام متقدمین صوفیہ نے باستثنائے ابن عطا شبلی عمر بن فارس،

حلاج کے متعلق مستشرقین یورپ کی رائین اور ان کا اختلاف بھی دلچسپی سے خالی نہین۔ اسے سولر اسے چھپا ہوا عیسائی اور ڈی ہربلوٹ قرار دیتے ہین۔ ریسکے اسے کفرگو، تھوک ایک سفطی عیار سخن باف سکرمر ایک موحد دہری یعنی کسی واحد مادہ سے خلقت کائنات کا قائل، کاز مرسکی ایک مریض اعصابی یعنی سٹری سودائی اور بروون ایک خطرناک اور چالاک سازشی بتاتے ہین۔

یہ ہے حقیقت اس منصور حلاج کی جس کی شان مین آج تک مجالس سماع مین مزے لے لے کر گایا جاتا اور سر دھنے جاتے ہین۔

"منصور کے پردے مین خدا بول رہا ہے"

ازین قبیل ہزارون شعر ہین جن کی بدولت آج تک بیشتر حلقۂ متصوفین اور عوام مین حلاج کی الوہیت کا ڈنکا بج رہا ہے۔

چہ خندہاست کہ بر دین ما زند ہم کفر!

عربی شاعری کی ابتدا

(بسلسلہ اسبق)

اگر ہم نثر کے متعلق بحث کرتے ہوتے تو یہ تسلیم کر لینا ممکن بھی تھا کہ یا تو انکا ترجمہ ہوگیا ہے یا زبان مین درجہ بدرجہ جو تبدیلیان ہوئی ہین انکا اثر ان نوشتون پر بھی پڑا ہے بالکل اسی طرح جیسے رسم الخط کی تبدیلی سے آہستہ آہستہ چھپنا ہوئی کتابون کی صورت مین بھی ایک قسم کی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ اور اس سے کوئی نتیجہ مقصود نہین ہوتی۔ لیکن عربی نظم مین جسکا طرز دنیا کی تمام نظمون سے زیادہ پیچیدہ ہے یہ تدریجی ترقی بالکل ناممکن ہے اس لئے کہ نظمون کو ایک نئے قالب مین ڈھالنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ بھی قابل توجہ ہے کہ جس طرح ان لوگون نے جو مسلمان ہوگئے اپنے پرانے مذہب کو ایسا فراموش کیا کہ بعد کے مسلمانون سے زیادہ تو قرآن ہی مین اس کے متعلق معلومات موجود ہین۔ اسی طرح عرب کے لوگون نے اپنی پرانی زبان اور بول چال کو بھی بھلا دیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ پرانی کتبون کے سمجھنے کے لئے صرف دو مصنفون سے مدد ملتی ہے اور وہ بھی بقول پروفیسر ہارٹمین خبطی ہین۔ اس لئے اگر جاہلی نظمون مین اسلامی خیالات کا وجود ان کے جعلی ہونے کی دلیل ہے۔ تو انکا اس زبان مین ہونا بھی جو قرآن کی وجہ سے ادبی زبان بنی ہے انہین کافی مشتبہ بنا دیتا ہے۔

یہ ناممکن نہین ہے کہ حجاز کی زبان کو حیرہ مین درباری زبان کا درجہ حاصل رہا ہو۔ لیکن اس کے لئے کوئی دلیل بجز ان نام نہاد قدیم نظمون کے موجود نہین ہے ایسی حالت مین کہ ان مقامات کے درمیان ایک عظیم الشان ریگستان حائل ہے۔ مسلمان ادیب جو عرب کے

مختلف حصّون کے اشعار کو ایک ہی زبان مین پیش کرتے ہین وہ گویا اس دستور کے حرف بہ حرف مطابقت کرتے ہین جس کی بنا پر انھون نے تمام شاعرون کو ایک ہی خدا کا پرستار بنا دیا ہے۔ یعنی یہ کہ جو خصوصیات انھون نے اپنے زمانے مین دیکھین اُن کو زمانہ ماضی کے لئے بھی ضروری سمجھ لیا۔ قریب قریب یہی حالت ان نظمون کے جغرافیہ کی ہے۔

عمرو بن کلثوم جو صاحب معلقہ ہے کہتا ہے کہ مین نے بعلبک۔ دمشق اور قاصرین مین شراب کے جام نوش کئے ہین اور جس شراب کی تمنا کرتا ہے وہ اندرین کی ہے۔ موخرالذکر دو مقامات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حلب کے قریب واقع ہین۔ اس مین شک نہین کہ ڈیڑھ سو سال مین جو اس کی عمر کے، (لوگون کے بیان کے مطابق) اس دنیا مین گذرے ہین اسے سیر و سیاحت کے کافی مواقع حاصل تھے۔ لیکن ان مقامات سے واقفیت اور ساتھ ہی ساتھ عرب کے مختلف قبائل اور دیہاتون سے آگاہی صاف صاف اس زمانہ کا پتہ دیتی ہے جب اسلامی سلطنت شام اور عرب کے چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی تھی نہ کہ اس طوائف الملوکی کی حالت کا جس مین سنہ ۵۰۰ء کے قریب عرب مبتلا تھا۔

تیسری شہادت ان قصائد کے مضامین کے اندر پوشیدہ ہے۔ اگر ہر قصیدہ تشبیب سے شروع ہوتا ہے اس لئے کہ قرآن کہتا ہے کہ شعرا ہر وادی مین مارے مارے پھرتے ہین۔ اگر وہ اس کے بعد اپنے سفر اور اپنی سواریون کا بیان شروع کر دیتے ہین۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق شاعرون کی پیروی گمراہ لوگ ہی کرتے ہین جس کے معنی صاف صاف یہ ہین کہ وہ خود بھی گم کردہ راہ ہین۔ اور اگر وہ عام طور پر اپنے کارنامون کی داستانین چھیڑ دیتے ہین جنمین سے اکثر کا اطلاق

پہلو مرکوز ہوتا ہے کیونکہ قرآن میں آیا ہے کہ شعرا کہتے بہت ہیں اور کرتے کچھ نہیں تو کم از کم ہم اس یکسانیت کے ماخذ تک تو ضرور پہونچ سکتے ہیں اور یہی وہ یکسانیت تھی جس نے بعض ناقدین شعر سے کہلا دیا کہ قصائد میں نقد کا معیار صرف زبان ہے اس لئے کہ مضامین تو سب میں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سانچے میں ڈھلا ہوا طرز۔ واقعی نزول قرآن سے پہلے کا ہے تو ہمیں ایک سلسلہ نمونہ کی تلاش کرنی چاہئے اور یہ کوشش جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ہمیں حضرت آدم تک پہونچا دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان قصائد سے گھوڑے اور اونٹ کی تشریح الابدان کے متعلق حیرت انگیز معلومات کا اظہار ہوتا ہے اور بعض دوسرے حیوانوں کی خصوصیات کا علم بھی نمایاں ہے لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان علوم کا مطالعہ صرف شعرا ہی نہیں کرتے تھے بلکہ نحوی اور ادیب بھی کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ کسی بڑے شاعر نے کسی قصیدہ کی ابتدا اپنی محبوبہ کے کھنڈروں پر ماتم کرنے سے کی ہو یا اس کی خیالی تصویر سے گفتگو شروع کر دی ہو اس کے بعد اپنے اونٹ اور گھوڑے کی کیفیت بیان کرنے لگا ہو۔ لیکن کم از کم ہم کوئی ایسا نمونہ نہیں پیش کر سکتے جس پر تعلیم کی بنیاد رہی ہو اور ہر شاعر کے لئے اسی طرز پر خامہ فرسائی کرنی لازمی سمجھی جاتی رہی ہو۔ اگر کوئی ایسا مسلمہ نمونہ موجود ہوتا تو یقینی طور پر قرآن نے اس سے حجت پکڑی ہوتی اس لئے کہ وہ ایک مستند ذریعہ اس زمانہ کے خیالات کے پرکھنے کا ہوا ہوگا۔ کہ اس پر حضرت رسالت کے ماخوذ ہونیکا الزام لگایا جاتا لیکن کم از کم یہ ہرگز نہ کہا جا سکتا کہ لوگوں کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے جسے وہ پڑھ سکیں۔

جو نظمیں قدیم شاعروں کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان کا اکثر حصہ آپ بیتی کہا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ وہ خود شعرا کے تجربات کی یادگار ہیں ایسے تجربات جنھیں خود انھیں یا زیادہ تر

سے زیادہ ان کے قبیلہ کے چند اور آدمیوں کو دلچسپی ہوسکتی تھی۔ اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ایک عرب جو اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے یا اونٹون کو لوٹ لے جاتا ہے یا کسی دشمن کو قتل کر دیتا ہے اس مین ان مضامین پر اشعار کہنے کی صلاحیت موجود ہوسکتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر کئی آدمی ایک واقعہ مین شامل رہے ہون تو ان مین سے ہر ایک اسی طرح اپنے تجربات بیان کرے لیکن "ہوریس" کا خیال بالکل صحیح ہے کہ اس قسم کے کلام کو تحریری صورت مین ہونا چاہئے ورنہ انکے محفوظ رہنے کا امکان بہت کم ہے جیسا ہر بین آثار قدیمہ ایسی نظمین پیش کرتے ہین جو مکالمہ یا محادثہ کی صورت مین ہوتی ہین یعنی ایک سلسلہ ہوتا ہے جسمین ایک شاعر دوسرے شاعر کا جواب دیتا ہے تو بہت زیادہ امکان ہے کہ سب کا سب ایک فسانہ ہو۔ اس لئے کہ ایک شاعر سے یہ توقع رکھنی کہ وہ اپنے حریف کے کلام کو محفوظ رکھنے کی بھی پوری کوشش کریگا۔ خود ہماری زیادتی ہوگی۔ اس طرح ایک فریق ثالث کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم یہ فرض کرلین کہ یہ ایک دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ تو اس مین یہ دقت بھی پیش نہین آتی اور یہ ایسی بات بھی ہوگی جسکی مثالین بہت مل سکتی ہین۔

اس خیال کو اور تقویت ہوتی ہے جب نظمون کے ساتھ ایسے واقعات بیان کئے جاتے ہین جو تجربہ کے سراسر خلاف ہین۔ مثلاً صاحب آغانی ایک جگہہ چند ایسے اشعار پیش کرتا ہے جو نابغہ جعدی۔ العجاج اور اخطل کی شاعرانہ چشمکون کا نتیجہ ہین[۱] اور اس سے یہ اندازہ کرتا ہے کہ نابغہ کی عمر اسوقت تقریباً ۲۲۰ برس کی رہی ہوگی اور لطف یہ کہ "اس نتیجہ سے مطمئن ہے دوسرون نے اسے ۱۸۰ برس تک پہونچایا ہے

[۱] آغانی (۴۔ ۱۲۹)

لیکن چونکہ یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس عمر کو وہ رسول عربی کے زمانہ ہی میں پہونچ چکا تھا اس لئے یہ دوسری روایت قابل اعتبار نہیں سمجھی گئی ہم جب ہومر اور ہیسیوڈ کے شاعرانہ مقابلہ کا بیان پڑھتے ہیں تو ہمیں تاریخی حیثیت سے اسے جانچنے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ خیالی افسانے ہیں۔ لیکن اگر وہی شخص جو اس قصہ کو واقعہ کی صورت میں بیان کرتا ہے شعرا کی تاریخ کے متعلق بھی مستند سمجھا جاتا ہو تو ہم جسقدر بھی شبہہ کریں بیجا نہ ہوگا۔

یہ تو ایک مثال ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی ایسے واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں ہم اغانی کے ان بیانات کو خوشی سے ماننے کے لئے تیار رہیں جنکی بنیاد تحریری سرمایہ پر ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے پاس وہ مجموعہ موجود ہوتا جو خلیفہ مہدی کے حکم سے تیار ہوا تھا تو ہم یہ بھی یقین کر لیتے کہ ۱۵۰ھ تک یہ اشعار موجود رہے ہونگے۔ اور اگر جامع کی صداقت اور قوت نقد یقینی ہوتی اور وہ یہ بیان بھی کرتا کہ اس نے قدیم تحریروں سے یہ مجموعہ تیار کیا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کر لینے سے بھی کوئی عذر نہ ہوتا۔ لیکن ایک طرف تو سنجیدگی اور صداقت دونوں ناپید ہیں۔ اور دوسری طرف ہمارے سامنے طرح طرح کی مضحکہ خیز روائتیں ہیں جنمیں کہیں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں شاعر کی عمر سوا دو سو برس کی تھی اور کہیں کہا جاتا ہے کہ اشعار کے مجموعے محلون کے اندر مدفون تھے یا بڑے بڑے ڈھانچ دستیاب ہوئے تھے جنکے سرون پر اشعار کندہ تھے۔ ایسی حالت میں اگر ہم ان سارے بیانات کو محض جعل کہکر رد کر دیں تو ہمارا کیا قصور ہے۔ اور اگر تحریری مواد کے غیر موجودگی میں ہمارے مولفین صرف زبانی روایتوں پر اعتماد کرتے ہیں اور زبانی روائتیں بھی اس زمانہ کی جبکہ یہ کوشش رہی ہو کہ جو کچھ یاد ہے وہ بھی

اگر ممکن ہو تو بھلا دیا جائے تم یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ان کے بیانات کسی طرح بھی قابل اعتبار نہیں ہیں۔

اگر واقعی اسلام سے پہلے کی عربی شاعری خارجی اور داخلی شہادتوں کی بنا پر مشتبہ ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی ابتدا کب سے ہوئی۔ کیا یہ بہت قدیم ہے اگرچہ جو نمونے ہمارے پاس ہیں وہ اکثر اسلامی ہیں۔ یا یہ کہ اس کی ابتدا عہد اسلامی ہی میں ہوئی ہے اور قرآن کے طرز نے ترقی کر کے یہ صورت اختیار کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال ہے بہت مشکل! ایک طرف تو تسلسل اور تواتر ہے۔ اموی شاعر ان شاعروں کے بعد رونما ہوتے ہیں۔ جو رسول یا خلفائے راشدین کے عہد میں تھے اور وہ خود جاہل شاعروں کے پیرو ہیں۔ بعض قدیم دواوین تو جنمیں سے ایک حسان بن ثابت (ثناخوان رسول) کا بھی ہے۔ بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں لیکن اموی شاعروں کے کلام کی اصلیت سے انکار کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کی بعض اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے مثل الفاظ و محاورے عہد عتیق میں بھی ملتے ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ عرب شعر کہا کرتے تھے۔ یہ البتہ یقینی نہیں ہے کہ ہمارے پاس ایسے اشعار موجود بھی ہیں جو عہد اسلام سے پہلے کے ہیں۔

دوسری طرف اوّل تو کتبوں میں اشعار کا نام ونشان نہیں ہے اور دوم یہ کہ قرآن میں کہیں موسیقی کا تذکرہ آتا ہی نہیں۔ ڈاکٹر اسٹینٹن کی "فہرس القرآن" میں جو بہت کارآمد ثابت ہو چکی ہے لفظ موسیقی یا گانا ہمیں کہیں نہیں ملا۔ رتّل جو قرآن میں آیا ہے اس کے معنی راگ سے گانے یا بھجن گانے کے تو ہو ہی نہیں سکتے اس لئے کہ وہ خدا کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ غالباً اس سے مراد ترتیب دینا ہے۔ زبور کے

لئے سریانی یایونانی زبان مین جونام ہین ان کے معنی ہین" ایسے الفاظ جو کسی باجے کے ساتھ گائے جائین لیکن قران مین ان کو صرف "زبور" سے یاد کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کتابین یا اقوال کتاب الاغانی سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانون کے یہان موسیقی کا رواج بنی امیہ کے عہد مین ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص نے جسکا نام "ابن سریج" تھا ۶۵ھ کے قریب بربطیہ "اور ارسطوچسیہ" کو یونان سے لاکر عرب مین رائج کیا خود اس کے دل مین موسیقی کے مطالعہ کا خیال اس لئے پیدا ہوا کہ اس نے چند ایرانی مزدورون کو جو کعبہ کی دوبارہ تعمیر کے سلسلہ مین (جو اسی سال عمل مین آئی تھی) کام کر رہے تھے کچھ گنگناتے ہوئے سنا تھا۔ تقریباً انہی دنون مین ایک مغنیہ نے جسکا نام "رائقہ" تھا مدینہ مین پہلی بار گانا شروع کیا۔ لیکن اس کے علاوہ دوسرے دعویدار بھی موجود ہین۔ بربط تو صاف ہے لیکن دوسرا لفظ سمجھ مین نہین آتا بسٹر فارمر جو ان معاملات مین بہت مستند آدمی ہین کہتے ہین کہ اس سے "ارسطوکسینس" کا طریقہ مراد ہے۔

آغانی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قران مین موسیقی کا تذکرہ نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ باوجودیکہ بعض اقوام مین یہ عبادت عامہ کے لوازمات سے سمجھی جاتی ہے اور ہمارا خیال تھا کہ مسلمانون کی جیسی سپاہیانہ قوم کے لئے اس کی وہ اہمیت ضرور محسوس کی گئی ہوگی جو اسے میدان جنگ مین حاصل ہے لیکن۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ عرب مین موسیقی کی ابتدا عہد اموی مین ہوئی ہے تو ہم یہ کس طرح باور کرین کہ اس سے مدتون پہلے انکے پاس ایسی بحرین موجود تھین جو موزونیت اور وسعت مین اپنی مثال آپ ہی ہین۔ زیادہ مناسب ترتیب تو یہ معلوم ہوتی ہے۔ رقص۔ موسیقی۔ شعر۔ اور

سلہ آغانی (۳-۸۴)

شعر کو موسیقی سے الگ ہونے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے ۔ بعض عربی بحرین رقص کا پتہ دیتی ہین اور بعض نغمہ کا اور بعض ایسی ہین جنمین دونون کی جھلک موجود ہے ۔

قرآن مین سجع اور بحور دونون کا بالکل ابتدائی حالت مین ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اسی سے ترقی کر کے انھون نے موجودہ صورت اس زمانہ مین اختیار کی ہے جب موسیقی علمی اور عملی حیثیت سے مسلمانون مین رائج ہو گئی تھی اور اس کے بعد اس فن کا سلسلہ زمانہ قدیم سے ملانے کی کوشش کوئی خارج از قیاس بات نہین ہے ۔ قران کی زبان درباری زبان بنگئی تھی اور سلطنت کے باقاعدہ قیام کے بعد درباری شعرا کو وجود مین آنا ہی چاہئے تھا ۔ خلیفہ ثانی عباسی کے جو مدح مُمرای ورنوبہ ا نے کی ہے وہ بحر رجز مین ہے ۔ جسکا درجہ نظم اور نثر کے بیچ مین ہے ۔ اس سے پہلے گذر چکا ہے ۔ کہ ایک مشہور ماہر آثار قدیمہ کے بیان کے مطابق اسی شاعر کے باپ نے سب سے پہلے اس بحر مین جو سب سے کم صناعی کی محتاج ہے دو شعر سے زیادہ کہے تھے ۔ پھر سمجھہ مین نہین آتا کہ زیادہ مشکل بحرون مین طویل نظمین اس سے پہلے کیونکر موجود تھین ۔

خلفاے راشدین یا بنی امیہ کے عہد کے دواوین کی اصلیت سے بحث کرنا اس مضمون کے حدود سے باہر ہے ۔ لیکن اس مسئلہ کے متعلق جو شہادتین ہمارے سامنے ہین ان کی بنا پر تمام وہ شاعری جو اسلام سے پہلے کی کہی جاتی ہے بالکل مشتبہ ٹھیرتی ہے بلکہ غالبًا تمام وہ جو عہد اموی سے پہلے کی سمجھی جاتی ہے ۔ زمانہ جاہلیتہ کی وہ سلطنتین جنکا علم ہمین کتبون کے ذریعہ سے ہوا ہے بہت زیادہ متمدن معلوم ہوتی ہین لیکن ان کے یہان شاعری کا پتہ نہین چلتا تو پھر ہم یہ کس طرح یقین کرلین کہ غیر متمدن جنگلی عربون

ہین ایسی مکمل شاعری موجود تھی جیسی کہ مسلمان ماہرین آثار کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے بحیثیت مجموعی گمان غالب یہی ہے کہ شعر او نثر دونون بڑی حد تک قرآن ہی سے ماخوذ ہین اور اس سے پہلے اگر کوئی ادبی نمونے موجود تھے تو وہ صناعی مین قرآن سے کمتر تھے نہ کہ برتر۔

عرب کا عشیری شاعر، یونان کے دیہی شاعر سے بہت کچھ مشابہ ہے اور غالبًا اصلیت سے دونون کا تعلق بھی یکسان ہے۔ اکلینزیا سٹیکس (Ecclesiasticus) کے مصنف نے بلا ضرورت صاف بیانی سے کام لیکر کہا ہے (۳۸-۲۵)

وہ اسے عقل کہان نصیب رہا وہ شاعر کیونکر ہو سکتا ہے جسکے ہاتھ مین
ہل ہو اور جو پینا لے کر اتراتا ہو۔
جو بیلون کو ہنکاتا ہو اور انھین کے انتظام مین سراپا مشغول ہو۔
اور جس کی گفتگو سانڈون کے متعلق ہو"

تاہم رائے اسکی ٹھیک ہے۔"ورجل" یا "تھیوکرٹیس" کو چروا ہا یا گوالا کون سمجھتا ہے! صاف ظاہر ہے کہ ہین تو وہ عالم فاضل لیکن چروا ہون کے بھیس مین نمودار ہوتے ہین۔ اور یہی حال با لفاظ دیگر اصحاب معلقات کا بھی ہے۔ مثلاً طرفہ، ایک ذی علم آدمی معلوم ہوتا ہے۔ وہ رومی پلون کے متعلق جانتا ہے اسے دجلہ کی کشتیون کا علم ہے اور خلیج فارس یا بحر احمر کی جہاز رانی سے بھی واقف ہے۔ اگرچہ وہ ہجرت کے تقریبًا ستر برس پہلے مرگیا تھا۔ لیکن اپنے اشعار مین قرآن کا ایک محاورہ استعمال کر گیا ہے جسے بدقسمتی سے غلط سمجھا تھا۔

سورۃ النمل[1] مین آیا ہے کہ جب ملکہ سبا نے یہ گمان کر کے کہ سامنے حوض ہے اپنے پائنچے اٹھائے تو سلیمان نے کہا کہ یہ تو صرح ممرد ہے جو شیشے سے بنایا گیا ہے بعض مسلمانون کا خیال ہے کہ اس سے مراد ہے ایک مینار جو شیشے کے ٹکڑون کو بنایا گیا تھا لیکن یہان صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب ہے "مجلا و مصفا" جو سلیمان کے مغرورانہ شیش محل ہی کے لئے بولا جا سکتا ہے نہ کہ کسی معمولی محل کے لئے۔ چنانچہ جب طرفہ اپنے اونٹ کی ٹانگون کی تشبیہ "صفیح ممرد" کے پھاٹک سے دیتا ہے تو یہ خیال کسی طرح بھی دور نہین کیا جا سکتا کہ اس کے ذہن مین قران کی وہ آیت ہے جسمین لفظ ممرد سلیمان کے محل کے لئے بولا گیا ہے۔ اس طرح قران بھی اس کے مطالعہ مین داخل ہے۔ حالانکہ یہ کتاب نام نہاد "طرفہ" کی موت کے تقریبا ساٹھ برس بعد نازل ہوئی ہے۔ یہی مثال عمرو بن کلثوم کی "دنیا" کی بھی ہے۔ اس کی تاریخ وفات سنہ ۶۰۰ء بتلائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی اس لفظ سے واقفیت پکار کر کہتی ہے کہ اسے قران کے اس عقیدہ کا علم ضرور تھا جس کا اعلان پہلی دفعہ اس کی وفات کے تقریباً بارہ برس بعد کیا گیا۔

اگر اس مسئلہ کے متعلق کہ عربی شاعری کی ابتدا بہت قدیم زمانہ مین ہوئی یا قران کے بعد فیصلہ کو ملتوی رکھنا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ شہادتون مین حیرت انگیز اختلاف ہے کتبون مین تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے نہین۔ اور قران کا بھی وہان تک اعتبار کیا جا سکتا ہے جہان تک وہ ان عربون کے حالات بیان کرتا ہے۔ جو رسول عربی

---

[1] (۴۴-۲۷)

کے زمانہ مین موجود تھے ۔ اور جن کے لئے قران اترا تھا ۔ لیکن عربی شاعری کی
تاریخ کے لئے ہمین دوسرے ماخذون کی طرف جانا پڑتا ہے جو بسا اوقات اس
زمانہ سے بحث کرتے ہین جس کا انھین کوئی تجربہ نہین اور خود ان کی تربیت ایسے
ماحول مین ہوئی تہی جس نے انھین بہت کچھہ فرض کر لینے پر مجبور کر دیا ۔ اور یہی ان کی
گمراہی کا سبب ہے ۔ ممکن ہے کہ ان کے بیانات کے متعلق فیصلہ کرنے مین ہم شبہہ
کو بہت دخل دیدین ۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کم باور کرنے مین ہم حد سے بڑھ جائین ۔

آم کا کنج اور بڑے بابو۔ ان دونوں مین کوئی تعلق بہ ظاہر تو معلوم نہین ہوتا لیکن ہندوستان باوجود ضرب المثل کثرت کے وحدت کا ملک ہے یہان ہر چیز ہر دوسری چیز سے رشتہ رکھتی ہے یہ رشتہ ہر شخص کو نظر نہین آتا لیکن شاعر (یہان اس لفظ کے وسیع معنی مراد ہین) کی دور رس نظر اسے دیکھتی ہے اور دوسرون کو دکھاتی ہے۔ اور جو دیکھنے سے انکار کرے وہ "باغی" کہلاتا ہے۔ باغی کا مفہوم سمجھنے کے لئے تعزیرات ہند عدالت اور کالے پانی کا خیال دل سے نکال دیجئے اور ذرا دیر کے لئے ناموس فطرت کی طرف توجہ کیجئے جو انسان یعنی "کائنات مجمل" اور اس کے ماحول یعنی "کائنات مفصل" مین ہم آہنگی چاہتا ہے۔ اور جس کی خلاف ورزی "بغاوت" ہے مگر خدا کے لئے ان مسائل مین اس قدر محو نہ ہو جائیے گا کہ قصہ کی سادگی انداز بیان کی دلآویزی اور ایک خاص طرح کی ظرافت جو جا بجا موجود ہے نظر سے چھپ جائے۔

ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن کا ذکر ہے۔ مسافر یہان بہت کم دیکھنے مین آتے تھے اور گاڑیان اور بھی کم۔ لیکن کسی مصلحت سے خداوندان تدبیر نے تین ملازمین ریلوے کا یہان تعین کر رکھا تھا جن کی تفصیل یہ ہے۔ ایک اسٹیشن ماسٹر (بڑے بابو) ایک ٹکٹ بابو اور ایک سگنل والا۔

کشن پرشاد اسٹیشن ماسٹر کشیدہ قامت متین آدمی تھے۔ ان کا چہرہ چوڑا چکلا تھا۔ اور سر موچھین بھری بھری اور کسی قدر نیچے کیطرف مڑی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ انکی ذات

گویا اسٹیشن کے مرقع میں نقش مرکزی تھی۔ یہ اپنی تنہائی کی زندگی پر قانع بلکہ اس میں مگن تھے اور جو کوئی ان کے پرسکون چہرے اور خاموشی بھری آنکھوں پر نظر ڈالتا اسے اس بات پر حیرت ہی نہ ہوتی۔ ان کے چہرے سے غور و فکر اور علم و فضل کا اظہار ہوتا تھا حالانکہ انھوں نے برائے نام تعلیم پائی تھی اور ان کی چمک ان کے کور سواد ساتھیوں کے ساتھ تقابل کا نتیجہ تھی۔ باسو گھٹ بابو جو ایک دبلا پتلا نوجوان تھا اور جیسے یہ عہدہ اپنے گاؤں کے مدرسے میں قابل ترین ریاضی دان ہونے کے صلے میں ملا تھا اور ہی طرز کا آدمی تھا۔ وہ بہت کمزور قلب کا اختلاجی آدمی تھا۔ ہمیشہ ہاتھ ملا کرتا تھا اور جب سر جھکا کر چلتا تھا تو معلوم ہوتا تھا گویا وہ ایک بھاری بوجھ پیٹھ پر اٹھائے اپنے بوتے سے زیادہ تیز جا رہا ہے اور اس کا بوجھ بس گرا ہی چاہتا ہے۔ اسے ہر وقت جلدی لگی رہا کرتی تھی اور کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ بڑے بابو سے کوئی بات کہہ کر ان کے جواب کے انتظار میں اور ان کے سکون و اطمینان سے عاجز آ کر جلدی جلدی ان کے گرد پھرتا تھا اور اپنے سوال کو اس وقت تک دہرائے جاتا تھا جب تک جواب نہ مل جائے۔ سگنل والا ایک قریب کے گاؤں کا رہنے والا مسلمان تھا۔ وہ ان دونوں کی صحبت میں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ عام طور پر وہ اپنے سگنل کی اونچی کوٹھری میں بیٹھا کھڑکی میں سے جھانکا کرتا تھا۔ اور مزے میں اپنا ناریل پیا کرتا تھا۔ وہ بہت خاموش رہتا تھا اور کبھی بڑے بابو یا گھٹ بابو سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ ان دونوں کو وہ بشر نہیں بلکہ کسی برتر درجے کا مخلوق سمجھتا تھا۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ وہ بالکل ناخواندہ تھا اور باسو چھ سات برس سے۔ جب سے کہ دونوں کا ساتھ تھا اس کے دل پر یہ نقش کیا کرتا تھا کہ وہ ادنے درجہ کا آدمی ہے۔ بڑے بابو کو اس کی صحبت سے احتراز نہ تھا

لیکن چونکہ وہ ٹکٹ بابو کی کارروائیون سے ناواقف تھے۔ اس لئے سمجھا کرتے تھے کہ سگنل والا خود تنہا رہنا پسند کرتا ہے۔

ٹکٹ بابو اپنے اختیارات کے بارے مین ہمیشہ گستاخ اور خود سر تھا اور بڑے بابو نے یہ دیکھہ کر کہ اس کے فلسفۂ زندگی کے بدلنے کی ساری کوششین بیکار ہین اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن دراصل ان دونون کے تعلقات مرغی اور اس کے بچے کر سے تھے۔ یہ بات اوس وقت واضح ہو جاتی تھی جب ٹکٹ بابو کسی سبب سے سہم کر اسٹیشن ماسٹر کے چوڑے چکلے جسم کی آڑ ڈھونڈھتا تھا اور ان کے ڈھیلے ڈھالے کپڑون مین یون چھپ جاتا تھا جیسے مرغی کا بچہ مرغی کے پرون مین۔ جب کوئی ایسی بات نہ ہو جو اسے بڑے بابو کی پناہ ڈھونڈھنے پر مجبور کرے تو وہ اون کے سکون و اطمینان پر جھلایا کرتا تھا اور اس کا سبب اوس کی سمجھہ مین نہین آتا تھا۔ اسے پسند کرنا تو در کنار ذرا اتنا بھی نہین کر سکتا تھا کہ اسے ایک نہ بدلنے والی چیز سمجھہ کر صبر کرے بلکہ وہ صدق دل سے یہ سمجھتا تھا کہ اس کے افسر کو اپنی یہ خصلت چھوڑ دینا چاہئے جس سے اس کے ماتحتون کو تکلیف ہوتی ہے اور کاشتکارون پر رعب نہین پڑتا۔ خود اس کا نصب العین اسٹیشن ماسٹر کا بالکل دوسرا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر ایک قوی ہیکل غضب آلود آنکھون والا آدمی ہونا چاہئے۔ جو ایک رعب دار وردی پہنے ہو اور جس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ ذرا سی نافرمانی یا اکھڑے پن پر آدمی کو اور نہین تو اٹھا کر نگل ضرور جائیگا۔ برخلاف اس کے یہ بڑے بابو جن کی نگرانی مین اوسے کام کرنا پڑتا تھا ہمیشہ سکون اور خاموشی کی حالت مین رہتے تھے۔ کسانون کو گالی دینا ایک طرف ڈانٹتے تک نہ تھے ہر شخص کو مہربانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور وردی

کبھی نہین پہنتے تھے بلکہ ہمیشہ ایک قمیص پہنے اور ایک لمبی سی دہوتی باندھے نظر آتے تھے اور نیم برہنہ بیوقوف کسانون کو مرعوب کرنے کے لئے اون کے پاس سوائے ایک ریشمی صدری کے اور کچھہ نہ تھا۔

تھوڑے دن پہلے ایک واقعہ پیش آیا تھا جس کے سبب سے ٹکٹ بابو اپنے افسر سے اور بھی زیادہ ناراض ہوگیا تھا اور جتنا وہ پہلے کسانون کو حقیر سمجھتا تھا اوسی قدر اب ان سے خائف تھا اور اس کے دل مین یہ وہم سما گیا تھا کہ جو کسان اوسسے ملیگا اوس کا سر توڑ دالے گا لیکن چونکہ اوسے کوئی چارۂ کار نظر نہین آتا تھا اس لئے وہ دوڑکر بڑے بابو کے پاس جاتا تھا اور اون سے التجا کرتا تھا کہ وہ زیادہ سخت تدابیر اختیار کرین اور کسانون کے مقابلے مین زیادہ استحکام دکھائین۔

موسم خزان کا ایک دن ہے اور سہ پہر کا وقت آسمان پر بادل گھرا ہوا ہے اور ہوا مین خنکی ہے۔ چونکہ رات کو آٹھ بجے تک کوئی گاڑی نہین آتی اس لئے بڑے بابو نے طے کرلیا کہ وہ ٹہلنے کے لئے جائینگے اور ٹکٹ بابو سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ٹکٹ بابو نے ڈرتے ڈرتے کہا "کہان تک چلئے گا" اوسے خوف تھا کہ کہین ایسا نہ ہو گاڑی کے وقت تک واپسی نہ ہوسکے بڑے بابو نے نہایت اطمینان سے ایک آم کے درختون کے کنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو چند سو گز کے فاصلہ پر تھا جواب دیا "صرف اوس باغ تک"۔ ٹکٹ بابو نے کہا بہت اچھا۔ لیکن تیز چلئے" بڑے بابو نے پوچھا "کیون"۔ ٹکٹ بابو کو اس کے وجوہ پیش کرنے کی ہمت نہین پڑی اور وہ بڑے بابو کے قدم بہ قدم آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

یہ دونون اناج کے کھیتون کے بیچ مین اٹھی ہوئی تنگ مینڈ پر جا رہے تھے۔ ٹکٹ بابو کا پیر بار بار پھسل کر کھیت مین جا پڑتا تھا اور وہ اسے انتہائی پھرتی کے ساتھ اچک کر

مینڈ پر پہونچنا پڑتا تھا کہ کہین ایسا نہ ہو کھیت والا دیکھ لے اور گالیون کی بوچھار شروع کر دے۔ بڑے بابو بھاری بھاری قدم رکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ اور ان کا قدم ذرا بھی نہین ڈگمگاتا تھا جس پر ٹکٹ بابو کو سخت تعجب تھا۔ وہ اپنے آس پاس کی سب چیزون پر خاموش مسرت کی نظر ڈال رہے تھے اور نرم اور فرحت بخش ہوا مین گہری سانس لیتے جاتے تھے وہ پیچھے مڑکر نہین دیکھتے تھے اس لئے اونھین نہین معلوم تھا کہ ٹکٹ بابو راستہ مین کیا کیا کرتب دکھاتا ہوا جا رہا ہے۔ آخر کار وہ کنج مین پہونچ گئے۔ اور ایک درخت کے نیچے زمین کے ایسے حصے پر بیٹھ گئے جسے ہوا نے گویا انھین کی خاطر پتیون اور خاک سے صاف کر دیا تھا۔ بڑے بابو نے ٹکٹ بابو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "باسو تمہین معلوم ہے مجھے ایک ایسی چیز کی تلاش تھی جو ہماری قوم اور ہمارے ملک کی تمام اہم خصوصیتون کا مظہر ہو۔ مین نے بہت ڈھونڈھا لیکن آم کے کنج سے زیادہ معنی خیز مجھے کوئی چیز نہین ملتی۔ حقیقت مین ہماری زندگی کی کوئی ایسی چیز نہین ہے جس کی جھلک تمہین اس مین نظر نہ آئے۔ آم کے جس کنج کو دیکھو معلوم ہوتا ہے وہ ہمیشہ سے اسی جگہہ موجود تھا جہان اب ہے۔ کسی کو نہین معلوم ان درختون کو کس نے لگایا تھا اور کوئی ایسا بے رحم نہین جو انھین کاٹ کر پھینک دے۔ ہماری زندگی ہمیشہ سے ہے اور ہمارا ملک بھی۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے ہمارا ملک دنیا مین ہے۔ اور ہم اس مین رہتے ہین باوجود اون شیطانون اور برہم راکشون کی مخالفت کے جنکا ذکر ہماری مذہبی کتابون مین ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے یہان آم کے کنج نہ ہوتے تو ہماری زندگی بڑی بوجھل ہو جاتی۔ مین تم سے سچ کہتا ہون کہ خود مجھ پر یہ بات صادق آتی ہے اگر مین اپنی کھڑکی سے اور اسٹیشن سے اتنے آم کے درخت نہ دیکھ سکتا تو مین کب کا مر گیا ہوتا یا نوکری چھوڑ

کے چلا گیا ہوتا۔

ٹکٹ بابو موقعہ پاتے ہی بول اٹھا، مگر آم کے کنج تو سارے ایک ہی سے ہوتے ہیں؟

بڑے بابو نے کہا، ہاں اسی طرح سب ہندوستانی قریب قریب ایک سے ہوتے ہیں۔ اور جو دوسری طرح کے ہوتے ہیں وہ باغی ہیں۔ جو کوئی آم کے کنج کی خوبصورتی کا قائل نہ ہو وہ باغی ہے۔ چاہے وہ کوئی بڑا بھاری انگریز افسر ہی کیوں نہ ہو۔

ٹکٹ بابو کے ذہن میں باغی کا تصور ایک خوفناک مجرم کا تھا جو پھانسی کا سزاوار ہو اور جس کا تعاقب سارے ملک کی پولیس کر رہی ہو اور کسی انگریز کے ساتھ یہ بات ناممکن تھی۔ لیکن وہ اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تردید کے لئے صرف سر ہلا دیا۔

ایک منٹ تک خاموشی رہی۔ بڑے بابو نے باسو کے اظہار تردید کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے اور گہری سانس لیتے ہوئے شوق اور پسندیدگی کی نظر سے اون زرد پتیوں کو دیکھ رہے تھے جو ہوا میں جھکولے کھا رہی تھیں اور تھک کر زمین پر گرنے والی تھیں۔ ٹکٹ بابو اسٹیشن کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اور دل میں سوچ رہا تھا کہ بڑے بابو کب اٹھیں گے اور واپس چلیں گے۔

آخر بڑے بابو نے مہر خموشی کو توڑا۔ " بغیر ان کنجوں کے واقعی ہم پر بڑی مصیبت ہوتی کہا جاتا ہے کہ گنگا مائی کی وادی جس میں ہم پلے ہیں دو ہزار میل لمبی اور دو سو میل چوڑی ہے۔ ہمارے یہاں پہاڑ نہیں ہیں اور موسم گرما میں بڑی گرمی پڑتی ہے اگر کنج نہ ہوتے تو بھوکے پیاسے مسافر کہاں بیٹھ کر کھانا کھاتے اور آرام کرتے۔ ایک

درخت سے دھوپ کا کافی بچاؤ نہیں ہوتا اور اس طرح کے بڑے درخت خود بخود
تو مل کر نہیں اگتے "
ٹکٹ بابو نے بات کاٹ کر کہا "اگر مجھ سے پوچھئے تو مجھے یہ کنج دیکھ کر ہمیشہ یہ خیال آتا
ہے کہ خدا جانے کتنے سانپ اس کے سایہ مین بیٹھے مجھے ڈسنے کو تیار ہین"
بڑے بابو آہستہ سے ہنسے اور بولے "لوگون کے خیالات مین کتنا فرق ہوتا ہے
جب مین چھوٹا سا تھا تو کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ مین کئی رات دن اپنے گاؤن کے ایک
کنج مین رہا ہون اور آج تک کبھی مجھے سانپ نے نہین کاٹا۔ یہ خلاف اس کے یہ بھی ممکن
ہے کہ آدمی کے آس پاس کوسون تک کوئی کنج نہ ہو اور پھر بھی اسے سانپ ڈس لے
سانپ اور کنج مین کوئی چیز مشترک نہین ہے۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ دونون کا ساتھ لازمی
ہے تو تم غلطی پر ہو کیا تمہاری طرف بہت کنج ہوتے ہین؟
نہین تو۔۔۔ معلوم نہین۔۔۔۔ شاید ہوتے ہون۔۔۔۔ ہان ہان مجھے اب خیال
آیا وہان بھی اسی کثرت سے ہوتے ہین جیسے یہان"
بڑے بابو نے پھر سلسلۂ تقریر شروع کیا "ہان مین بھی یہی سمجھتا تھا۔ ہم سب
اصل مین ایک ہین۔ میرے نزدیک تمام ہندوستان مین تمدّن شہرون مین دیہات سے
آیا ہے اور دیہات مین آم کے کنج سے پیدا ہوا ہے۔ مین تم سے جو کہتا ہون اوسے مان لو
جہان کسی گاؤن مین آم کا کنج ہے وہان کرشن جی کی پوجا موسیقی بلکہ تمام فنون لطیفہ اور
میل ملاپ کے دیوتا کی حیثیت حاصل ہے اور جہان آم کے کنج نہین وہان دوسرے دیوتا
پوجے جاتے ہین۔ اور وہان کے لوگ ہندو نہین اگر سچ پوچھو تو سرے سے ہندوستانی
نہین مجھے اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اگر آم کے کنج نہ ہوتے تو سری کرشن کا جی بانسری بجانے کو

یا عشق و محبت کی باتین کرنے کو نہ چاہتا۔ وہ شیطان کے ہاتھ سے اپنے انسانی جسم کو برباد ہو جانے دیتے اور بہشت کو لوٹ جاتے اگر چاندنی رات مین جمنا کے کنارے۔ آم کے کنج کے سائے مین سونا ان کے دل کو نہ لبھاتا۔ گاؤن کی زندگی بلکہ یون کہنا چاہئے کہ ہندوستان کی زندگی کی ساری رومان کا مرکز آم کا کنج ہے۔ شاعر کے لب پر کسی شیرین نغمہ کا جاری ہونا سوائے اوس حالت کے ناممکن ہے کہ وہ آم کے کنج مین بیٹھا ہو سورج ڈوب رہا ہو ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہو اور عشق و آرزو کا دل پر نرغہ ہو اور میرے خیال مین یہی آم کے درخت جھک کر کرشنا کے کان مین چپکے سے راگ اور راگنیان پھونک دیا کرتے تھے۔ یہ اپنی خاص فضا اور اپنی خاص موسیقی رکھتے ہین اور ان کی ہر ساعت مین نئے گیت سناتے ہین اگر تم دن کے کسی حصّہ مین یہ معلوم کرنا چاہو کہ تم پر کیا کیفیت طاری ہونا چاہئے تو بس تم نزدیک کے کنج مین جا بیٹھو وہان تمہین پتیان مناسب وقت گیت سنا دین گی۔

جب بڑے بابو یہ کہہ رہے تھے تو وہ آس پاس نظر ڈالتے جاتے تھے آم کے کنج پر اور اوس ناہموار قطعۂ زمین پر جو ان کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ جملے اون کی زبان سے آہستہ آہستہ بلا ارادہ نکل رہے تھے۔ گویا اون پر کسی مخفی طاقت، شائد کنج کی روح کا غلبہ تھا اور وہ ان کے پردے مین بول رہی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد ٹکٹ بابو نے یقین کے لہجہ مین کہا "بہت ممکن ہے"۔ "ممکن ہی نہین بلکہ سچ ہے مین جانتا ہون کیونکہ مین نے خود انھین گاتے سنا ہے۔ تم بس لیٹ جاؤ اور کان لگا کر سنو مگر یہ شرط ہے کہ تمہارا قلب صاف ہو اور تم سانپون کے خوف سے کانپتے نہ ہو" بڑے بابو نے مسکرا کر ٹکٹ بابو کیطرف دیکھا لیکن وہ سہما ہوا سامنے

کی جھاڑی کو دیکھہ رہا تھا اور اس نے آخر کا جملہ نہین سنا۔

دونون ایک منٹ تک خاموش رہے اس عرصہ مین قدرت نے بڑے بابو کی ساری آرزوون کے پورا کرنے کا انتظام کر دیا۔ مغربی افق پر بادل پھٹ گئے تھے تاکہ سورج اور زمین کو موقع دین کہ وہ ایک دوسرے کو رخصتی سلام کر لین۔ چند کرنین بادل کے گرد گھیرا بناتی ہوئی آم کے کنج پر پڑ رہی تھین۔ بڑے بابو نے کہا "دیکھو دیکھو۔ سورج ڈوب رہا ہے" ٹکٹ بابو نے گھبرا کر کہا "تب تو ہمین چلنا چاہیئے" بڑے بابو نے بغیر کچھ کہے اپنی گھڑی نکالی۔ ابھی صرف چھ بجے تھے۔ وہ کہنے لگے "ابھی بہت وقت ہے۔ مین ذرا سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہون تم بھی ٹھہر جاؤ"

ہمارے ہندوستان مین غروب آفتاب کا منظر عموماً نہایت شاندار ہوتا ہے۔ اسوقت جو لطف تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بڑے بابو اس پرشوکت رخصتی کے نظارے مین محو وجد کے عالم مین خاموش بیٹھے تھے۔ کبھی وہ تاریکی کو افق مشرق سے بڑی بڑی لہرونمین بڑھتے ہوئے اور سورج کی شعاعون مین گم ہوتے ہوئے دیکھتے تھے۔ کبھی کنج کے حسرت خیز سائے پر نظر ڈالتے تھے اور کبھی کسی چھوٹی سی کرن کے تبسم کے جواب مین جو پتیون سے جھانکتی تھی اور ایک جھلک دکھا کر منہ چھپا لیتی تھی وہ خود مسکرا دیتے تھے۔

جب سورج سب سے دور کے کنج کے پیچھے غائب ہو گیا تب جا کر بڑے بابو اوٹھے اور پھر بھی بادل ناخواستہ تاسف کے ساتھہ۔

ٹکٹ بابو کی حالت پہلے ہی سے غیر تھی۔ شام کو اوسے عموماً قلب کے دورے ہوا کرتے تھے۔ تاریکی مین ہمیشہ کوئی چیز ہوتی تھی جو اوس کی سمجھ مین نہین آتی تھی۔ کوئی چیز جو اوس کی دشمن تھی اور اوسے سہما دیتی تھی۔ آج اوس کے دل مین گاڑی کے وقت نہ پہونچ سکنے کا خوف سمایا

ہوا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر گاڑی آگئی اور اسٹیشن ماسٹر اور ٹکٹ بابو کے نہ ہونے کے سبب دیر تک کھڑی رہی تو غضب ہی ہو جائیگا۔ ہر شخص دونون کو برا بھلا کہے گا۔ کسان پھاٹک کے اوپر سے پھاند کر بلا ٹکٹ اندر داخل ہو جائین گے۔ ممکن ہے کہ ڈرائور کو غصہ آجائے وہ بغیر لائن کلیر اور سگنل کے گاڑی چھوڑ دے اور کوئی حادثہ پیش آجائے۔ اور اس خیال نے تو اوس کا خون ہی خشک کر دیا کہ کہین افسران بالا دست نے آج ہی کے دن کو معائنہ کے لئے منتخب کر کے کسی انگریز گارڈ کو نہ بھیجدیا ہو کہ وہ سب ملازمون کی کارگذاری کی رپورٹ کرے۔ اگر یہ صورت ہوئی تو کیا ہو گا۔ یہ دیکھکر کہ اس قسم کا کوئی خیال بڑے بابو کے دل مین نہین آتا تھا اور وہ اسقدر آہستہ قدم اٹھا رہے تھے گویا کوئی گاڑی آنے والی نہ تھی وہ اور جھلاتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ اوسے اپنے افسر کی یہ سستی اسقدر ناگوار تھی۔ اوس کی ہمت نہین پڑتی تھی کہ تیز چلنے کو کہے کیونکہ اس صورت مین سبب بتانا پڑتا تھا اور یہی اوسے منظور نہین تھا چنانچہ وہ اوس کتے کی طرح جو چاہتا ہو کہ اس کا مالک تیز چلے اور جو اپنی بے زبانی پر دل ہی دل مین کڑھ رہا ہو بہت تیزی سے چل کر بڑے بابو سے دس قدم آگے نکل جاتا تھا پھر دفعتہ رک جاتا تھا۔ اور بڑے بابو کا انتظار کرتا تھا اور پھر اسی طرح تیز چلنے لگتا تھا۔

باوجود اس کے کہ وہ یہ بدنما عمل بار بار کر رہا تھا بڑے بابو اوسی دھیمی چال سے چلتے رہے اور انھون نے اتنا بھی نہین پوچھا کہ تم یہ کیا حرکت کر رہے ہو۔ (باقی)

رفتار تعلیم

رسالہ سرونٹ آف انڈیا نے اپنی مارچ کی اشاعت مین فیجی کی تعلیمی رپورٹ بابتہ ۱۹۲۲ء پر تنقید کرتے ہوئے وہان رہنے والے ہندوستانیون کی تعلیم کے متعلق کچھہ اعداد و شمار شائع کئے ہین جو کئی پہلو سے دلچسپ ہین فیجی کے باشندے تین عناصر پر مشتمل ہین۔ یورپین۔ دیسی باشندے۔ اور نوآباد ہندوستانی۔ ان کی آبادی طالب علمون کی تعداد اور مدارس کی تعداد حسب ذیل ہے۔

	آبادی	مدارس سرکاری	مدارس امدادی	تعداد طلبہ
یورپین	۴۰۰۸	۴	۶	۶۶۷
دیسی باشندے	۸۷۵۸۶	————	————	مدارس و طلبہ کا حساب رپورٹ مین شریک نہین
نوآباد ہندوستانی	۶۶۴۳۳	۱	۲۱	۱۳۱۱۶

پہلی بات اس نقشہ کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپین آبادی مین ۱۷ فیصدی کے قریب طالب علم اور ہندوستانی آبادی مین بیس فیصدی طالب علم ہین اگر کل پڑھے لکھے لوگون کی تعداد بھی اسی مناسبت سے ہے تو دنیا مین کم سے کم ایک جگہہ ایسی ہے جہان ہندوستانیون کی تعلیم کا اوسط یورپین لوگون سے بہتر ہے باوجود اس کی وہان کی سیاسیات مین ہندوستانیون کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا ہے سب جانتے ہین۔

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ کم سے کم تعلیم کا انتظام حکومت کی طرف سے ہندوستانیون کے لئے بہتر ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سرکاری مدرسہ ہندوستانیون کے لئے صرف ایک ہے اور یورپین آبادی کے لئے جس کی تعداد ہندوستانیون کے سولھوین حصے

کے برابر ہے چار مدارس ہین - ہندوستانیون کے اور مدارس ہین جو خود انکی کوشش کا نتیجہ ہین اون مین سے ۲۰ کو سرکاری مدد ملتی ہے - لیکن بعض ایسے بھی ہین جنہین کوئی مدد نہین ملتی - یہی کہ ہندوستانی قابل ستائش ہین کہ باوجود حکومت کے غیر منصفانہ برتاؤ کے وہ یورپین آبادی سے سبقت لے گئے ہین - ارباب حمیت اس سے سبق لے سکتے ہین -

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ دیسی باشندون کے لئے مدارس کا اس رپورٹ مین کوئی ذکر نہین - ظاہر ہے کہ یہ مدارس یا تو معدوم ہین یا شاذ اسی لئے قابل ذکر نہین سمجھے گئے - شاہنشاہیت کے ماتحت جو ممالک ہین اون کے دیسی باشندے عرش پر بھی بیگاری ہی کے سزاوار ٹھہرتے ہین -

---

لنڈن ہاسپٹل کو ایک گمنام شخص نے ایک عطیہ پچاس ہزار پاؤنڈ کا دیا ہے تاکہ امراض کے اسباب معلوم کرنے پر خرچ کیا جائے - ہاسپٹل کے ارباب حل وعقد نے فیصلہ کیا ہے کہ اس رقم سے اون لوگون کو تنخواہین دی جائین جو طب پر عملی تحقیقات کرتے ہین تاکہ یہ لوگ تحقیقات کے کام کو محض وقت ٹالنے کے لئے نہین بلکہ اسباب معاش سے مطمئن ہونے کے بعد دل لگا کر اور مستقل طور پر کر سکین -

---

انگلستان کی وزارت زراعت کی طرف سے ۱۹۲۲ء مین تجربہ کے طور پر پانچ برس کے لئے کچھ وظائف دئے گئے تھے تاکہ دیہات کے مزدورون وغیرہ کے لڑکے یونیورسٹیون کالجون اور فارمون مین زراعت کی تعلیم حاصل کر سکین - ان وظائف کی تقسیم حسب ذیل کی گئی

درجۂ اول - ۱۰ وظائف زراعت، باغبانی یا بیطاری کی سندی تعلیم کے لئے -

درجہ دوم - ۱۰ وظائف زراعت، باغبانی، ڈیری فارم اور پولٹری فارم کے کام کی دو سالہ ڈپلوما کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔

درجہ سوم - ۱۲۰ وظائف زراعتی فارمون مین تھوڑے دن رہ کر تعلیم پانے کے لئے

اب آئندہ سال یہ وظائف ختم ہونے والے ہین اس لئے اس پر غور ہو رہا ہے کہ یہ تجربہ کامیاب ہوا یا نہین اور ان وظائف کو جاری رکھنا چاہئے یا بند کر دینا چاہئے -

---

یہ اہتمام زراعتی تعلیم کا اوس ملک مین ہے جس مین صنعت وحرفت کی ترقی کے سبب سے زراعت گھٹتے گھٹتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے شاید اب یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ سامان خورد ونوش مین دوسرون کا محتاج رہنا باوجود شاہنشاہی قوت وعظمت کے خطرناک بات ہے - مگر دنیا مین ایک دوسرا بدنصیب ملک بھی ہے جس کی روزی زراعت پر منحصر ہے اور جو کھانے کے لئے نہین لیکن اوس کے بعد سب سے ضروری چیز یعنی پوشاک کے لئے دوسرون کا محتاج ہے - لیکن زراعتی تعلیم کی طرف اوسے محض برائے نام توجہ ہے اور وہ اپنے بچون کے دماغون کو "یورپ کی داستانون کا خزانہ" بنانے پر جان دیتا ہے -

---

(درسِ عمل)

عجب کہ نیست ترا از وجودِ خویش خبر — کشائے چشمِ تماشا و سوئے خود بنگر

یکی یکی ہمہ اندر پئے خرابی تو — کند بسوئے تو یکے ہیچکس ز لطف نظر

چو شمع رو بخموشی میان شب کردی — نصیب چشم تو شاید نبود رنگ سحر

چہ دردہا کہ نہ محروم چارہ سازی شد — چہ کارہا نہ کشیدہ ز بد سوئے بدتر

برید بازوے تو ہم ز اصل دست رقیب — تو در خیال کہ باقی است بہر تو شہپر

چرا قدم بسوے مدعا نمی خیزد — چہ گشتہ بین تو منزلت حجاب نظر

کجاست ذوق شہادت کہ بود فطرت تو — بیاد آر کہ میداشتی ز سینہ سپر

بریدی از خود و بردست بے حسی رفتی — نماند بہر تو یک ذرہ ہم ز ہوش و خبر

خیال وحدتِ ملت چرا رہا کردی — نمی شود کہ در آئی بخانہ از این در

ببین ز بر ہمی رشتۂ اخوتِ خود — کہ پنبہ کردی اش از دستِ خویشتن یکسر

ز نقش پائے حریفان دلیل رہ کردہ — نمی شود کہ کنی طے مسافتے ز سفر

ز دست و بازوے خود اعتبار ہمت گیر — بسوے غیر چہ داری براے لطف نظر

نمی شود کہ بہم برخورند ظلمت و نور — بتیر می نشوی ہیچ راہ شیر و شکر

جہان کہ یکسرہ وقتی بزیر بالت بود — نماند بہر تو در دست دشمنان یک پر

بپائے خویش کہ صد بند بے حسی داری — خورد بکار تو ہرگز نہ زحمت رہبر

خیال یاس بدر کن ز سینہ و دل گیر — رہا کن آہ جگر سوز و اشکِ دیدۂ تر

بزن ز سوز نہان آتشی بسینہ و دل — کہ نیست خانۂ مخروب بہر تو خوشتر

زحسب "رنگ" نیاید چنانکه از اسلام | بشرط آنکه بیاری حقیقتش بہ نظر
بشرط آنکہ نمائش کنی ز کلمہ حق | بشرط آنکہ شوی بہر زیستن رہبر
بشرط آنکہ بہ یک سلک اتحاد روی | بشرط آن نہ کنی فرق مین ہمدیگر
بشرط آنکہ بدل نقش اعتبار زنی | بشرط آنکہ شوی از متاع خویش خبر
بشرط آنکہ زنی چاک دامن حرمان | بشرط آنکہ کنی پاس سار سینہ بدر
بشرط آنکہ نہ تابی زامر حق رو را | بشرط آنکہ نہ قرآن کنی نہ صرف نظر
بشرط آنکہ ز پیشینیان مثال کنی | بشرط آن نہ ہراسان شوی زراہ خطر
بقید زیست چرا محض بے حسی مانی | بزن بسینہ خود آتشے ز برق اثر

چرا نہ در رہ اسلام نقش باز می
ہو باز گردش تو ہست ہادیا این سر

(رباعی مچھلی شہری)

بستر تنہائی

ابھی بارہ بجا چکی ہے گھڑی | رات برسات کی ہے اندھیاری
آسمان پر گھر رہی کالی گھٹا | ہر طرف چھا رہا ہے سناٹا
پتے ساکن۔ ہوا کا نام نہین | ہو کا عالم صدا کا نام نہین
اور جو کچھ ہے سائین سائین سی ہی | اور بڑھتی ہے اس سے خاموشی

یہ شب تار اور یہ تنہائی — دل مضطر تری قضا آئی
کن بہانوں سے تو نے روکے تھے — وہ خیالات پھر امڈ آئے
پھر ہوا حسرت و الم کا ہجوم — پھر ہوئے راحت و سکون معدوم
پھر وہی حسن و عشق کا جھگڑا — پھر وہی سلسلہ سوالوں کا

کس سے پوچھوں میں کون بتلائے — اچھی صورت میں یہ کشش کیوں ہے
کیوں مسلتی ہے دل کو پیاری ادا — کیوں لبھاتی ہے جی کو زلف رسا
دل میں چبھتے ہیں کیوں کھنچے ابرو — نگہ ناز میں ہے کیا جادو
لعل لب کیوں ہے چشمۂ امید — ہے حسینوں کی آنکھ میں کیا بھید
حسن والوں کے مسکرانے سے — کیوں کلیجہ میں درد ہوتا ہے
یعنی آخر یہ حسن کیا شے ہے — اور مرے دل سے کیوں خلش ہے
مرض عشق کا مزاج ہے کیا — اور اس درد کا علاج ہے کیا
دل جدائی میں کیوں ہے گھبراتا — وصل میں چین کیوں نہیں آتا

دل وحشی یہ گفتگو کب تک — راز الفت کی جستجو کب تک
تجھ سے پہلے بھی تھے بہت خوب — نہ ہوا پر کسی کو چین نصیب
اب مناسب تجھے یہ ہے سو جا — سارے عالم سے بے خبر ہو جا
خواب اور مرگ ہی میں ہے یہ اثر — کہ ہر اک غم سے چھوٹ جائے بشر
اب نہ جانے فنا کی گود ی میں — نیند اور موت کی خموشی میں

ہم محبت کا بھید پاتے ہین — یا یہ قصہ ہی بھول جاتے ہین
خیر دونون کا ایک ہی ہے مآل — یعنی جاتا رہے یہ رنج و ملال
مرنے جینے پہ اختیار کسے ؟ — نیند آجائے تو غنیمت ہے

ضروری اطلاع

ہمارے رسالے مین اس کی گنجائش نہین کہ تفصیل سے جامعہ کی خبرین اور نئے انتظامات کی رو داد شائع ہو سکے - خاص اس غرض سے ایک پندرہ روزہ رسالہ پیام تعلیم کے نام سے نکالا جا رہا ہے جس مین جامعہ کے مختلف شعبون کے کارکن وقتاً فوقتاً اپنے کام کی رپورٹ شایع کیا کرینگے اس کے علاوہ دلچسپ اور مفید تعلیمی مضامین ہونگے اور ملک کی عام تعلیمی رفتار پر جامعہ کے نقطۂ نظر سے تبصرہ ہوا کریگا - یہ رسالہ $\frac{18 \times 22}{4}$ کے ۸ صفحون پر شائع ہوگا - اور اس کا چندہ عہ سالانہ رکھا جائیگا خریداران جامعہ کی خدمت مین پہلا پرچہ نمونہ کے طور پر بھیجا جا رہا ہے اور ان کے لئے رعایتی قیمت عہ روپیہ سالانہ قرار دی گئی ہے - امید ہے کہ جن حضرات کو خریداری منظور ہو وہ فوراً مطلع فرمائنگے تاکہ دوسرا پرچہ بذریعہ وی پی ان کی خدمت مین بھیجا جائے -

شذرات

جامعہ کی ادارت مین جو تبدیلی ہوئی اوس کا ذکر فروری کے پرچہ مین ہو چکا ہے۔ جامعہ کے موجودہ مدبراسے اپنا خوشگوار فرض سمجھتے ہین کہ یوسف حسین خانصاحب کا جو عزم یورپ کے سبب سے فرائض ادارت سے سبکدوش ہوگئے ہین تہ دل سے شکریہ ادا کرین۔ جامعہ ملیہ کے علی گڈھ سے دہلی منتقل ہونے کے سبب سے ہمارے رسالے کی اشاعت مین جو بے نظمی پیدا ہوگئی تھی اوسے دور کرنے مین یوسف حسین خانصاحب نے نہایت قابلیت اور محنت سے کام کیا اور رسالہ کو ایسی حالت مین چھوڑا ہے کہ اس کی بہتری اور ترقی پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہوگئی ہے۔

رسالہ کے متعلق اصلاحی تجاویز جن پر جلد سے جلد عمل ہوگا حسب ذیل ہین۔

۱۔ وقت پر اشاعت۔ مارچ کا پرچہ وسط اپریل مین نکل رہا ہے اپریل کا انشاء اللہ آخر اپریل مین مئی کا وسط مئی مین اور جون کا آغاز جون مین نکلے گا اس کے بعد سے ہر مہینہ کا پرچہ اوس مہینے کے پہلے عشرہ مین شائع ہو جایا کرے گا۔

۲۔ اس پرچہ سے حجم بجائے چار جز کے پانچ جز کر دیا گیا ہے۔ پرانے خریدارون کو اس سال مزید قیمت نہین دینا پڑیگی لیکن آئندہ سال سے قیمت عہ رکھی جائے گی اس سال جو خریدار ماہ مارچ سے ہو رہے ہین اون سے بھی عہ قیمت لی جا رہی ہے۔

۳۔ کاغذ اور سرورق پہلے سے بہتر ہوگا۔

۴۔ مضامین کا معیار بڑھانے کی کوشش کیجائے گی۔ اپریل کے پرچہ سے بالالتزام ایک مضمون

کسی یورپ یا امریکہ کے فاضل کا جو خاص جامعہ کے لئے لکھا گیا ہو شائع ہوا کریگا۔

۵۔ ہر ماہ ایک افسانہ جو متانت اور گہرائی کے اعتبار سے ادب عالی مین شمار کیا جا سکے چھپا کریگا۔

۶۔ نظم کے حصے مین انتخاب کا معیار بلند کر دیا جائیگا۔ نظمین کم مگر عمدہ چھپا کرین گی۔

اس بار پرچہ مین قاریان کرام دو مطبوعہ آرڈر فارم رسالہ جامعہ کے پائین گے آپ مین سے ہر ایک سے توقع ہے کہ آپ اپنے احباب مین سے دو صاحبون کو رسالۂ جامعہ کی خریداری پر آمادہ فرمائین گے اور آرڈر فارم کی خانہ پری کرا کے ارسال فرمائین گے۔

جامعہ ملیہ کی زندگی کا یہ چھٹا سال ہے اور اسے ہر حیثیت سے جامعہ کی زندگی مین نئے دور کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ جامعہ کا علیگڑھ سے دہلی منتقل ہونا سیاسیات سے اس کا قطعاً علیحدہ کر لیا جانا اور دوسری اسلامی تعلیم گاہون سے رقابت کے ہر شبہ کو مٹا دیا جانا، تین جرمنی اور انگلستان کے تعلیم یافتہ نوجوانون کا اپنی خدمات جامعہ کے لئے پیش کرنا ایسی باتین ہین جن مین سے ہر ایک نئی زندگی اور نئے طرز عمل کی خبر دیتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس تغیر کو ملک اور قوم کے ارباب فکر اور اہل الرائے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہین اس کا ثبوت ایک حد تک تو خطوط پرائیویٹ گفتگو اور اخبارون کے مضامین سے مل چکا ہے لیکن اصل مین اس وقت ملے گا (اور وہ وقت دور نہین) جب جامعہ قوم سے مالی اور اخلاقی مدد کے لئے درخواست کریگی اور اس کے اساتذہ اور طلبہ پہلی مرتبہ فقیرون کا بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھنے نکلین گے۔

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی

نمبر	اپریل سنہ ۱۹۲۶ء	جلد

فہرست مضامین

مطبع جامعہ ملیہ دھلی

جلد ۶ | ماہ شوال المکرم ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۲۶ء | نمبر ۴

جرمنی کے نئے مدرسے

ڈاکٹر الفریڈ ایرنسٹر ایش، پی، ایچ - ڈی -

جرمنی مین اصلاح مدارس کی تحریک اصلی معنون مین اور زور شور کے ساتھ تو جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ہی سے شروع ہوئی ہے - لیکن بہت زمانہ پہلے سے نظام مدارس مین ایک تغیر کی کیفیت موجود تھی جسکا ظہور بڑی بڑی کانفرنسون اور نئے مدارس مین جدت اور اصلاح کی شکل مین ہوتا تھا - ان جدت پسندیون کا آغاز انیسوین صدی کے ختم مین ہوچکا تھا - یہ جدت پسندی نہایت احتیاط اور سوچ سمجھ کر شروع کی گئی تھی اور شروع مین صرف تدریس کے مسائل پر نظر ڈالی گئی - طریقہ درس مین اصلاح کی ان کوششون کو پرانی طریقہ تعلیم کے حامیون سے بہت مقابلہ کرنا پڑا - نئے مضامین کے داخل نصاب کرنے شلاً مدنیات جسپر صرف تاریخ کے درس مین کافی توجہ نہ ہوسکتی تھی، حیاتیات، نفسیات، مضامین متعلق بہ فنون لطیفہ ان سب پر نہایت سخت مباحثے رہے کسرت جسمانی اور کھیل کود کی تعلیم کے متعلق مباحثہ نے خاص طور پر

طول پکڑا معلمین کا مقصد یہ تھا کہ مسلسل دماغی کام کے خراب اثرات سے طلبہ کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کا جاری کرنا ازبس ضروری ہے۔ اس بحث مین جسمانی نشو ونما کے حامی کامیاب رہے اور آج اسکول کے آخری امتحان مین ورزش جسمانی کو مع (کھیل، کود، تیراکی وغیرہ) ایک مضمون تسلیم کیا جاتا ہے۔

صحت عامہ کے متعلق روزافزون ترقیات بچون کی نفسیات اور تعلیمات تجربی (مثلاً تھکاوٹ اور کارگزاری کی پیمایش، ذہانت کی جانچ وغیرہ) کے معلومات جنھین خاص طور پر ارنسٹ مائے مان نے فروغ دیا ان سب کا اثر تعلیم وتدریس کے طریقہ پر پڑا۔ اس رجحان کا آخری نتیجہ وہ مدارس ہین جو حاملین (۱۹۱۷ء) غربا کے ان بچون کے لئے قائم کئے گئے ہین جنمین کوئی خاص صلاحیت ہو انمین کوشش کیجاتی ہے کہ جب یہ بچے مدارس ابتدائی مین، سالہ تعلیم ختم کرچکین تو پھر کم سے کم وقت مین بہت سی معلومات انھین پہونچادیجائے۔ ابھی تک یقینی طور پر نہین کہا جاسکتا۔ باصلاحیت دماغون کو اس طرح بے تک گرانا انکے لئے مستقل فائدہ کا باعث ہوتا ہے یا نہین۔

جیسے اور ہر میدان مین تجربے کئے جارہے ہین یہان بھی تجربے ہورہے ہین، ہمارا عہد بیشمار تجربی مدارس کا عہد ہے۔ طریقہ تعلیم کے متعلق بحث ومناظرہ زیادہ تر السنۂ جدیدہ کی تعلیم کے طریقہ کے سلسلہ مین ہوا۔ اس مین قدیم طریقہ کے حامی تو یہ کہتے تھے کہ کسی زبان کی روح تک پہونچنے کے لئے ترجمہ کا طریقہ بھی بہترین تدبیر ہے۔

نئے خیال کے حامی چاہتے تھے کہ خارجی زبانون کی تعلیم خود ان زبانون مین دی جایا کرے۔ اس باب مین نہایت اچھا کام فرانکفورٹ کے اسکول اور اس کے صدر مدرس والنر نے کیا ہے جس سے بہت سی نئی راہین کھل گئین چنانچہ آج ترجمہ کے ذریعہ زبانین سکھانے کا طریقہ عام طور پر نظر دنین غیر مقبول ہوگیا ہے۔

اصلاح مدارس کی تحریک یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صرف ایک مرکز یعنی برلن سے شروع ہوئی ۔ بلکہ جرمنی کی تمدنی زندگی کی یہ خصوصیت کہ وہ انتہائی مرکزیت سے نا آشنا ہے اس بات کی مقتضی تھی کہ مختلف مقامات سے یہ تحریک اٹھے ۔ اور اب صرف طریق درس اور مضامین پر بحث نہ تھی بلکہ تعلیم و تربیت کے بنیادی مسائل پر ۔ جرمن مدارس جو اپنی تدریس کی عمدگی کے باعث ساری دنیا میں مشہور رہے تھے اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ انھوں نے تعلیم و تربیت کی حقیقت کی طرف سے کسی درجہ تغافل برتا ہے اور اب وہ اس کوشش میں سرگرم ہیں کہ اس کمی کو جلد سے جلد پورا کریں ۔ مدارس کی حالت میں یہ تبدیلی اب علم اور مضمون درس کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ خود زندگی اور ضروریات شباب کے اثر کے ماتحت رونما ہو رہی ہے میں پہلے ایک مضمون میں بیان کر چکا ہوں کہ مدارس دیہی کے استادوں کی آزادی کی کوشش ۱۹ وین صدی کے آخر سے شروع ہو چکی تھی ۔ انھیں میں تعلیمی مصلحین کا وہ حلقہ بھی تھا جس نے ہامبرگ کو اپنا صدر مقام بنایا اور پہلے پہل احساس حسن کے پیدا کرنے اور فنون لطیفہ کی تعلیم کے مسئلہ سے اپنی اصلاح کا کام شروع کیا اور جنکے بعض بعض خیالات پورے ہو کر اب ہامبرگ اور برلن کے "مدارس جماعتی" (Gemeinschaftschulen) کی شکل میں موجود ہیں یہ مدارس قدیم نظام سے یکسر جدا ہیں ۔ یہ صرف لکھانے پڑھانے کے مدرسہ نہیں بننا چاہتے بلکہ زندگی اور تجربہ کا مدرسہ بننا ان کا مقصود ہے معلم اور متعلم یہاں دو متقابل اور جدا جماعتیں نہیں بلکہ ایک ہی جماعت ہیں استاد اور شاگرد کے درمیان دوستانہ اور دلی محبت کے روابط پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے ۔ والدین بھی پہلے سے کہیں زیادہ مدرسہ کی زندگی میں دلی حصہ لیتے ہیں ۔ اپنی بہترین شکل میں ایسا مدرسہ چاہتا ہے کہ ان میں خود طلبہ میں باہم روابط ہوں ، لڑکے لڑکیاں ساتھ ہی ایک مدرسہ میں تعلیم پائیں ، یہ چاہتا ہے کہ استاد اور شاگرد میں روابط ہوں اور نیز مدرسہ اور والدین میں ۔ ان میں طلبہ خود مختار ہیں ، اور یہ خود اختیاری صرف ایک خارجی چیز نہیں بلکہ خود مدرسہ

اندرونی معاملات مین مثلاً مسائل درس وتدریس اور تربیت مین بھی طلبہ کے اختیار کو بڑی حد تک بڑھا یا گیا ہے۔ ان مدارس مین جو بہت آگے بڑھ گئے ہین انھون نے تو مدرسہ مین روزانہ درس کے ترتیب اوقات کو بھی اٹھا دیا ہے، خیال یہ ہے کہ پانچ ایسے گھنٹون کا ایک دوسرے کے بعد آنا جن مین باہم کوئی تعلق اور ربط نہین بے معنی بات ہے۔ بجائے اس کے ان مدارس مین یہ ہوتا ہے کہ باہمی مشورہ سے ایک دوسرے سے مناسبت رکھنے والے مضامین کی تعلیم بطور ایک مضمون کے دی جاتی ہے کسی مضمون مین جو کچھ پڑھانا ہے اور مختلف جماعتون مین جتنا پڑھا دینا لازمی قرار دیا جاتا ہے اس کی حد بندی کو بھی ان مدارس نے توڑ دیا اور بجائے جماعت بندیون کے ہر مضمون کے تدریجی تعلیم کا انتظام کیا جس مین شامل ہونا طالب علم کے اختیار مین ہے۔ مثلاً سرکاری مدارس مین اگر ایک بچہ ریاضی مین خاص صلاحیت اور اچھی استعداد رکھتا ہے لیکن وہ زبانین اچھی طرح نہین جانتا تو یہ ممکن نہین کہ وہ اونچے درجہ مین پہونچے۔ زبانون مین محنت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اسی ریاضی کے علم کو بھی برابر دہرانا پڑتا ہے جو اسے ازبر ہے۔ حالانکہ اگر ساتھ ساتھ ریاضی کے سہل اور مشکل درس ہوتے ہون جنمین جو چاہے شریک ہو تو یہ بچہ ریاضی کی تعلیم اس سے اونچے معیار کی حاصل کر سکتا تھا۔ "مدرسہ جماعتی" کی تحریک کے سر برآوردہ نمایندہ ولہم پاؤلزین نے خوب کہا ہے۔ "مدارس کو منہدم کر ڈالو، نوجوانون کی بستیان بساؤ"

"مدارس جماعتی" کے تخیل مین جرمنی کی تحریک شباب" کا بھی کافی اثر تھا اور ہم اس تحریک پر ایک دوسرے سلسلہ مین کچھ اور لکھین گے۔ ہان "ان مدارس جماعتی سے ان مدارس دینیاوی کا مسئلہ بھی بہت قریب کا تعلق رکھتا ہے جو اشتراکی سیاست کے سلسلہ مین رونما ہوئے اور یون تو جرمنی کی ہر سیاسی جماعت لازماً اپنے مقلدین کے سامنے اصلاح مدارس کا ایک لائحہ عمل پیش کرتی ہے سیاسی جماعتون کی تعلیمی معاملات مین یہ دلچسپی اس طرح تو ضرور مفید

ثابت ہوئی ہے کہ اس نے مدارس کے مسئلہ کو جمہور کے پیش نظر کر دیا ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ اغراض
سیاسی کی بیجا پاسداری اور باہمی منافرت کے ناگوار نتائج بھی اس سے پیدا ہوئے ہیں۔ مدارس
دنیاوی یعنی وہ مدارس جن میں کسی مذہبی عقیدہ کی تعلیم نہیں دیجاتی یہ صرف اشتراکی فرقہ کی
تخلیق نہیں ہیں بلکہ اس کی پرورش اس آزادی خیال نے بھی کی ہے جو پرانی مذہبی نگرانی
مدارس کے ہمیشہ مخالف رہی ہے۔ جہاں ان دنیاوی مدارس کا نیا عالم وجود میں آگیا ہے
وہاں مذہبی عقاید کی تعلیم کے بجائے یا فرانسیسی نمونہ پر اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے اور یا عام طور پر
مذاہب کے متعلق تاریخی معلومات بہم پہونچائی جاتی ہے مثلاً ڈکرس ڈورف کے مشہور مدرسہ
میں۔ ان مدارس کے متعلق یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ انپر مادہ پرستی چھائی ہے بلکہ صحیح تو یہ ہے انہیں اکثر
طالب علم حقیقت مذہب اس سے زیادہ گہری واقفیت حاصل کر لیتا ہے جتنی کہ اکثر متفرق فرقوں
کے عقائد کی تعلیم سے ممکن ہے۔ لیکن باوجود اس کے انکی شدید ترین مخالفت قدامت پسند
جماعت وسطی کی طرف سے ہوتی ہے یعنی انتہائی قوم پرستوں اور جرمنی کی نہایت متحد اور
منظم کیتھولک جماعت کی طرف سے۔

انقلاب کے بعد مذکورہ بالا اصلاح کے طالبوں نے برلن میں ایک جمعیتہ کی بنیاد ڈالی
قطعی مصلحین مدارس کی جمعیتہ۔ اس کی سرکردگی پاؤل اویسٹ راکشن کرتے ہیں اور اس جمعیتہ
میں طرح طرح کے تعلیمی خیالات اور ہر قسم کے مصلحین تعلیمی یکجا ہوگئے ہیں۔ یہ جمعیتہ وزیر ونز
عملی مدارس کی مخالفت میں شدید تر ہوتی جاتی ہے اور یہ ہمارے موجودہ طریق درس کی مخالف ہے
اب تک جتنا زور پرانی زبانوں کے سیکھنے پر دیا جاتا رہا ہے اس کی مخالف ہے اور اس نے
جمہور کے سامنے ایک نئے نظام مدارس کا خاکہ پیش کیا ہے جس کی ابتدا فروبل اور ساطلوی
معلمہ مانٹسری کے طریقہ کنڈرگارٹن سے ہوتی ہے اور آخر میں اعلے تعلیم کی اصلاح کی تجاویز ہیں

اس جمعیتہ نے اپنے اس خاکہ کی تبلیغ بھی نہایت تندی سے کی ہے۔ ان کی ساری تجاویز کا خلاصہ ایک اس لفظ پر ہے "تخلیقی مدرسہ" یعنی ایسا مدرسہ جسمین صرف مختلف مضامین کے متعلق بچے کو معلومات ہی فراہم نہ کردی جائے بلکہ جسمین بچون کو ہاتھ سے کام کرنے اور معاشی حیثیت سے کچھ کرنیکا موقع بھی ملے اور یہ مدرسہ اپنے کارگاہون اور زرعی کام سے ایک حد تک خود اپنے مصارف کا کفیل بھی ہو سکے۔ اس کے لئے صرف وہی استاد کافی نہین جن پر سرکاری مہر قابلیت لگی ہو بلکہ عوام مین سے بھی وہ لوگ جنھین اس کام سے دلچسپی ہو اس مین کام کرسکین۔ اس طرح گویا ان مدارس کے مجوزین کے ذہن مین اس موجودہ سیاسی اور ثقافتی احساس کی جھلک پائی جاتی ہے جس کے نزدیک بے لگاؤ پیشہ ور ماہر کے مقابلہ مین وہ معمولی آدمی زیادہ قابل قدر ہے جسے کام کی خوبی کا یقین اور اس سے شغف ہو۔ اس خیال اور مطالبہ کا سب سے زیادہ اثر کمونسٹ جماعت کے تجاویز اصلاح مدارس مین ملتا ہے، جن مین سے بعض تجاویز پر ایک مرتبہ شمالی جرمنی کی ایک نئی بستی (Tegel Ort) مین عمل بھی کیا گیا ہے۔

برلن کے قریب ایک مقام ٹیگل آورٹ ہے وہان ایک جھیل مین ایک جزیرہ پر ایک اسی قسم کا تجربہ کیا گیا۔ یہان ایک جمنازیم کے اعلےٰ جماعتون کے لڑکون کو کھلی ہوا مین لیجا کر رکھ دیا اور انمین ایک قسم کی بورڈنگ ہاؤس کی سی باہمی زندگی پیدا ہوگئی۔ درس مین ترتیب اوقات کے طریقہ کو یہان بھی چھوڑ دیا گیا۔ اور اس کی جگہہ ہر ہفتہ ایک مضمون یا باہم متعلق مضامین کا درس ہوتا رہا۔ مثلاً ایک ہفتہ ریاضی و طبعیات کا ایک ہفتہ زبانون کا اور ایک جرمن اور تاریخ کا مقرر رہا۔

اسی قسم کی ایک اور کوشش اس سے قبل برلن کے قریب ہی ایک معلم آٹو برتھولڈ نے شروع کی تھی۔ اس کے چھوٹے سے تجربی مدرسہ مین بچے یعنی لڑکے لڑکیان دن رات نہین بلکہ

صرف دوپہر تک ساتھ رہتے ہین۔ اور خود بچون کا بنایا ہوا انتظام اوقات بھی یہان جاری ہے۔ لیکن جہان انتظام خود اختیاری کے اصول کو نیز درس کی آزادی کے اصول کو اچھی طرح مدنظر رکھا جاتا ہے، تو بے شک مضامین کی تعلیم مین جو تنگی ہوتی ہے اس کے لئے یہ تدبیر کی گئی ہے کہ اکثر سارے مدرسہ کو یکجا درس دئے جاتے ہین ان مین ہر قسم کے سوال پوچھے جاتے اور ان کا جواب دیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ مین خاص بات خود بچون کی عدالت ہے۔ اس مین قانونی عدالتون کی ظاہری نقل بھی ہوتی ہے اور بچے اسکول کے ڈسپلن کے متعلق معاملات خود طے کرتے ہین اور اکثر بلا استادون کی مداخلت کے ان معاملات کا نہایت خوبی سے فیصلہ کرتے ہین۔ ان تجربی مدارس مین سزا دینے کا جو سرکاری مدارس مین دیکھا جاتی ہین ذکر بھی نہین۔ بلکہ برلن مین ایک نوجوان کا مجسمہ ہے جہان ایک نیک دل اور مردم شناس معلم نے اس طریق کو کامیابی کے ساتھ جاری کر دکھایا ہے۔ وہ بچے کی فطری انصاف پسندی اور اس کی روح کی نیکی پر کامل اعتماد کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے مدرسہ کی اندرونی و بیرونی تکمیل و تشکیل کا مرکز تمامتر خود بچے کی ذات ہو۔

برلن کے قریب اور یون مملکت جرمنی مین اور مقامات پر بھی ایسے بہت سے تجربی مدارس ہین جن کا مقصد یہ ہے کہ بڑے شہرون سے باہر شہر کے قریب بچون کی ایسی بستیان بنائین جو مدرسہ بھی ہون اور گھر بھی۔ انکے نزدیک مدرسہ کا مقصد اولین جاننا اور علم نہین بلکہ خود زندگی اور حیات اجتماعی مین باہمی تاثیر و تاثر ہے۔ یعنی ان کا معیار قدر اس انتہائی انفرادی اصول سے بالکل مختلف ہے جنکا نتیجہ وہ مدارس تھے جو خاص طور پر صلاحیت رکھنے والے طلبہ کے لئے قایم کئے جاتے تھے۔

برسون سے میونک کی سرزمین سے ایک اور تعلیمی اصلاح کی ندا اٹھ رہی ہے یعنی

"کام کے مدرسہ" کی ندا۔ طریق تعلیم کی جدت کا حامل جارج کرشن اشٹائنر ہے۔ تقریرون اور لکچرون اور استاد کی طرف سے پڑھائی کے مواد کے پیش کرنے کے دوسرے طریقون کے بجائے یہ چاہتا ہے کہ متعلم خود اس مواد کو نکالے اور تیار کرے۔ مین ایک دوسرے باب مین اس شخص کے متعلق مزید معلومات قارئین کی خدمت مین پیش کرون گا۔ اور یہ کچھ اس لئے نہین کہ یہ شخص دور جدید کی اہم ترین تعلیمی ہستی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے طریقہ اور مدارس مین جو کارروائی اس کے اثر سے ہوئی ہے انھین ٹھیک ٹھیک ایک جگہہ پر جمع کر دیا جائے۔ اس معلم نے تین باتون کی وجہ سے خاص طور پر اپنی طرف لوگون کو متوجہ کیا۔ سب سے پہلے تو اس نے مدنیات کی تعلیم پر بہت زور دیا، دوسرے اس نے "کام کے مدرسہ" کے مفہوم کو متعین اور صاف کیا (یہ اس مدرسہ مین استاد اور شاگردون کے کام مین اشتراک چاہتا ہے؛ طلبہ کے لئے انتظام خود اختیاری کا طالب ہے اور صحیح معنون مین کام کی تعلیم کا انتظام چاہتا ہے) تیسرے یہ کہ اس نے ایک یکسان جرمن مدرسہ کا نہایت عمدہ خاکہ پیش کیا تفصیل ہم دوسرے موقع پر بیان کرین گے۔

لائپزگ کے معلم گاوڈگ کے اصولون نے بھی لوگون کی توجہ بہت کچھ اپنی طرف منعطف کرائی۔ اس کے پیش نظر بھی زیادہ تر متعلم کی شخصیت اور اسکی زندگی کا نشو و نما ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ ایک نئے نظام تعلیم تک پہونچنے کے لئے ہمین اول اول غیر تاریخی طور پر یعنی روایتون سے الگ ہو کر سوچنا اور غور کرنا چاہیئے۔ یہ چاہتا ہے کہ ہر درس مین کام کرنے کی ایک ایسی خواہش پیدا کر دے جو پھر خود پھل پھول پیدا کرے۔ اور اس مقصد کو یہ بھی کام مین اشتراک کے ذریعہ متعلم کے قوائے ذہنیہ کو خود کام کرنے کی تحریک دیکر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک مدرسہ مین سب سے اہم چیز خود پڑھانی ہے وہ خود قوتی زندگی ہے، یہ خود تشکیل حیات کے لئے موجود ہو نہ کہ ایک ایسی چیز جو متعلم کے لئے خارجی ہستی رکھتی ہو۔ طریق تعلیم اسکا یہ ہے کہ

جماعت خود سوال وجواب کے ذریعہ اپنے آپ آگے بڑھے۔ اس کے خیال مین یہ بات اس قدر ضروری نہین کہ جو سوال پیش ہو اسکا نتیجہ حل بھی ہو جائے بلکہ اہم یہ ہے کہ خود سوال کرنے اور مسئلہ کو پہچاننے کی عادت پیدا ہو۔ متوحش طبایع نے اس طریقہ پر تناقص تو سیکھے ہین اور منتشار کے الزام لگائے ہین۔ اور اس مین شک نہین کہ یہ ہر اعتبار سے یہ بھی نہین کہ قابل تقلید ہو اور واقعاً اس طریقہ کی نری ذہنیت کے خلاف شبہات پیدا ہونا لازمی ہے لیکن تاہم اس مین شبہہ نہین کہ مدرسہ کی جماعتوں کے اندرونی اشتراک تعلیمی کی راہ مین یہ ایک معتد بہ ترقی ضرور ہے۔

جنگ عظیم تک اصلاح مدارس کی تحریک جرمنی کی سرکاری تعلیمی نظام پر بہت قلیل وعارضی اثر رکھتی تھی لیکن جنگ کے بعد جو انقلاب سیاسی ہوا اس نے اس ساری تعلیمی عمارت میں زلزلہ پیدا کر دیا اور نہایت اہم تبدیلیان رونما ہوئین مثلاً فوجی اعلے مدارس یکقلم غائب ہو گئے اور اسی طرح خواص کے لئے ابتدائی مدارس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ اور دوسرے اعلے مدارس مین تخفیف ہوئی جس سے بڑا اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا لیکن یہ دراصل معاشی حالات اور پریشانیون کا لازمی نتیجہ تھا۔ اصلاح تعلیمی کا جو مواد عرصہ سے پک رہا تھا اور جسے دوران جنگ مین مصنوعی طریقون سے روکا گیا تھا اسے ۱۹۲۰ء کے ایسٹر کے موقع پر حکومت نے بہنے دیا۔ حکومت نے تمام ممتاز معلمین کو بلایا چاہے انہین فروبل کے کنڈر گارٹن والے ہون یا یونیورسٹی کے نمایندے، تمام مدرسون مین تجربہ کرنے والون کو بلایا چاہے یہ کمونسٹ ہون یا مذہبا نہ خانقاہون مین تعلیم کے حامی اور ان سب کو ایک کانفرنس منعقدہ برلن مین جمع کیا۔ ان بےشمار تقریرون مین جو اس اجلاس مین ہوئین آدمی تعلیمی دنیائے جدید کا ایک اچھا خاصہ نقشہ دیکھ سکتا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ اس ایوان تمدنی کی قرارداد ین

اور نتائج کسی کو پابند نہ کرین کے۔ تاہم انہین سے اکثر پر عمل ہو چلا ہے ۔ مین ان مین سے صرف چند انتظامی اور تعلیمی امور مہمہ کا ذکر یہان کرتا ہون۔

نظام مدارس کے سلسلہ مین سب سے اہم تجویز ساری قوم کے لئے یکسان مدارس کا مطالبہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہر جرمن ایک ہی قسم کی بنیادی تعلیم حاصل کرے اور اپنی عمر کے ابتدائی سالون مین ہر طبقہ کے بچون کے ساتھ ایک ہی بنچ پر بیٹھ چکا ہو۔ ہر جرمن کو چاہے وہ کتنا ہی غریب کیون نہ ہو "اگر اس مین صلاحیت ہے" اس بات کا موقع ملنا چاہئے کہ وہ یونیورسٹی تک کی تعلیم حاصل کر سکے۔ چونکہ یہ تو ممکن نہ تھا کہ موجودہ نظام مدارس کو یکسر بدل دیا جائے اس لئے اب کوشش یہ ہوتی رہی کہ ایک قسم کے مدرسہ سے دوسرے قسم کے مدرسہ مین جانے کے امکانات اور مواقع بڑہائے جائین اس سب کے لئے ایک سے مدرسہ کی عملی شکل کے متعلق جو تجاویز ہین وہ تفصیلات مین باہم بہت مختلف ہین اور آخری مدارج تک ان کا اجرا ابھی بیسیون سال لیگا، ہان نیچے کا ڈہانچہ تیار ہو چکا ہے۔ مدرسہ کی تعلیم کے ابتدائی سال ہر بچہ بنیادی مدرسہ مین گزارتا ہے۔ یہ مدت چار سال کی ہوتی ہے۔ اس مدت کے ختم ہونے کے بعد یا بچہ مدرسہ دیہی و عمومی کی تعلیم ختم کرتا ہے یا کسی مدرسہ عالیہ مین چلا جاتا ہے۔ ان اعلےٰ مدارس کی بہی تین قسمین ہوتی ہین اور بیر دیسی زبانون کی تعلیم کا نظام ان تینون مین اس طرح رکہا گیا ہے کہ ابتدائی جماعتون مین ایک قسم کے مدرسہ سے دوسری قسم کے مدرسہ مین منتقل ہونے کا امکان رہتا ہے سان اعلےٰ مدارس کے اونچے درجون مین پھر زبانون، ریاضی و حکمیات، یا جرمن و تاریخ کی ایسی تقسیم ہو جاتی ہے کہ طلبہ مین انکی مخصوص صلاحیت کے اعتبار سے پھر تفریق ہو سکے۔ اسکول کا آخری امتحان (آبی تور) ابھی باقی ہے ہر چند کہ اس پر بارہا سخت حملہ ہو چکے ہین۔ اور میرے خیال مین اس امتحان کا اس طرح قائم رکھنا نظری حیثیت سے

کچھ بہت بڑھا نہین ۔ یہ مدارس اب یہ نہین کہ مختلف تعلیمی ستون ہون جو ایک دوسرے کے
قریب قریب لیکن ایک دوسرے سے جدا کھڑے ہون بلکہ انکا حال اب ایک ہی درخت
کی مختلف شاخون کا سا ہی۔ انکی مروجہ اقسام کے علاوہ اب ایک اور شاخ اس تنہ سے پھوٹی
ہے اور وہ "جرمن گمنازیم" ہے جسکے درس مین جرمن تمدن، زبان و ادب، تاریخ اور
فنون لطیفہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جس طرح کہ ہیومانی گمنازیم مین تمدن قدیم کو۔ خیال
ہوتا ہے کہ یہ شکل ہر جرمن کے لئے موزون ترین شکل ہوگی لیکن تاہم اس پر بھی علمیت کا سایہ
ہے اس کے سبب سے بہتون نے اس کی مخالفت کی ہے اور اس بارہ مین یہ بات خاص طور پر
قابل لحاظ ہے کہ جرمنیت سے واقفیت حاصل کرانے مین جو شدت برتی جاتی ہے اس کا خمیازہ
پردیسی زبانون کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اور چونکہ یونیورسٹی مین داخلہ کے لئے کم سے کم دو پردیسی
زبانون کا جاننا ضروری ہے اس لئے بہت سے اس قسم کے مدارس نے بھی اس شرط کو پورا
کرنے کا انتظام کیا ہے۔ البتہ چند مدارس ایسے بھی ہین جن مین صرف ایک پردیسی زبان کا
انتظام ہے لیکن ان کا آخری امتحان صرف ان ریاستون مین تسلیم ہوتا ہے جن مین اشتراکی
اثر غالب ہے مثلاً تھیورنگن سیکسنی، وغیرہ۔

نئے مدرسون کی اور قسم وہ ہے جس مین مدارس عمومی کے اونچے درجون مین سے تمام
اچھی صلاحیت کے مزدورون کے بچے لئے جاتے ہین اور انھین مدرسہ کے آخری امتحان
اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ مدارس اشتراکی جماعت کا کام ہین اور
ان مین صلاحیت اور جماعتی دشواریون کے مسئلہ کو باہم ملا کر حل کرنے کی کوشش
کی گئی ہے۔ یہ اپنے کام مین مذکورہ بالا جماعتی" مدارس سے بہت کچھ مشابہ ہوتے ہین
مثلاً برلن کے ایک ایسے حصہ مین جہاں کی آبادی بیشتر اشتراکی ہے اس قسم کا ایک مدرسہ ہے

جس مین کام کی تعلیم کے اصول پر شدت سے عمل کیا جاتا ہے - انتظام خود اختیاری کے معاملہ مین یہان کے طلبہ بہت ترقی کر چکے ہین - مدرسہ مین یہ خود ڈسپلن قائم رکھتے ہین اجمن مباحثہ مین خود نظم رکھتے ہین حتی کہ خود ہی یہ بھی طے کرتے ہین کہ کیا پڑھایا جائے - استاد کی حیثیت یہان ایس مشیر کی سی ہے - یہ نہین کہ استاد اپنے منصب کی بلندگی سے جماعت کرائے، جماعت کے اندر ترتیب و نظم کے ذمہ دار خود طلبہ کے منتخب کردہ د و طالب علم ہوتے ہین -

---

مدارس پر غیر معمولی اثر اس سے بھی پڑا ہے کہ طلبہ کے والدین کی جمعیتین قائم کی گئی ہین - انکی منتخب کردہ کمیٹیان ہوتی ہین جن سے خاص فن تدریس سے متعلق باتون کے علاوہ تمام اہم معاملات پر صدر مدرس مشورہ کرتا رہتا ہے -

طلبہ کو انتظام خود اختیاری دینے کا اصول روز بروز زیادہ تسلیم کیا جا رہا ہے - یون تو عرصہ سے اس اصول کی تبلیغ مین فریدرش ولہلم فورسٹر مشغول تھا - یہ امریکہ کے مدارس کے انتظام خود اختیاری اور "مدرسہ کی بلدیہ" کے طریقون کے حوالہ سے برابر اس اصول پر زور دیتا رہا - وہ کہتا ہے "تعلیم محض حکومت اور جبر کا نام نہین اور رہنمائی صرف حفاظت و نگہبانی کو نہین کہتے معلم اور رہنما وہ ہے جو طلبہ مین خود کام کرنے کا حوصلہ پیدا کرے اور ان مین اپنی ذاتی ذمہ داریون کے احساس کو نشو نما دے" یہ سب کچھ تھا لیکن یہ دراصل اس خیال کو یکایک ان انقلابی فرامین سے بہت فروغ پہونچا جو سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء مین جاری کئے گئے - مثلاً خاص طور پر پروشیا کی وزارت تعلیم نے ایک نکتہ برس نقاد مدارس گستاف وینکن کے اثر سے حکم دیا کہ تمام مدارس مین طلبہ اور استاد باہم مل کر

مدرسہ کی سبھا قایم کرین۔ اس طرح گویا پہلی مرتبہ مدرسہ مین تحکم کا پرانا اصول توڑا گیا اور استادون
شاگردون کی ایک مشترک جماعت ترتیب دی گئی تاکہ وہ مہینہ مین کئی بار باہم ملکر تمام
تعلیمی، مدنی اور حفظان صحت کے متعلق معاملات پر مشورہ اور گفتگو کر سکین۔ یہ کاروائی
اس زمانہ کی عام سیاسی مخالفتون اور ریشہ دوانیون کا شکار ہو گئی اور اس پر پوری
طرح عمل نہ ہوا۔ لیکن پھر بھی ترقی پسند مدارس مین اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے
بڑے افسوس کی بات ہے کہ اصلاحات جمہ کے ایک چھوٹے سے عہد کے بعد ہی اس وزارت
کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اسپر پھر قدامت پسندون نے اپنے قدم جمائے۔ تاہم ان واقعات اور
تجویزنے عموماً استادون اور شاگردون مین نہایت ہی خوش کن دوستانہ اور برادرانہ
تعلقات پیدا کر دئے ہین۔ آج اگر طلبہ کی طرف سے کسی استاد کے کام پر کھلے الفاظ مین
کچھ نکتہ چینی ہوتی ہے تو اسے اہانت خسروی کا مرادف نہین سمجھا جاتا بلکہ ہر ہوشیار استاد
اس تنقید سے دلیل راہ کا کام لیتا ہے۔

الغرض، اصلاح مدارس سے چلکر رفتہ رفتہ یہ تحریک انقلاب تعلیم پر رکی - اور
اس انقلاب کا خمیر تیار کیا ان خیالات نے جو خاص طور پر ہمارے زمانہ کی امتیازی خصوصیت
ہین ۔ اس مین پھر چاہے ہوما نی معلم فریدرش پاؤلزین کے خیالات ہون یا ہربارٹ
کے مقلد رائن کے۔ گرلٹ کی آگ بھری طبیعت ہو یا ناتورپ کی خرد آموزی ا
فورسٹر کی خلاقیت ہو یا ویونکن کی انتہا پسندی۔ اگر ان خیالات کی تفصیل کی گئی
تو بات بہت دور جا پڑیگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سارے خیالات اور ساری تدابیر کے
سامنے ایک خطرہ ہے۔ وہ یہ کہ خیالات کی بلند پروازیان اس زمانہ مین رونما ہوئی ہین
جبکہ ہم معاشی اعتبار سے نہایت پستی کے عالم مین ہین اور اگر معاشی انحطاط کا یہی عالم رہا

تو ڈر ہے کہ اس انقلاب تعلیمی کی جگہہ پھر وہی اصلاح اور بالآخر خود اس اصلاح کی جگہ
جمود طاری نہ ہو جائے جس کے بعد پھر انتشار کا نمبر ہے اور پھر فنا کا۔ لیکن یہ سب
کچھ ہو ہمیں اب بھی خیال کی قوت پر اعتماد ہے جو معاشی مصائب کے باوجود بھی اپنی دنیا
آپ پیدا کر سکتا ہے۔

ابن رشد

شاہزادہ ابو یعقوب یوسف کے دربار مین ابن طفیل سا حکیم ایک بست و ہفت سالہ نوجوان کو پیش کرتا ہے ۔ شاہزادہ پوچھتا ہے فلسفیون کا خیال آسمان کے بارے مین کیا ہے ۔ نوجوان ابھی شاہزادہ کی طبیعت سے واقف نہین مدعیان حمایت دین کے غیظ و غضب سے ڈرتا ہے جواب دیتا ہے مجھے تو فلسفہ سے کوئی دلچسپی نہین مگر تھوڑی ہی دیر مین شاہزادہ کی گفتگو سے وسعت معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کا دربار یاران شاطر کی انجمن ہے اب ہمارا نوجوان کھلتا ہے اور شاہزادہ کو اپنی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی سے گرویدہ کر لیتا ہے ۔ عظمت و اولوالعزمی کی مردم شناس نظر پہچان لیتی ہے کہ یہ نوجوان اوس کام کا اہل ہے جس کے انصرام کی اسے مدت سے آرزو تھی چنانچہ وہ ارسطو کی جامع اور مکمل شرح لکھنے کا کام اس کے سپرد کرتا ہے ۔ یہ نوجوان ابو ولید محمد ابن احمد ابن محمد ابن رشد تھا ۔

ابن رشد ۱۱۲۶ء مین قرطبہ کے ایک مشہور فقیہون کے خاندان مین پیدا ہوا ۔ وہ صرف حکیم ہی نہ تھا بلکہ فقیہ اور طبیب بھی ۔ ہم اوسے ۱۱۶۹ء مین اشبیلیہ مین اور اس کے کچھ دن بعد قرطبہ مین منصب قضا پر ممتاز پاتے ہین ۱۱۸۲ء مین ابو یعقوب نے جو خلیفہ تھا اوسے اپنا طبیب خاص مقرر کر کے بلایا لیکن تھوڑے ہی دن بعد وہ پھر اپنے مولد قرطبہ کا قاضی ہو کر چلا گیا ۔ اب زمانہ بدل گیا تھا فلسفیون کے خلاف جو نفرت پھیل رہی تھی اس نے ابن رشد کو بڑھاپے مین شہر بدر کرایا ۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد دربار مراکش نے اس کی قدردانی کی طرف توجہ کی کیونکہ اس کی وفات ۱۱۹۸ء مین مراکش کے قصر

شاہی مین ہوئی -

ابن رشد نے اپنی تمام عمر ارسطو کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کی شرح مین صرف کردی - اوس کی نظر سے دوسرے یونانی حکیمون کی کتابین بھی گذری تھین لیکن ارسطو کے سامنے اوس کی نظر مین کوئی بھی نہین جچا - وہ اوسی غلطی مین مبتلا تھا جس نے قرون وسطےٰ کے سارے فلسفہ کو وسعت نظر اور آزادی خیال سے محروم کر کے تقلید کے گورکھ دھندی مین ڈال دیا تھا - وہ ارسطو کو دنیا کا سب سے بڑا حکیم، انسان کامل بلکہ ما فوق الانسان اور خطا سے بری سمجھتا تھا - اس کے نزدیک ارسطو کا فلسفہ حکمت کا انتہائی باب اور عقل انسانی کی سب سے اونچی پرواز ہے - ارسطو کے خیالات مین کسی لغزش اور خطا کا امکان نہین البتہ شارحون نے اپنی سمجھ کے قصور سے اسکا منشا سمجھنے مین غلطیان کی ہین اس لئے لوگون کو ارسطو پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے لیکن آہستہ آہستہ حقیقت کے پردے سے نقاب اٹھے گی اور نکتہ چینون کی زبان بند ہو جائیگی -

ارسطو کے شارحون مین سے وہ ابن باجہ فارابی اور خصوصاً ابن سینا پر سختی سے اعتراضات کرتا ہے - خود اوس کی شرح زیادہ گہری نقادانہ نظر اور بہتر نظم و ترتیب کا پتہ دیتی ہے - وہ پہلے ارسطو کے اصل کلام کے معنی لکھتا ہے پھر اس کی شرح کرتا ہے کبھی اختصار کے ساتھ اوسط حجم کی کتابون مین اور کبھی تفصیل کے ساتھ ضخیم جلدون مین لیکن اس کا ماخذ بھی اوس کے پیشرووں کی طرح ارسطو کے نوفلاطونی شارح ہین اور انکے اغلاط کو اوس نے بھی اختیار کیا ہے - بلکہ وہ اکثر سکندر افرادیسی کی بہتر شرح کو چھوڑ کر ثماسطیوس کے سطحی خیالات کی پیروی کرتا ہے - مگر کبھی وہ ان دونون کی مخالفت کر کے اپنی ذاتی رائے بھی دیتا ہے -

سب سے پہلے تو ابن رشد ارسطو کی منطق کی کورانہ تقلید کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کو بغیر اس کے مطالعہ کے کامل سعادت نہیں حاصل ہوتی وہ افلاطون اور سقراط کے حال زار پہ افسوس کرتا ہے کہ وہ اس نعمت عظمیٰ سے محروم تھے۔ اوس کی نقادانہ نظر نے یہ تو معلوم کر لیا کہ ارسطو کی منطقی تصانیف میں سے ایساغوجی وغیرہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں لیکن وہ منطق میں ریطوریقا (rhetorica) اور بوطیقا (poetica) کا بھی شمار کرتا ہے۔ اس سے عجیب وغریب غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں ہیں۔ فن خطابت اور شعریات کے مصطلحات کو اوس نے کھینچ تان کر منطقی مصطلحات اور ان کتابوں کے مباحث کی کسی نہ کسی طرح تاویل کرکے انھیں منطقی مقالات بنا دیا ہے۔

اپنے پیشروؤں کی طرح ابن رشد بھی منطق کے لسانی عنصر پر اوس حد تک زور دیتا ہے جہاں تک وہ تمام زبانوں میں مشترک ہے۔ یہ مشترک عالمگیر معانی (concepts) اوسکے نزدیک تمام منطقی تصانیف میں ارسطو کے پیش نظر تھے۔ وہ کہتا ہے کہ عرب فلسفی کو بھی ان پر زور دینا چاہئے البتہ ان کی تشریح کے لئے اوسے مثالیں عربی زبان اور عربی ادب سے لینا چاہئیں الفاظ زبانوں میں مختلف ہیں لیکن عام معانی ایک ہیں اور یہی زیادہ اہم ہیں۔ علم عام معانی سے واقف ہونے کا نام ہے۔

منطق ابن رشد کے نزدیک وہ زینہ ہے جس سے انسان محسوسات کے علم سے معقولات کے علم تک پہونچتا ہے۔ عوام ہمیشہ محسوسات کی دنیا میں زندگی بسر کیا کریں گے۔ لیکن چند برگزیدہ ذاتیں حقیقت کا علم بھی حاصل کر سکتی ہیں۔ کیونکہ اگر ایک فرد بھی کائنات کی حقیقت نہ معلوم کر سکتا تو خدا کی ساری صناعی بیکار جاتی۔ ابن رشد کو یقین ہے کہ وہ خود بہت سی چیزوں کی حقیقت معلوم کر سکتا ہے۔ بلکہ حقیقت مطلق کو ڈھونڈھ کر نکال سکتا ہے اور

حقیقت اوس کے خیال مین ارسطو کے تصانیف مین موجود ہے۔ اس نقطۂ نظر سے وہ اسلامی علم دین پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے۔ بلاشبہ اوسے دین مین ایک خاص طرح کی حقیقت نظر آتی ہے لیکن علم دین کا وہ مخالف ہے۔ علم دین حقائق معرفت کو علم او رعقل کے ذریعہ سے ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ بے سود کوشش ہے۔ قرانی تنزیل و وحی کا مقصد ابن رشد کے نزدیک لوگون کی ذہنی تعلیم نہین ہے بلکہ انکی اخلاقی اصلاح۔

ابن رشد اور اوس کے پیشرو ؤن خصوصًا ابن سینا مین سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ابن رشد صاف صاف دنیا کے قدیم ہونے کا قائل ہے۔ دنیا بہیئت مجموعی قدم اور وجوب رکھتی ہے اور اس مین امکان۔ یا عدم یا تغیر کی گنجائش نہین۔ ہیولے اور صورت صرف خیال مین تجرید کے ذریعہ ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہین صورت ہیولے کے اندر اس طرح موجود ہے جیسے چھلکے مین بیج جو چھلکے سے پیوست ہو لیکن پھر بھی صورت کا مرتبہ مادے سے بلند ہے کیونکہ وہ خدائی چیز ہے اور ابد تک مادے سے ظاہر ہوا کریگی آفرنیش مطلق اور عدم مطلق کوئی چیز نہین کیونکہ حادثہ قوت سے فعل کے طرف منتقل ہونے اور پھر قوت کی طرف رجوع کا نام ہے۔

اگر دنیا حادث ہوتی تو اوس سے ایک دوسری دنیا پر حکم لگایا جاتا جس سے وہ پیدا ہوئی اور اوس دوسری دنیا سے ایک تیسری دنیا پر اور یہ سلسلہ کبھی نہ ختم ہوتا۔ اسی طرح دنیا کو ممکن ماننے سے بھی دوسری ممکن دنیاؤن کا ایک نامتناہی سلسلہ ماننا پڑتا۔ ابن رشد کے نزدیک صرف اوسی صورت مین کہ ہم ایک واحد۔ قدیم۔ واجب دنیا کو مانین ہمین ایک دنیا سے الگ ذات کے وجود پر حکم لگانے کا حق حاصل ہوتا ہے جو کائنات کی حرکت اور خوشنما نظام کو ہمیشہ قایم رکھتی ہے اس لئے ہم اوسے خالق عالم کہہ سکتے ہین

اس ذات برتر اور بقیہ اشیاء کے درمیان آسمانی بروں کو حرکت دینے والی عقول واسطے کے طور پر ہیں ۔ خالق عالم یعنی خداوند تعالےٰ کی ذات کا اہم ترین پہلو ابن رشد خیال کو سمجھتا ہے ذات باری کی صرف ایک ثبوتی صفت ہے اور اوسے ان الفاظ سے ظاہر کر سکتے ہیں ۔ اپنے موضوع سے یگانگت ذات رکھنے والا خیال جس کے ذریعہ سے وحدت اور وجود کا ایک ہونا ثابت ہوتا ہے یعنی وجود اور وحدت ذات باری کی صفات نہیں ہیں بلکہ ان کا وجود صرف خیال میں ہوتا ہے ۔

اب اگر یہ پوچھا جائے کہ آیا خیال الہی جزئیات کا بھی حامل ہے یا محض کلیات کا تو ابن رشد کا جواب ہے دونوں میں سے ایک کا بھی نہیں کیونکہ وحدانی ذات دونوں سے بالا ہے ۔ اوس کا خیال در ہمہ کا فاعل ہے اور در ہمہ پر حاوی ہے ۔ خدا تعالےٰ سب اشیا کا جوہر فاعل سب کی صورت اور علت اور سب کا آخری مقصد ہے ۔

موجودات کی دو قسمیں ہیں متحرک اور حرکت میں لانے والے یا جسم اور معقول ۔ لیکن جسم اور معقول دونوں میں تکمیل کے مختلف مدارج ہیں ۔ اور دونوں میں ایک طرح کی توازی ہے ۔ عقول جتنے ذات خداوندی سے دور ہوتے جاتے ہیں اوسی قدر کم بسیط ہوتے ہیں چنانچہ اونے عقول مثل مادی اشیا کے ہیولےٰ اور صورت سے مرکب ہیں ۔ ان میں جو ہیولےٰ ہے وہ مادہ تو نہیں جو انفعال کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن مادے سے ملتی جلتی چیز ہے جو اپنی ذات میں دوسری چیزوں کو قبول کر سکتی ہے یہ باریک فرق انفعال اور قبول کا ابن رشد نے اصل میں عقل انسانی پر نظر کرتے ہوئے قایم کیا ہے ۔

یہ بات ابن رشد کے نزدیک یقینی ہے کہ روح انسان کا اپنے جسم سے وہی تعلق ہے جو صورت کا ہیولےٰ سے ہے ۔ وہ اس عقیدہ میں بہت راسخ ہے ۔ کثیر التعداد

لافانی ارواح کے وجود کی وہ ابن سینا سے مخالفت کرتے ہوئے صاف صاف تردید کرتا ہے۔ روح کا قیام اس کے خیال مین محض جسم کی تکمیل کے لئے ہے۔ تعجب ہے کہ روح اور عقل کے معاملہ مین ابن رشد اپنے استاد ارسطو سے بڑی حد تک اختلاف رکھتا ہے۔ اس نے اپنے عقیدہ کی بنا تو فلاطونی خیالات پر رکھی ہے جسم انسانی مین جو عقل ہے وہ ظاہر ہے کہ ادنے یا مادی عقل ہے۔ لیکن ابن رشد اس کی کثرت کا قائل نہین اوس کے نزدیک یہ تمام انسانون مین ایک ہے۔ روح اور انفرادیت سے بالا قدیم لافانی عقل ہے اور یہ اوتنی ہی قدیم اور لافانی ہے جتنی کہ عقل محض یعنی ہم سے مافوق عقل فعال۔

عقل فعال اور عقل قابل (اب ہم عقل مادی کی جگہہ یہی لفظ استعمال کرین گے) کے باہمی تعلق پر ابن رشد روشنی نہین ڈالتا۔ افراد انسانی کی روحانی زندگی گویا وہ مقام ہے جہان یہ عاشق و معشوق ملتے ہین۔ اب چونکہ انسان بہ لحاظ خیالات اور اپنی روحانی سیرت کے مختلف ہوتے ہین اس لئے اون مین عقل فعال اور عقل قابل کا تناسب مختلف ہوتا ہے۔ سب انسان بہ لحاظ عقل کی ایک ہی سیڑھی پر نہین ہین۔ لیکن کائنات مین عقل کی میزان تبدیل نہین ہوتی البتہ افراد مین اوس کی تقسیم مین کمی بیشی ہوتی ہے۔ یہ ایک فطرتی ضرورت ہے کہ ہر عہد مین ایک فلسفی موجود ہو۔ خواہ وہ ارسطو ہو یا ابن رشد جس کے ذہن مین موجودات معانی بن جاتے ہین۔ بلا شبہ افراد کے خیالات زمانے کے پابند ہین اور عقل قابل جہان تک کہ وہ افراد مین ہے متغیر ہے لیکن عقل نوعی کی حیثیت سے یہ عقل ابدی اور غیر متغیر ہے مثل آسمانی کرون کی عقل فعال کے۔ تین کفر کے کلمات ہین جو ابن رشد کے نظام مین اور اوس کے زمانے کے تین عالمگیر

مذاہب میں نزاع پیدا کرتے ہیں ایک تو عالم اجسام اور اس کو حرکت دینے والے عقول کا قدیم ہونا۔ دوسرے تمام حادثات کا لازمی طور پر علت و معلول کے سلسلہ میں جکڑا ہونا جس کی بنا پر معجزہ وغیرہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تیسرے تمام افراد کا فانی ہونا۔

اگر ابن رشد کی منطق کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو خدا کے ماتحت مستقل بالذات آسمانی کرون کی عقول کو ماننے کی کوئی کافی وجہ نہیں ہے لیکن ابن رشد یہاں اپنے پیشروون کی طرح لوگون کی مخالفت سے بچتا پھرتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ عقول انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف نوعی حیثیت سے مختلف ہیں ان کے ماننے کی غرض صرف یہ تھی کہ جب تک نظام عالم کی وحدت محقق نہ ہو جائے اوس وقت تک یہ مختلف حرکات کا باعث قرار پائین لیکن جب نظام بطلیموسی مسمار ہو گیا تو ان واسطون کی ضرورت نہ رہی اور عقل فعال اور ذات خداوندی کا مرادف ہونا جس کی کوشش پہلے بھی حکما اور علماء دین نے کی تھی ثابت ہو گیا۔ اب قدیم عقل نوع انسانی کو بھی خدا کی ذات سے متحد ثابت کر دینے میں صرف ایک قدم باقی رہ گیا۔ خود ابن رشد نے یہ قدم نہیں اٹھایا لیکن اوس کے تصانیف کی رو سے "ہمہ اوست" کا مسئلہ نکالا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مادیت بھی اوس کے کلام سے اپنے حسب منشا نتیجہ نکال سکتی ہے۔ کیونکہ جب ابن رشد کی طرح کوئی فلسفی مادی عناصر کے قدم اور اون کی فعالیت پر زور دیگا وہان عقل خواہ وہ بادشاہ ہی کیون نہ ہو اپنی بادشاہت کے لئے مادہ کی محتاج ہو جائے گی۔

ابن رشد کا نظری فلسفہ وقت نظر پر مبنی ہے اور تناقض سے بری ہے اور یہی وجہ سے ایک عالی مرتبہ فلسفی بنانے کے لئے کافی ہے لیکن اوس کے عہدا ور اوس کے منصب قضا کا تقاضا تھا کہ وہ فلسفۂ عملی کی طرف بھی توجہ کرے ہم اختصار کے ساتھ

اوس کے خیالات کا ذکر کرتے ہین۔

ابن رشد جب کبھی موقع پاتا ہے اپنے زمانے کے جاہل حکمرانون اور دشمن تعلیم علماء دین کی خبر لیتا ہے۔ تاہم اوس کے نزدیک جماعت مین زندگی بسر کرنا عزلت گزینی سے بہتر ہے اوس نے اپنے حریفون سے بھی بہت سی اچھی باتین سیکھین۔ اس کی رائے مین انسان تنہائی کی زندگی مین علوم و فنون کی تکمیل نہین کر سکتا زیادہ سے زیادہ اوس علم سے جو وہ پہلے حاصل کر چکا ہے لطف اٹھا سکتا ہے۔ ہر فرد کو جماعت کی فلاح کے لئے بھی کچھہ نہ کچھہ کرنا چاہیئے عورتون کو بھی مردون کی طرح ریاست اور جماعت کی خدمت کرنا چاہیئے۔ یہان ابن رشد افلاطون کی پیروی کرتا ہے۔ (افلاطون کی "ریاست" سے وہ واقف نہ تھا) اور نہایت معقول بات کہتا ہے کہ اوس کے زمانہ کے افلاس اور مصیبت کا باعث یہ ہے کہ عورتین گھریلو جانورون یا پودون کی طرح رکھی جاتی ہین۔ بجائے اس کے اونھین مادی اور ذہنی دولت کے پیدا کرنے اور اوس کی حفاظت مین شریک کیا جائے۔

علم الاخلاق مین ہمارا فلسفی بہت سختی سے فقیہون کے اس اصول پر اعتراض کرتا ہے کہ کسی کام کے اچھے یا برے ہونے کا سبب صرف خدا کی مرضی ہے۔ اصل مین سب چیزون کی اخلاقی حیثیت قانون فطرت یا اصول عقل کے لحاظ سے ہے وہ فعل جو عقل پر مبنی ہے خیر ہے البتہ آخری عدالت اپیل انفرادی عقل نہین بلکہ مدنی عقل ہے۔

ابن رشد مذہب کا بھی ایک مدبر کے نقطۂ نگاہ سے مشاہدہ کرتا ہے مذہب کی قدر وہ اوس کے اخلاقی مقصد کے سبب سے کرتا ہے۔ مذہب ایک قانون ہے نہ کہ کوئی نظام حکمت۔ اس لئے وہ اون علمائے دین کی ہمیشہ مخالفت کرتا ہے جو احکام شرع کی اطاعت کے علاوہ ان کے سمجھنے کی بھی کوشش کرتے ہین۔ وہ امام غزالی پر یہ الزام

لگتا ہے کہ انھون نے فلسفہ کا اثر مذہب پر ہونے دیا اور اس طرح بہت سے لوگون کو کفر اور الحاد مین مبتلا کر دیا۔ جو کچھ قرآن مین ہے اوس پر عوام الناس کو ایمان لانا چاہئے لیکن اوسے علمی دلیل نہین سمجھنا چاہئے بلکہ تمثیل اور کہانی اسی ذیل مین وہ دو ثبوت خدا کے ہوتے ہین جو قرآن مین ہین اور جنہین ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ تمام موجودات کو ایک کفیل کی ضرورت ہے اور وہ خدا ہے دوسرے یہ کہ نباتات اور حیوانات مین جان ڈالنے والی کوئی ذات ہونا چاہئے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ وہ دلایل جو علماے دین خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہین منطقی دلایل کے سامنے نہین ٹہر سکتے۔ اس سے الحاد کو اور مدد ملتی ہے چنانچہ اخلاق اور ریاست کی خاطر نیم ملاؤن کی مخالفت کرنا چاہئے۔

برخلاف اس کے عالم فلسفیون کو یہ حق ہے کہ وہ کلام الٰہی کی تفسیر کرین۔ وہ اعلےٰ حقیقت کی روشنی مین اس کے اصلی منشا کو سمجھتے ہین اور معمولی آدمی کو وہ اس مین سے صرف اتنا بتاتے ہین جتنا وہ سمجھ سکے۔ مذہبی اصول اور فلسفہ چونکہ مختلف مقاصد رکھتے ہین اسی لئے اون مین اتفاق ہے۔ انمین وہ نسبت ہے جو علم و عمل مین ہوتی ہے۔ لیکن فلسفہ عرفان حقیقت کی اعلیٰ صورت ہے یہ خیال ایک حد تک مذہبی پر مبنی ہے۔ کوئی مذہب اسے گوارا نہ کرے گا کہ حقیقت کی تعلیم مین فلسفہ کی فرمانروائی کو تسلیم کرے۔ چنانچہ قدرتی بات تھی کہ مغرب کے علمائے اسلام نے اپنے مشرقی بھائیون کی طرح زمانہ کی موافقت سے فائدہ اٹھایا اور اوس وقت تک چین نہین لیا جب تک کہ انھون نے فلسفہ کو جو علم دین کا مالک بن گیا تھا اس کا غلام نہ بنا لیا۔

ہسپانیہ مین عربون کی حکومت

عموماً تمام علمی مقالات اور خصوصاً تاریخی مضامین دو طرح کے ہوتے ہین - ایک وہ جو تحقیق کی غرض سے لکھے جاتے ہین اور جن مین کسی مسئلہ پر نادر اور مستند معلومات بہم پہونچائی جائے دوسرے وہ جو کسی بحث کو چھیڑنے اور ارباب علم کو اس کی طرف توجہ دلانے کا باعث ہون - ذیل کا مضمون دوسری قسم کا ہے اور اوس کے لکھنے والے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اوس بڑے کام کی طرف جسے وہ خود نہین کر سکتا دوسرون کو راغب کرے -

---

انیسوین صدی یورپ کی تمدنی تاریخ مین تحقیق علمی کی صدی کہلانے کی مستحق ہے یہ سچ ہے کہ اس دور مین پہلے تیس سال سے قطع نظر کرکے حکمت و فلسفہ کا بازار سرد ہوگیا لیکن اس کے مقابلہ مین علوم مخصوص مثلاً سائنس کے تمام شعبون - تاریخ - جغرافیہ - علم الالسنہ وغیرہ نے حیرت انگیز ترقی کی - خصوصاً تاریخ کو تو اس عہد مین وہ بلندی نصیب ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہین ہوئی تھی - تاریخ اس زمانے مین محض چند غیر مربوط اور غیر مستند واقعات کا مجموعہ نہین رہی بلکہ اس کے لکھنے مین تحقیق و کاوش اور نظم و ترتیب سے کام لیا جانے لگا - اس کے علاوہ مورخین ایک بڑی حد تک اپنے ذاتی عقائد اور جذبات سے قطع نظر کرکے صرف واقعات کی بنا پر غیر جانبدارانہ رائے بھی دینے لگے تمام یورپ کی مکمل تاریخ قرون وسطے کی آخری صدیون سے دم تحریر تک مرتب ہوگئی اور بعض بلند حوصلہ تاریخ عالم کا خواب دیکھنے لگے -

لیکن تاریخ یورپ کے سلسلہ کی ایک کڑی جو ہمیشہ سے کمزور چلی آتی ہے اس عہد مین بھی کمزور رہ گئی یعنی ہسپانیہ کی آٹھوین صدی سے لیکر چودھوین صدی تک کی تاریخ غیرمکمل اور غلط رہی اس کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ یورپ کے مورخ عام طور پر ہسپانیہ مین عربی حکومت کو مغربی تمدن مین ایک خارجی عنصر سمجھتے تھے جس سے اون کے خیال مین عام سیاسی اور تمدنی نشو نما پر کوئی قابل ذکر اثر نہین پڑا۔ سیاست اور اوس کے مرکز یعنی ریاست کے اعتبار سے ممکن ہے کہ یہ بات صحیح ہو لیکن جہان تک ذہنی زندگی کا تعلق ہے یہ کہنا کہ تاریخ ہسپانیہ کا عربی دور ایک آندھی کی طرح آکر گذر گیا اور اوس نے کوئی آثار باقیہ یورپ کے تمدن مین نہین چھوڑے کچھ تو ناواقفیت اور کچھ بے انصافی پر مبنی ہے اس مضمون مین کوشش کیجائے گی کہ اس خیال کی تردید کر کے دکھایا جائے کہ یورپ کی ذہنی زندگی پر ہسپانیہ کے عربی تمدن کا بہت اہم اثر پڑا ہے اور اس لئے یورپ کے مورخین کا یہ فرض ہے کہ وہ ہسپانیہ کی قرون وسطے کے آخری دور کی تاریخ ادسی کاوش اور تحقیق کے ساتھ مدون کرین جو انھون نے عام طور پر مغربی ممالک کی تاریخ لکھنے مین صرف کی ہے۔

تاریخ ہسپانیہ کے عربی دور کی اہمیت تاریخ اسلام کے لئے اور بھی زیادہ ہے ہسپانیہ مین اموی حکومت کا زمانہ ہماری تاریخ مین عہد زرین ہے نہ صرف اقتصادی فلاح و بہبودی اور سیاسی اقتدار کے لحاظ سے بلکہ ارتقاے ذہنی اور علم و تعلیم کی ترقی کے اعتبار سے بھی یہ عہد ساری تاریخ اسلام مین اپنا نظیر نہین رکھتا۔ اس لئے مسلمان ارباب علم کی بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس عہد کی تاریخ کی تدوین مین یورپ کے مورخون کا ہاتھ بٹائین۔

اگر ہم اپنے نقطہ نظر کو اور وسیع کرین اور تاریخ عالم کے لحاظ سے ہسپانیہ کے

ہشت صد سالہ عربی دور کو دیکھیں تو بھی اس کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی ایک ایشیائی
قوم کا ترک وطن کرکے سر زمین یورپ میں آباد ہونا وہاں کے اصلی باشندون پر اپنا اثر
ڈال کر اور ایک حد تک اون کا اثر قبول کرکے ایک متحدہ سامی۔ آری تمدن کی بنیاد ڈالنا
اور شرق و مغرب کے امتزاج کا شاندار نمونہ پیش کرنا ایسے مظاہر ہین جو تاریخ عالم لکھنے
والے کے غور و فکر کے طالب ہین اور ان سے چشم پوشی کرنا بہت بڑا علمی قصور ہے
مگر مورخین کو ملزم قرار دینے سے پہلے ہمین یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس عہد کی تاریخ
لکھنے مین کیا دقتین تھین اور ان کو دور کرنا کس قدر دشوار تھا۔ تاریخ ہسپانیہ کے
دو ماخذ ہو سکتے تھے ایک تو عرب مورخین کی تصانیف دوسرے عہد میہ کے ہسپانیون کی
لکھی ہوئی تاریخین۔ قسم اول کی کتابون کا جو حشر ہوا وہ ارباب خبر سے مخفی نہین۔ عرب
حکومت کے زوال کے زمانے مین ہسپانیہ کے مسیحی باشندے خصوصًا رومی کلیسا کے پادری
تعصب اور تنگ نظری سے اس قدر دیوانے ہو گئے تھے کہ انھون نے عربون کی علمی کتابون
کو سارے ملک مین تلاش کرکے کمال بیدردی کے ساتھ برباد کیا۔ چنانچہ دنیا کے متعصبون
کے پیشوا اسقف زیمنیس (Ximenes) نے بیشمار عربی کتابون کو جمع کرکے آگ
مین جلوا دیا۔ پروفیسر نکلسن لکھتے ہین وہ یہ کتب خانہ اسکندریہ کے خلیفہ عمر کے حکم سے جلائے
جانے کی طرح مشتبہ افسانہ نہین بلکہ مستند واقعہ ہے کہ بیرحم بطریق زیمنیس نے تمام قلمی
عربی کتابون کو جو اوس کے ہاتھ آئین جمع کرکے انھین آگ کے شعلون کی نذر کردیا اور
اس طرح اسلامی تمدن کی سات صدیون کی قلمی یادگار کو ایک دن مین مٹا دینا چاہا۔ عرب
مورخین کی بہت تھوڑی کتابین تھین جو اس دستبرد سے محفوظ رہین اور جس سے آجکل
کے مورخین کام لے سکتے۔ اب رہین ہسپانوی مسیحیون کی تاریخین اون کا یہ حال ہے کہ

اون کے مصنفون نے عربون کو بدنام کرنے کے لئے بلا تامل صدہا واقعات اپنی طرف سے گھڑ کر عرب مصنفین کی طرف منسوب کر دئے ہین۔ خصوصًا کانڈے (Conde) نامی مورخ نے تو اس معاملہ مین وہ سرگرمی دکھائی کہ اگر ہالینڈ کا مستشرق ڈوزی (Dozy) اپنی زندگی بھر کی کوشش سے حقیقت کے رخ سے نقاب نہ اٹھاتا تو دنیا آج ہسپانیہ کے عربون کو وحشی اور خونخوار سمجھتی رہتی۔ المانوی مورخ آوگسٹ مولر (A. Muller) رقمطراز ہے "ہالینڈ کے مستشرق ڈوزی نے جو ۱۸۸۳ء مین فوت ہوگیا اپنی زندگی کا سب سے بڑا حصہ اس کام مین صرف کر دیا کہ اسلامی اور ایک حد تک مسیحی ہسپانیہ کی تاریخ کو اس ابتری سے نکالے جس مین اوسے ناقابل اعتبار ہسپانوی مورخ کانڈے نے ڈال دیا تھا۔ وہ سفید جھوٹ جو اس مورخ نے عرب مصنفین کے حوالے سے ہماری صدی کے نصف اول کے عربی نہ جاننے والے مورخین کے گلے منڈھ دئے تھے ذاتی حیثیت سے تو کانڈے اور اس کی کتاب کے انجام پر نظر ڈالتے ہوئے کسی حد تک درگذر کے قابل ہین لیکن نفس الامر مین ان کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ ڈوزی کے پہلے کی لکھی ہوئی اسپین کی سب تاریخون کے وہ حصے جن کا ماخذ کانڈے ہے قریب قریب بیکار رہین۔"

ان باتون کو دیکھتے ہوئے مورخین کی کوتاہ قلمی ہسپانیہ کے عہد عربی کی تاریخ کے بارے مین ایک حد تک درگذر کے قابل ہے۔ پھر بھی اہل ہمت کو کوئی چیز نہین روک سکتی۔ چنانچہ ڈوزی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس مضمون کا ماخذ زیادہ تر ڈوزی کی دلچسپ اور محققانہ تصنیف ہے۔ ضمنًا دوسرے مصنفین کی کتابون سے بھی مدد لی گئی ہے لیکن یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہان صرف ہسپانیہ کے عربونکی

تمدنی نشو و نما پر ایک سرسری نظر ڈالنا مقصود ہے ضروری تاریخی واقعات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کئے جائینگے تاکہ مطلب کی توضیح ہو سکے -

ہجرت کی پہلی صدی مین افریقیہ پر مسلمانون کا قبضہ ہو چکا تھا ۸۹ھ مین موسے خلافت اموبیہ کی طرف سے افریقیہ کا حاکم تھا - اس سال اوس نے اپنے آزاد کردہ غلام اور سردار فوج طارق کو قیصر جولین کی دعوت پر ہسپانیہ بھیجا تاکہ وہان سے خراج وصول کرے - طارق نے حکم حاکم سے تجاوز کرکے ہسپانیہ کے بڑے حصہ کو فتح کر لیا - دوسرے سال موسے خود ہسپانیہ پہونچا اور طارق پر اوس کا عتاب نازل ہوا لیکن خود موسے نے طارق کے شروع کئے ہوئے کام کو تکمیل تک پہونچایا اور سارے ہسپانیہ کو فتح کرکے حکومت افریقیہ کے ماتحت ایک صوبہ بنا لیا (سنہ ۷۱۱ تا ۷۱۲ء) اس کے بعد کے چالیس سال مین ہسپانیہ کی تاریخ عرب قبائل کی خانہ جنگی کا منظر ہے جس کا خاتمہ عبد الرحمن ابن معاویہ ابن ہشام اموی کے ہسپانیہ کو فتح کرنے اور سارے ملک مین اپنی حکومت قائم کرنے سے ہوا -

عبد الرحمن کی جرأت و بسالت بھی یادگار رہیگی تن تنہا ترک وطن کرکے غیر ملک مین جانا محض اپنی قوت بازو سے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنا ایسا کام ہے جس کی صرف چند مثالین تاریخ عالم مین ملتی ہین -

عبد الرحمن کی شجاعت اور اقبالمندی کی داد اوس کے اور اوس کے خاندان کے دشمن خلیفہ منصور عباسی تک کو دینا پڑی ایک دن منصور نے دربار مین اپنے حاشیہ نشینون سے پوچھا بتاؤ قریش کا باز کون ہے لوگون نے مختلف شجاعان عرب کے نام لئے کہا نہین کسی نے کہا خلیفہ سفاح کہا نہین ایک صاحب بولے حضور خود کہا نہین

جب لوگ ساکت ہو گئے تو منصور نے کہا عرب کا باز عبد الرحمن ابن معاویہ ابن ہشام اموی ہے واقعی جس طرح قلیل عرصہ مین بے یار و مددگار عبد الرحمن نے اپنی سلطنت ہسپانیہ مین قایم کی اوسے دیکھتے ہوئے واقعی وہ اسی لقب کا مستحق ہے سنہ ۷۵۵ء مین عبد الرحمن ہسپانیہ پہونچا اور سنہ ۷۵۶ء مین وہ تمام ملک پر قابض ہو چکا تھا اور وہ سلطنت قایم کر چکا تھا جو تین سو سال تک اوس کی اولاد مین باقی رہی۔ عبد الرحمن ثالث کے زمانہ مین (سنہ ۹۱۲ تا ۹۶۱ء) یہ سلطنت نصف النہار پر پہونچ گئی سنہ ۹۲۹ء مین اوس نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ اوس کے بیٹے حکم ثانی کے عہد خلافت (سنہ ۹۶۱ تا ۹۷۶ء) مین سلطنت اوسی دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ باقی رہی۔ لیکن اوس کے جانشین اس امانت عظمیٰ کو نہ سنبھال سکے اور اون کے عہد مین زوال شروع ہو گیا سنہ ۱۰۳۱ء مین اہل بربر نے اوس سلطنت کو برباد کر کے افریقیہ کو اپنا صوبہ بنا لیا ہسپانیہ مین اب طوائف الملوکی شروع ہو گئی۔ جو چھوٹی چھوٹی سلطنتین ملک کے مختلف حصون مین تھین اون مین سے سلطنت غرناطہ (سنہ ۱۲۳۲ تا ۱۴۹۲ء) امتیاز رکھتی ہے۔ اس سلطنت کے آخری تاجدار کو سنہ ۱۴۹۲ء مین فرڈی نینڈ اور اسابیلا کی متحدہ فوج نے شکست دی اور اسلامی سلطنت کا چراغ ہسپانیہ مین ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ اس مختصر تاریخی تمہید کے بعد ہم اختصار کے ساتھ اصل مطلب یعنی ہسپانیہ کے عربی تمدن کا نشو و نما آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہین۔ عربون نے ایوان تمدن کی تعمیر ہسپانیہ مین اپنا قدم مضبوطی کے ساتھ جمانے سے پہلے ہی شروع کر دی تھی۔ عبد الرحمن اول خود شاعر تھا اور شعرا کا قدردان شعر و شاعری کا چرچا شاندار عمارتون کی تعمیر اور علوم و فنون کی تعلیم جو تمدن کی بنیادین ہین اوسی کے زمانہ مین ڈالی جا چکی تھین۔ لیکن اب تک ہسپانیہ کے عرب تمدن کے تمام شعبون مین مشرقی اسلامی ممالک کے دست نگر تھے۔ وہ اب تک بے وطن تھے اسلئے

اون کی فکر اور تخیل کو کوئی لنگر نہین ملا تھا جس زمین میں بستے تھے اوس سے بے تعلقی اونکے فاتحانہ مقاصد کو تو مدد پہونچاتی تھی لیکن تمدنی حیثیت سے سخت مضر تھی کیونکہ تمدن ایسا درخت ہے جس کی اونچی شاخین آسمان تک پہونچتی ہون لیکن اوس کی جڑین زمین ہی سے پیوستہ ہوتی ہین اور جب تک کوئی قوم کسی زمین مین جڑ نہ پکڑے وہ اعلےٰ تمدنی مدارج طے نہین کرسکتی۔

ہسپانیہ کے نوآبادعربون خصوصاً فرمانروا خاندان یعنی عبدالرحمٰن اور اوس کے متعلقین کو اب تک جو اجنبیت سرزمین مغرب سے تھی اور جس حسرت سے یہ لوگ اپنے وطن اصلی کو یاد کرتے تھے اوس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا جو خود عبدالرحمٰن کی تصنیف سے ہین -

تبدّت لنا وسط الرصافة نخلةٌ — تنائت بارض الغرب عن بلد النخل
فقلت شبیہی فی التغرب والنوی — وطول التنائی عن بنیّ وعن اہلی
نشأت بارضٍ انت فیہا غریبۃٌ — فمثلک فی الاقصاء والمنتای مثلی
سقتک غوادی المزن فی المنتای الذی — یسحّ ویستمری السماکین بالوبل

رصافہ مین ایک کھجور کا درخت نظر آیا جو کھجورون کے ملک سے دور ہوکر بلاد غرب مین آپڑا ہے۔ مین نے کہا اے غربت اور جدائی مین میری مثال اور اہل وعیال سے دوری اور مہجوری مین میری شبیہ۔ تو پراے دیس مین پلا اور بڑھا ہے دور افتادگی مین تیری مثال وہی ہے جو میری۔ تجھے وقت سحر کے بارش نے سینچا ہے جس کے چھینٹون سے غریب بیچارے سیراب ہوتے ہین -

اسی مضمون کے چند شعر عبدالرحمٰن کے عزیز عبدالملک بن عمر بن مروان بن

الحکم الاسوی کے کلام مین پائے جاتے ہین جنہین یورپ کے مستشرق عام طور پر خود عبد الرحمن کی طرف منسوب کرتے ہین۔ عبد الملک کہتا ہے۔

یا نخل انت فریدا تو مثلی | فی الارض نائیۃ عن الاھل
تبکی وھل تبکی مکیمسۃ | عجماء لم تجبل علی جبلی
ولو انھا عقلت اذاً لبکت | ماء الفرات ومنبت النخل
لکنھا حرمت واخرجنی | بغضی بنی العباس عن اھلی

اے کھجور کے درخت تو میری طرح اکیلا ہے۔ اس سرزمین مین اپنے ساتھیون سے دور ہے ہم انسان تو خیر رو لیتے ہین لیکن کیا وہ خوشہ دار درخت بھی رو سکتا ہے جو بے زبان ہے۔ اور جس کی طبیعت میری طبیعت سے مختلف ہے۔ اگر وہ ذی عقل ہوتا تو ضرور روتا آب فرات اور کھجورون کے ملک کی یاد مین لیکن وہ اس سے محروم ہے رہا مین سو مین نے اپنے آپ جلا وطنی اختیار کی ہے اوس بغض کی وجہ سے جو مجھے بنی عباس سے ہے۔

لیکن ہسپانیہ سے عربون کی یہ بے تعلقی اور اجنبیت ہمیشہ قائم رہنے والی چیز نہ تھی۔ دسوین صدی کے نصف آخر مین جہان سلطنت امویہ کی بنیاد مستحکم ہو چکی تھی اور اس کا سیاسی اقتدار تمام یورپ اور دنیائے اسلام مین تسلیم کیا جا چکا تھا۔ بلکہ عبد الرحمن ثالث خلیفہ کا لقب اختیار کر کے مسلمانون کی دینی اور دنیوی پیشوائی کو سلاطین امویہ کی ذات مین جمع کر چکا تھا ان سلاطین اور اون کے ہم قومون کو جو بیگانگی سرزمین ہسپانیہ سے تھی وہ جاتی رہی اوس کی محبت نے اون کے دل مین گھر کر لیا تھا اور انھون نے اپنا گہرا اور قوی جذبہ وطنیت اوس کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ قوت اور زندگی کے

سرچشمے یعنی زمین وطن سے تعلق کو مضبوط کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمدن مین ایک نئی روح پیدا ہوگئی اور علم و تعلیم۔ فنون لطیفہ۔ اقتصاد و معاشرت غرض زندگی کا ہر شعبہ معراج ترقی پر پہونچ گیا۔ یہ زمانہ تمدنی زندگی خصوصًا علوم و فنون کے شباب کا زمانہ ہے۔ خلیفہ حکم ثانی بچپن سے علم کا قدردان تھا اوس نے علمی ترقی کے راز کو سمجھا یعنی اپنے ملک کے طالب علموں کو غیر ملکون کے دور و دراز سفر سے بچانا اور خود اپنے ملک مین مدارس اور کتب خانے قایم کرکے اوسے علم و تعلیم کا مرکز بنایا۔ حکم ثانی کے حکم سے لوگون نے تمام مشرقی ممالک اسلامی کا سفر کرکے ہر علم و فن کی کتابیں فراہم کین اور خلیفہ کے کتبخانہ مین چار لاکھہ کتابون کا مجموعہ ہوگیا جنھین عوام کے عقیدہ کے مطابق حکم نے تمام و کمال پڑھا تھا اور ان پر حاشیے لکھے تھے۔ اوس زمانہ کے معیار سے اگر دیکھا جائے تو یہ کتبخانہ نہایت عظیم الشان چیز تھی اور غالبًا کتابون کا اتنا بڑا مجموعہ تمام دنیا مین کہین ایک جگہہ موجود نہ تھا یوان تعلیم کی بنیاد کتب خانہ سے مضبوط کرکے حکم ثانی نے مدارس کی طرف توجہ کی لوگون کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ابتدائی تعلیم اوس زمانہ مین اس قدر عام تھی کہ آج کل سوا یورپ کے دو چار ملکون کے اور کہین نہین ہوتی ہے۔ ڈوزی لکھتا ہے "اندلس مین قریب قریب ہر شخص کو لکھنا پڑھنا آتا تھا حالانکہ مسیحی یورپ مین بڑے بڑے لوگ بھی باستثنائے پیشوایان دین اس معاملہ مین محض کورے تھے"

زیادہ تر علوم دین ریاضی۔ سائنس کے مختلف شعبون اور طب کی تعلیم ہوتی تھی فلسفہ کی طرف ابھی تک توجہ نہین تھی کیونکہ نوجوان قوم مین ابھی فطرتی سادگی جوش اور بھولاپن موجود تھا اور قوت عمل کا اس قدر وفور تھا کہ سوچنے کی فرصت کم ملتی تھی دوسرے حکومت کی طرف سے اس معاملے مین سختیان بھی بہت تھین۔ علمائے دین یہان سلطنت مین

بہت دخیل تھے اور انھین فلسفہ سے کد تھی ۔ بڑے فلسفی سب اوس وقت پیدا ہوے جب عربوں کی سیاسی عظمت مین زوال شروع ہوگیا تھا ۔ تمدن کی امانت کا بار صدیون تک اُٹھانے کے سبب سے نسل کی حیاتی قوت گھٹ گئی تھی اور اوس پر تھکن اور ماندگی کے آثار ظاہر ہوے لگے تھے ۔ لیکن صدیون کے تجربہ نے جہان قوت عمل کو کم کردیا تھا وہان وسعت نظر اور بلندی فکر پیدا کردی تھی ۔ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر ہسپانیہ مین وہ حکما گذرے جو دوسرے ملکون مین صدیون مین پیدا ہوتے ہین ۔ ابن باجہ ۔ ابن طفیل ۔ ابن سبعین ۔ ابن رشد ابن خلدون ان سب کا زمانہ گیارھوین صدی کے آخر سے لیکر تیرھوین صدی کے آخر تک ہے ۔

لیکن مشرقی اسلامی ممالک اور ہسپانیہ مین فلسفہ کے معاملہ مین بہت بڑا فرق ہے ممالک مشرقی مین فلسفہ عوام مین بھی بہت مقبول ہوگیا تھا اور اوس کا اثر عملی زندگی پر بھی پڑا تھا ۔ برخلاف اس کے ہسپانیہ مین فلسفہ کا مطالعہ ایک خاص طبقے میں محدود تھا ۔ اور اوس سے آگے نہین بڑھا چنانچہ اخوان الصفا کے مقابلے کی کوئی جماعت ہمین ہسپانیہ مین نظر نہین آتی ۔

پہلے کہا جاچکا ہے کہ ہسپانیہ مین یہ زمانہ طوائف الملوکی کا زمانہ تھا اس سے جو سیاسی نقصان قوم کو پہونچ رہا تھا اور جس طرح مسیحی حریفون کے مقابے میں اوس کا اقتدار کم ہو رہا تھا وہ ظاہر ہے لیکن ملک مین جا بجا چھوٹے چھوٹے درباروں کے قایم ہوجانے سے فنون لطیفہ بالخصوص فن تعمیر موسیقی شاعری وغیرہ نے بہت فروغ پایا تھا ۔ ایشیا مین ہمیشہ اور یورپ مین کچھہ دن پہلے تک فنون لطیفہ کی قدردانی صرف ریاستون اور دربارون مین ہوتی رہی ہے اور اون کی ترقی کا دارومدار اسی پر تھا اب ظاہر ہے کہ جس ملک مین بہت سی

درباریوں سے وہاں زیادہ تعداد میں لوگ آرٹ کی طرف مائل ہوگئے اور درباروں کی باہمی حیثیت کے سبب سے اوس کی قدردانی میں زیادہ اہتمام ہوگا۔ یہی صورت گیارہوں صدی کے آخر سے ہسپانیہ میں پیدا ہوگئی تھی۔ یوں تو سب درباروں میں ان چیزوں کا چرچا تھا لیکن سلطنت غرناطہ جس نے اپنی حکمت عملی کی بدولت اپنے مسیحی دشمنوں کو آپس میں لڑا کر اپنی سیاسی حیات اس شان سے قائم رکھی تھی کہ عربوں کی گذشتہ عظمت کی یادگار ایک حد تک باقی تھی فنون جمیلہ کی قدردانی میں خاص شغف رکھتی تھی ایکطرف تو اس دربار میں شعرا و مغنیوں کا مجمع رہتا تھا اور دوسری طرف وہ عالی شان عمارتیں بن رہی تھیں جو آج بھی دنیا میں فن تعمیر کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں صرف قصر الحمرا اسکے لئے کافی ہے کہ غرناطہ کے حکمرانوں کے ذوق حسن اور خوش مذاقی کی یاد کو کبھی دلوں سے محو نہ ہونے دے۔ علاوہ اس کے دستکاریوں کو ہسپانیہ میں بہت رواج تھا اور یہاں کے بنے ہوئے قیمتی کپڑے اور صناعی کے دوسرے نادر نمونے تمام یورپ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

لیکن یہ ہسپانوی۔ عربی تمدن جسکا مختصر حال لکھا گیا تنہا مسلمانوں کی کوشش کا نتیجہ نہ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اسلامی اور عربی اثر ہر جگہ غالب رہا لیکن ایک حد تک مسیحی اور یہودی بھی تمدنی زندگی کے ہر شعبہ کی نشو نما میں شریک تھے بعض عیسائی بطریقوں کی تحریر سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مسیحی عربی زبان میں مہارت حاصل کرتے تھے اور اسی میں تصنیف و تالیف کیا کرتے تھے۔ ابن حزم صاحب ملل و النحل جو عبدالرحمٰن خامس کا وزیر تھا بقول بعض یہودی الاصل تھا ایک یہودی سموئیل حلوی دربار غرناطہ میں وزارت کے عہدے پر فائز تھا۔ یہودیوں کے مایۂ ناز فلسفی عبداللہ ابن میمون نے

اپنی سب کتابین عربی زبان مین لکھی ہین اور اسے علمی خیالات سے مالا مال کر دیا ہے۔ ان مثالون سے اس دعوے کو اور تقویت پہونچتی ہے کہ اگرچہ ہسپانیہ کے عرب تمدن پر اسلامی ملا د مشرق کا بڑا اثر تھا لیکن پھر بھی بعض پہلوون سے اوسے ایک ملکی پیداوار سمجھا جا سکتا ہے۔ جس کی پرداخت مین علاوہ مسلمانون کے دوسرے اقوام خصوصًا یہودیون نے بھی کسی حد تک حصہ لیا تھا۔

یہی یہودی تھے جن کے توسط سے عرب تمدن کا اثر یورپ پر پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کو تاریخ عالم مین یہ کام تفویض ہوا ہے کہ وہ ایک ملک کا تمدن دوسرے ملک مین پہونچایا کرین اور قومون مین ذہنی تعلقات کا واسطہ بنین۔ جب ہسپانیہ مین اسلامی سلطنت فنا ہونے لگی تو وہان کے یہودیون کو اپنے اس فرض کا شعوری یا غیر شعوری احساس پیدا ہوا اور انھون نے طلیطلہ (Toledo) مین عربی کتابون کا ترجمہ لاطینی زبان مین شروع کر دیا جو سارے یورپ کی علمی زبان تھی۔ انھین کے توسط سے ابن رشد کا فلسفہ یورپ پہونچا۔ اوس عہد مین پیرس یورپ مین علم و حکمت کا مرکز تھا وہان ابن رشد کے خیالات بہت مقبول ہوئے اور ایک مخصوص فلسفیانہ مذہب پیروان ابن رشد کا قایم ہوگیا جس کا سرگروہ سیگر آف بارابانٹ (Siger of Brabant) تھا تیرھوین صدی کے وسط مین ان لوگون کا زور اس قدر بڑھ گیا تھا کہ رومی عیسائیون کے سب سے بڑے ذہنی اور روحانی پیشوا ٹامس آف اکوئی ناس (Thomas of Aquinas) کو سیگر کی تردید مین ایک کتاب لکھنا پڑی۔

ابن رشد کے یورپ کی علمی دنیا پر دو احسانات ہین ایک تو یہ کہ اوس نے ارسطو کے فلسفہ کو جو یورپ مین قرون وسطےٰ مین بالکل مسخ ہو چکا تھا اوس کی اصلی صورت

مین پیش کیا۔ اس معاملہ مین کہنے والے یہ کہہ سکتے ہین کہ اس سے کوئی دیرپا فائدہ نہین پہونچا کیونکہ کچھ دن کے بعد ارسطو کا مکمل فلسفہ براہِ راست یونانی زبان سے یورپ والون تک پہونچ گیا جس نے ابن رشد کی تالیفون اور شرحون کو تقویم پارینہ بنا دیا۔ لیکن دوسرا احسان ایسا نہین کہ اوس سے کوئی یون آسانی سے انکار کر سکے۔ قرون وسطےٰ مین یورپ مین علوم و فنون پر کلیسا نے جو پہرا بٹھا رکھا تھا وہ محاکم اسلامی کی سختیون سے بدرجہا زیادہ شدید تھا۔ اہل علم کی ذہنیت کلیسا کے خوف سے مرعوب بلکہ ماؤف ہو چکی تھی۔ اس طلسم کے توڑنے اور خیال و فکر کے آزاد کرانے مین ابن رشد کا اور دیگر اسلامی فلسفیون کا بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ دین مسیحی کے حامی اسی لئے اوس سے نفرت بھی کرتے ہین دانتے (Dante) نے اپنی شہرہ آفاق نظم کے آخر مین اون لوگون کا ذکر کیا ہے جنہین اوس نے جہنم مین دیکھا تھا۔ اون لوگون مین وہ ابن رشد کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرتا ہے۔

علاوہ ابن رشد کے فلسفہ کے ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ اور عرب مصنفون کی سائنس۔ ریاضی اور طب کی کتابون سے جو فائدہ یورپ نے اٹھایا ہے اوس کیطرف بعض کتابون مین کہین کہین ذرا سا اشارہ ہے لیکن اصل مین یہ چیزین پردۂ خفا مین پوشیدہ ہین۔ اگر کوئی خدا کا بندہ اس پردے کو چاک کر دے تو دنیا پر آشکارا ہو جائیگا ہسپانیہ کے عرب تمدن کی شمع بجھتے بجھتے بھی ایک دوسرا چراغ روشن کر گئی ہے جسکی روشنی مین اس کا پرتو ہمیشہ رہے گا۔

شرحِ طباطبائی

(گذشتہ سے پیوستہ)

شعر۔
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

تشریح ۔ "یعنی ہمارے ماتم خانہ میں اگر شمع ہے تو برق ہے۔ جب دم بھر سے زیادہ ہم غم میں نہ رہتے تو روشنی بھی دم بھر سے زیادہ ہونے کی ضرورت نہیں"

بظاہر بالکل صحیح مطلب معلوم ہوتا ہے۔ مگر سید صاحب نے یہاں پھر شعر کے الفاظ کا خیال نہ رکھا۔ شعر کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم برق سے اپنے ماتم خانہ کی شمع روشن کیا کرتے ہیں؛ اور ہمارے سید صاحب فرماتے ہیں کہ برق ہمارے ماتم خانہ کی شمع ہے۔ کیا ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ اگر ہم غالب کے الفاظ سے مطلب نکالیں تو وہ یہ ہے کہ آزادوں کے پاس غم کا کیا کام، ہم لوگ تو برق سے جو خرمن اور آشیان کی دشمن مشہور ہے اپنے گھر کے چراغ جلانے کا کام لیا کرتے ہیں۔ برق جسے دنیا ایک مصیبت خیال کرتی ہے ہم اس سے اس قدر مانوس اور بے خوف ہو گئے ہیں کہ اب اس کی قیمت ایک دیا سلائی سے زیادہ نہیں رہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص ہلاکت اور تباہی سے نہ ڈرے اس کے پاس غم کا کیا کام ہے۔

شعر۔
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

تشریح۔ "معشوق کی ایک ادا کا بیان ہے کہ بات تو کرتا نہیں ہے مجھ سے لیکن میری خبر کا طالب رہا کرتا ہے"

پرسش کے معنی آخر یہی کیوں فرض کر لئے جائیں کہ اس کے حالات کی پرسش مقصود ہے۔ یہ لفظ قدر اور وقعت کے معنی میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے اور شعر کا نہایت صحیح مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس لطف خاص کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں بزم میں وہ تجھ سے بولتے نہیں مگر میری وہاں پرسش اور قدر ہے۔

شعر۔ راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

تشریح۔ "یعنی مر جانے میں رازداری کی تکلیف کچھ بھی باقی نہیں رہتی لیکن راز معشوق کے فاش ہو جانے کا اندیشہ ہے"

"ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں" کے جو معنے سید صاحب نے تحریر فرمائے ہیں وہ الجھن کا حصہ ہے۔ اگر وہ اس کے سیدھے سادھے معنی یہ لکھ دیتے کہ "ورنہ مر جانا تو ایک معمولی سی بات ہے" تو آخر کیا بگڑ جاتا۔

شعر۔ شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

تشریح۔ "مصنف نے لفظ منظور کو یہاں مبصر و مرئی کے معنی پر استعمال کیا ہے محاورہ اس کے مساعد نہیں"

خدا ہی جانے سید صاحب کو کیوں یہ غلط فہمی لاحق ہوئی۔ غریب مصنف کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ منظور کو مرئی کے معنی پر استعمال کرے۔ بالکل کھلی ہوئی

بات ہے کہ یہ دنیا شاہد ہستی مطلق کی مگر ہے گویا اس کی کوئی ہستی نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاہد ہستی مطلق کے مگر موجود ہے مگر ہمیں لوگوں کا یہ مقولہ تسلیم نہیں ہے یہ منظور کے بالکل صحیح اور معنوی معنی مسلم یا مقبول کے ہیں اور انھیں معنی پر غالب نے بھی استعمال کیا ہے۔

شعر۔ جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو۔
یہ نگاہ غلط انداز ستم ہے ہم کو۔

تشریح ۔" یعنی مجھے اپنا عاشق جان کر تغافل کیجئے"

"جان کر" کی غلط تشریح کر کے شعر کا ناس کر دیا۔ آخر سید صاحب اپنی طرف سے غیر ضروری الفاظ بڑھانے کی تکلیف کیوں گوارا فرماتے ہیں ؟۔ شاعر کہتا ہے کہ آپ جان بوجھ کر دیدہ دانستہ بے پروائی کیجئے تاکہ مجھے کچھ امید ہو جائے۔ جان بوجھ کر تغافل کرنا ناز معشوقانہ ہے اور ناز اسی پر کئے جاتے ہیں جس سے اپنی طبیعت کو بھی کچھ لگاؤ ہو۔ "جان کر" کے معنی یہ "مجھے عاشق جان کر" نہیں ہیں بلکہ "بالقصد" اور "عمداً" ہیں

شعر۔ بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

تشریح ۔" یعنی تم نہیں بچتے اور یعنی میرا قاتل۔ مطلب یہ کہ تم گواہی میں تو پکڑے جاؤ گے اگر قتل کے الزام سے بچ رہے"

اگر اس تشریح کی کتابت یا طباعت میں کچھ غلطی نہیں ہوئی ہے اور سید صاحب نے یہی الفاظ تحریر فرمائے ہیں تو جو صاحب بھی اس تشریح کا مطلب بتا سکیں انکی خدمت میں جناب طباطبائی کی شرح دیوان غالب کی ایک جلد نذر کرنے کے لئے میں تیار ہوں۔

شعر۔ بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھکو قرار
یہ نیش ہو رگ جان مین فرو۔ تو کیونکر ہو

تشریح :۔ اس شعر مین نہایت تعقید ہے۔ اس کو نثر مین یون کہین گے کہ اسکی مژہ کو دیکھ کر یہ بتاؤ کہ ایسے نشتر رگ جان مین فرو ہون تو قرار مجھکو کیونکر ہو۔"

مین سید صاحب ہی سے مودبانہ مستفسر ہون کہ غالب کے شعر مین کیا اس سے کچھ زیادہ تعقید ہے جتنی آپ کی اس نثر مین موجود ہے کہ "تو قرار مجھکو کیونکر ہو"۔ اردو زبان کی نثر مین تو شاید یہ فقرہ اس طرح لکھا جاتا کہ "تو مجھے کیونکر قرار ہو"۔

شعر۔ یہ کہہ سکتے ہو ہم دل مین نہین ہین پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل مین تمہین تم ہو تو آنکھو نسے نہان کیون ہو

تشریح :۔ یہ پہلے مصرع مین استفہام انکاری ہے یعنی یہ تو تم نہین کہہ سکتے کہ ہم دل مین نہین ہین ؛

کیا عجیب و غریب تشریح ہے۔ آخر پھر اس شعر مین بات ہی کیا رہی۔ خدا جانے کیون سید صاحب ہر موقع پر جب غالب کے کسی شعر سے دو مختلف معانی پیدا ہوتے ہون تو ہمیشہ وہی تحریر فرماتے ہین جو پست تر ہون۔ بجائے اتنا جھگڑا بڑھانے کے کہ پہلے مصرع مین استفہام انکاری کا ہونا تسلیم کیا جائے ہم یہی کیون نہ مان لین کہ شاعر نے لفظ "ہم" سے مراد خود اپنی ذات سے لی ہے۔ اور اس طرح اس شعر کا نہایت صاف اور کسی قدر اس سے بہتر مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ تم یہ تو کہہ سکتے ہو کہ ہم (یعنی عاشق) تمہارے دل مین نہین ہین۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ ہمارے دل مین جب تمہین تم ہو تو آنکھون سے کیون نہان ہو۔

شعر۔ از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

تشریح۔ "یعنی عالم میں رخ و رخ اور دل و دل باہمدگر آئینہ ہیں"
سید صاحب یہ دو رخی اختیار کر کے خواہ مخواہ "دل و دل" کی دلدل میں پھنس گئے
اور خدا جانے اس شعر کا مطلب لکھتے وقت کس عالم میں پہونچ گئے۔ اچھا خاصہ صاف
مطلب ہے کہ سورج سے لیکر ذرہ تک ہر چیز ایک دل ہے اور دل آئینہ ہوا کرتا ہے
اس لئے غریب طوطی کی آنکھوں کے سامنے ہر طرف آئینے ہی آئینے ہیں۔

شعر۔ ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

تشریح "فرمان اور حکمنامہ وغیرہ کو برات کہتے ہیں یعنی جنون کا فرمان معاش
سنگ پر ہے۔ غرض یہ ہے کہ جنون کی معاش سنگ طفلان مقرر ہوئی ہے"
براتِ معاشِ جنونِ عشق کے معنی عشق کے جنون کی معاش کا فرمان ہوئے
اور اس لئے مصرع کے معنی یہ ہوئے کہ عشق کے جنون کی معاش کا فرمان سنگ پر ہے
کیا اس کا کچھ مطلب ہوا؟ کیا غالب ایسے ہی مہمل اشعار کہنے کی وجہ سے استاد مانے
جاتے ہیں؟ برات کے معنی شاید حصہ کے بھی ہیں اور اگر اس لفظ کے یہ معنی لئے جائیں
تو مطلب صاف ہو جاتا ہے کہ عشق کے جنون کا حصہ معاش پتھروں پر ہے۔ یعنی جنون
عشق کی روزی پتھر مقرر کئے گئے ہیں۔ سید صاحب نے آخر میں یہ تو فرما دیا کہ غرض
یہ ہے کہ جنون کی معاش سنگ طفلان ہے لیکن برات کے معنی فرمان مان کر یہ غرض
کسی طرح حاصل بھی ہو سکتی ہے؟۔

شعر: یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے
یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھائیے

تشریح: یعنی یا تو ایسا کیجئے کہ رشک کے سبب سے جو میرے دل میں زخم خنداں پڑتے ہیں ان کو رسوا نہ کیجئے یا رقیب کے ساتھ پردہ میں چھپ چھپ کر ہنسنا چھوڑ دیجئے۔

اگر کسی مریض اس عالم بالا میں غالب کی نظر سے طبا طبائی صاحب کی یہ کرمفرمائی گذر سکتی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انھیں جنت دوزخ سے بدتر ہوگئی ہوگی تبسم پنہاں کا پردہ اٹھائیے کا مطلب رقیب کے ساتھ چھپ چھپ کر ہنسنا چھوڑ دیجئے لکھنا حق یہ ہے کہ سید صاحب ہی کا کام تھا۔ میری عقل حیران ہے کہ اس قدر صاف اشعار میں بھی سید صاحب کو کیوں غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یا تو آپ ان رشک کے زخموں کو بدنام نہ کیجئے جو میرے دل میں پڑتے ہیں اور یہ نہ کہئے کہ میں زبردستی خواہ مخواہ کو رشک کیا کرتا ہوں، یا پھر اگر آپ سچے ہیں تو اس تبسم کی وجہ بتائیے جسے آپ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی حالت کا نقشہ ہے کہ عاشق بزم معشوق میں بیٹھا ہوا ہے۔ رقیب بھی موجود ہیں، معشوق کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے جسے وہ ہونٹوں کو چبا کر اس عاشق سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ عاشق بھانپ لیتا ہے کہ معشوق مسکرایا تھا اور اب یہ دیکھ کر کہ میرے علاوہ بزم میں رقیب ہی ایسا شخص ہے جس کی جانب معشوق نے تبسم کیا ہوگا اس کے دل میں رشک پیدا ہوتا ہے اور وہ معشوق سے رقیب نوازی کی شکایت کرتا ہے۔ معشوق اس کے جذبۂ رشک کو برا کہتا ہے اس پر عاشق کی زبان سے غالب مرحوم کا یہ شعر نکل جاتا ہے کہ یا تو میرے رشک کو برا بھلا

کہہ کر بدنام نہ کیجئے یا یہ مجھے بتا دیجئے کہ تبسم کو مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟

شعر۔ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

تشریح: یہ آنکھ کی مینا نہ سے اور بھوں کی محراب مسجد سے تشبیہ مشہور ہے مصنف نے یہاں جدت یہ کی ہے کہ اس تشبیہ کا عکس لیا ہے۔"

اپنے اس اعتراض کا باشد ید تعریف و تحسین کا مطلب تو سید صاحب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کم از کم مجھے تو غالب کے شعر میں یہ کوئی جدت نظر آتی ہے نہ بدعت۔ جو تشبیہ کہ مشہور ہے وہی اور بالکل وہی اس غریب نے نظم کر دی ہے۔ یہ اسکی بدنصیبی ہے کہ سید صاحب کو تشبیہ کوس نظر آ رہی ہے۔

شعر۔ دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیئے

تشریح: "یعنی بہت سی حسرتیں تو نہ نکلیں کوئی آرزو تو اب پوری کر۔"

غالب جیسا غیور شخص اور چرخ سفلہ پرور سے یہ التجا کرے کہ کوئی آرزو تو پوری کر گویا اسے محرومی و ناکامی میں کوئی لطف ہی نہیں ملتا، یقیناً غالب کی توہین ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ دل کی "حسرت پرستی" کی تو داد چاہی جا رہی ہے اور خود حسرت ہی سے اظہار بیزاری کیا جا رہا ہے اور آرزو پوری ہونے کی درخواست زبان پر آ رہی ہے مگر یہ سب "خوبیاں" تو ہمارے سید صاحب کی تخیلہ کی پیدا کردہ ہیں۔ غالب بچارے کا خیال ان باتوں تک کہاں پہونچا تھا۔ اس نے تو صرف یہی لکھا تھا کہ اے فلک تو اور کچھ تو کیا دیگا مگر میرے حسرت پرست دل کی داد تو دے کہ اس نے حسرت

مایوسی کو کامگاری و بامرادی پہ ہمیشہ ترجیح دی ۔ تلافی مافات کے لئے کچھہ تو ہونا
چاہئے ۔

شعر۔ اس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

تشریح :- میں داغ ناتمامی ہوں یعنی مجھے اپنے ناتمام رہ جانے کا داغ ہے ۔ جو لوگ کہ
زبان اردو کے تنگ کرنے پر کمر باندھے ہوئے ہیں اور فن معانی سے بہرہ نہیں رکھتے انکی
رائے میں وہ سے، کا لفظ اس شعر میں برائے بیت ہے اور وہ طرح ، کے بعد سے ، کا
لفظ بولنا ، و رلکھنا اور نظم کرنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے لیکن یہ محاورے میں تصرف ہے
یا قیاس سے اور دونوں ناجائز ہیں ۔ میر کہتے ہیں ؎

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بیتاب
کس کی تسکین کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

یعنی مجھے رشک محبت کا داغ ہے "

سید صاحب نے جو مطلب بتایا ہے وہ بالکل صحیح ، فن معانی سے بہرہ نہ رکھنے
والوں پر جو اعتراض کیا ہے وہ بھی نہایت درست ، مگر یہ سمجھہ میں نہ آیا کہ میر کا جو شعر مثال
کے طور پر پیش کیا گیا ہے اس کا یہاں کیا موقع تھا ۔ یہاں تو پورے شعر میں کہیں طرح سے"
استعمال نہیں ہوا ہے ۔ ممکن ہے کہ کسی خاص اثر کے ماتحت سید صاحب ، یہ تو بھول
گئے ہوں کہ اعتراض لفظ ، طرح ، کے متعلق کیا جارہا ہے ، ور یہ خیال بندھ گیا ہو
کہ لفظ ، داغ ، ہدف اعتراض ہے اس لئے میر کا یہ شعر رقم فرما دیا ۔

شعر۔ ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پرتوِ سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

تشریح :- یعنی کائنات تجھکو اپنا مبدا و اصل سمجھکر بہ تقاضائے فطرت تیری طرف دوڑ رہی ہے جسطرح پرتوِ آفتاب سے ذرہ میں جان پڑجاتی ہے "

سید صاحب نے یہ تو فرما دیا کہ جس طرح پرتوِ آفتاب سے ذرہ مین جان پڑجاتی ہے۔ لیکن بتانے کی قطعاً کوئی کوشش نہ فرمائی کہ ذرہ مین پرتو آفتاب سے کسطرح جان پڑتی ہے۔ صرف سید صاحب کے یہ فرما دینے سے یا غالب کے نظم کردینے سے کوئی کیون مان لیگا کہ آفتاب کے پرتو سے ذرہ مین جان پڑجاتی ہے۔ قطرات شبنم کا آفتاب کی طرف دوڑنا ہر شخص کو معلوم ہے۔ مگر یہان ذات شبنم کی تخصیص نہین کی گئی ہے۔ اور ذرہ سے مراد خاک کے ذرات ہین۔ اگر صرف یہ کہدیا جائے کہ چونکہ ہوا مین خاک کے ذرات اڑتے رہتے ہین اس لئے انکے متعلق یہ کہنا کہ وہ آفتاب کی طرف دوڑ رہے ہین صحیح ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرتو آفتاب سے ذرون مین حرکت یا جان پیدا ہوجانا کہان ثابت ہوا۔ غالب نے غالباً طبیعیات کے اس مسئلہ کو پیش نگاہ رکھا ہے کہ پرتو آفتاب یعنی حرارت کے باعث سے فضا کی ہوا گرم ہوتی ہے اور گرم ہوکر پھیلا کرتی اور پھیلنے کی وجہ سے ہلکی ہوکر اوپر کو چڑھا کرتی ہے اس اوپر چڑھنے والی ہوا کی جگہہ لینے کے لئے دوسری جگہہ کی ہوا دوڑتی ہے جس سے ہوا کے دوڑنے اور اوپر چڑھنے کا ایک تسلسل قائم ہوجاتا ہے جسے ہوا کا چلنا یا اگر تیز ہو تو آندھی کہا کرتے ہین۔ ہوا کی حرکت کے ساتھ ذرات کا متحرک ہونا بھی لازمی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ پرتو آفتاب نے ذرات مین جان ڈالدی اور وہ آفتاب کی طرف دوڑ رہے ہین۔ اگر آفتاب کی طرف دوڑنے کا ذکر نہ کیا جاتا تو ذرون مین

جان پڑجانا،" سے مراد عرف عام مین یہ ہوتی ہے کہ ذرے جگمگا اٹھے اور ظاہر ہے کہ ذرون کی جگمگاہٹ مین بھی انسان کی آنکھہ کو عکس آفتاب متلاطم اور متحرک نظر آیا کرتا ہے۔ اور میرے خیال مین طبیعیات کے مسائل مین پھنسنے کی بجائے اگر شعر کا مطلب یہی خیال کرلیا جائے تو بہتر ہوگا کہ "تیرے ذوق سے کائنات مین اسی طرح حرکت پیدا ہوگئی ہے جس طرح پرتو آفتاب سے ذرے جگمگانے لگتے ہین"

شعر — کس پردے مین ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذرخواہ لب بے سوال ہے

معاشیات

آپ کسی علم کا مطالعہ شروع کریں تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ علم ہے کا ہے کے متعلق یعنی کن چیزون سے بحث کرتا ہے، اس کا موضوع تحقیق آخر کیا ہے۔ لیکن اکثر ہوتا ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب جانے بغیر لوگ عام رواج کے مطابق بلا کسی منطقی تعریف و تجزیہ کے اپنے ذہن میں اس کا ایک تصور سا قائم کر لیتے ہیں اور روزمرہ کے کام کے لئے یہ تصور خاصہ صحیح بھی ہوتا ہے۔ ان کے سامنے مختلف مسائل پیش کیجیے تو یہ بتا دیں گے کہ یہ مسئلہ فلان علم سے متعلق ہے اور وہ فلان سے۔ مثلاً یہ بتا سکنے کے لئے کہ مادہ کی حقیقت، روح کی ماہیت زمان و مکان کی بحث، حیات بعد الموت، وجود الٰہی، اعمال کی سزا جزا فلسفہ اور الٰہیات سے متعلق ہیں یہ ضروری نہیں کہ میں فلسفہ اور الٰہیات کی ٹھیک منطقی تعریف بھی کر سکون۔ یہی حال اس علم کا ہے جسے کچھ عرصہ سے اردو زبان میں "معاشیات" کہنے لگے ہیں اور جسے اس سے قبل "اقتصادیات" "سیاست مدن" اور "علم کفایت شعاری" کے نامون سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ کسی شخص سے جس نے یہ نام سنا پڑا ہے (بشرطیکہ ہمارے کاتبون کی عنایت اور ناشرین کی بے اعتنائی نے اس لفظ کو مسخ کر کے کسی بالکل دوسری شکل میں اس کے سامنے نہ پیش کیا ہو) آپ جا کر پوچھئے کہ یہ پچھلے پچاس سال سے ہندوستان میں جو مختلف اجناس کی قیمت برابر بڑھ رہی ہے، اسکے اسباب کی تحقیق کس علم سے متعلق ہے تو وہ فوراً کہہ سکے گا "معاشیات سے" یا مال گذاری کے اضافہ کا اثر زمینداروں اور کسانوں پر کیا ہوتا ہے؟ اگر آدمی ایماندار ہے اور "لیڈرون" کے

اس طبقہ سے تعلق نہیں رکھتا جو سر اس مسئلہ پر نہایت اعتماد کے ساتھ تقریر کرنے کا فن جانتے ہیں جس سے انھیں مطلق مس نہ ہو، تو کہدیگا کہ "میں نہیں جانتا میں نے معاشیات کا مطالعہ نہیں کیا ہے"۔ ہندوستان کے کسان مہاجن کے پنجے میں کیوں ایسے پھنسے ہیں کہ رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، سود کا نرخ کیوں گھٹتا بڑھتا ہے، یہ جو پچھلے دنوں ایک روپیہ کے کروڑوں جرمن مارک ملتے تھے یہ کیا ماجرا تھا۔ ان سوالات کا جواب کس علم سے ملیگا؟ "معاشیات سے"۔ یہ شخص جو نہایت آسانی سے ہمیں بتا سکتا ہے کہ یہ سوالات معاشیات سے متعلق ہیں غالبًا اس علم کی منطقی تعریف نہ کر سکے گا۔ ہم بھی ذیل کی سطروں میں معاشیات کی کوئی منطقی تعریف پیش نہیں کرنا چاہتے بس یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان سب سوالوں میں کون باتیں مشترک ہیں تاکہ اسطرح معاشیات کے موضوع تحقیق کے تعین میں مدد ملے۔

پہلی بات جو ان تمام سوالوں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب انسان اور اس کی زندگی سے متعلق ہیں۔ مثلاً ان سارے سوالوں میں روپیہ پیسہ کا کچھ نہ کچھ ذکر ضرور ہے۔ لیکن کس طرح؟ کیا چاندی اور تانبے کے خواص کیمیاوی کی تحقیق پیش نظر ہے؟ نہیں، بلکہ انسانی زندگی میں ان سے جو کام نکلتا ہے اسکی تحقیق مقصود ہے۔ پارہ سے چاندی بن سکتی ہے کہ نہیں اور بن سکتی ہے تو کیسے اس سے عالم کیمیا کو دلچسپی ہوگی یا ہوس کو، معاشی کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن اگر پارہ سے چاندی بننے لگے تو اسکا اثر چیزوں کی قیمت پر کیا ہوگا۔ یعنی ایک شخص دوسرے کو اس کی جو مقدار کسی چیز کے عوض دیتا ہے اسپر، اسکا جواب معاشی دیگا۔

دوسری بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سارے سوالونکی

تہ میں ایسے انسانی اعمال دکھائی دیتے ہیں کہ جو ضروریات زندگی کے پورا کرنے سے متعلق ہیں
معاشیات کا وجود بس اس وجہ سے ہے کہ انسان مختلف ضروریات رکھتا ہے اور مجبور
ہے کہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مشقت اٹھائے۔ اگر آدمی کو اپنی حاجتیں رفع کرنے
کے لئے کام کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اور جن چیزوں سے یہ رفع ہوتی ہیں وہ اسے یونہی
ہی بیٹھے بٹھائے ملجایا کرتیں تو معاشیات کا وجود ممکن نہ تھا۔ اگر آج دنیا میں ہر شخص کو
بازی گر کا وہ لٹکا ہاتھ آجائے جس سے وہ اپنے مٹکے کے اندر سے یا ٹوکرے کے نیچے سے
جو چاہتا ہے نکال لیتا ہے تو دنیا کے تمام جامعوں میں معاشیات کا درس کل ہی بند
ہو جائے۔ لیکن جب تک ایسا نہ ہو ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ انسان
کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جن مادی اشیاء کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں
اور اس کی آرزو کی کوئی انتہا نہیں۔ قدرت نے انسان کی فطرت میں سیری نہیں دیا!
اسکا ذہن اور اسکا دل ہر وقت نئے نئے مقاصد اور نئی نئی آرزوؤں کا مولد ہے۔

ز ما دم آرزو ہا آفرینی وا وا
مگر کارے نداری اے دل! ای دل!

ادھر ان روز افزوں اور ہر دم بدلنے والے مقاصد کے حصول کے مادی ذرائع
محدود۔ قدرت نے اس میں تخلیق آرزو کی صلاحیت تو دی ہے، لیکن انکے لئے ذرائع
فراہم کرنے میں بڑے بخل سے کام لیا ہے۔ چنانچہ یا تو ان مقاصد کے پورا کرنے کے
لئے جن مادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ کمیاب ہیں یا اس شکل میں موجود نہیں تا
کہ بلا تبدیلی کے انھیں بطور ذرائع استعمال کیا جا سکے۔ یہ دشواریاں انسان کو مجبور
کرتی ہیں کہ جن ذرائع پر اسے دسترس حاصل ہے انہیں سے انکے ساتھ اصول معاشی

کے مطابق عمل پیرا ہو جو یا تو کمیاب ہیں یا جنکی شکل تبدیل کرنے میں اسے سعی و مشقت صرف کرنی لازمی ہے۔ جو ذرایع من مانی مقدار میں ہر وقت موجود ہیں ان پر یہ اس اصول کو عاید نہیں کرتا! چنانچہ معاشیات انسانی حاجتوں کے رفع کرنے کے لئے محدود ذرایع سے بحث کرتی ہے۔

تیسری بات جو صاف نظر آتی ہے یہ ہے کہ ہر چند ان سب سوالوں میں انسانکی حاجتوں اور ان کے رفع کرنے کے ذرایع سے بحث ہے لیکن ان میں کسی شخص واحد کی ضروریات اور احتیاجات کا ذکر نہیں۔ انسان کو بھوک لگتی ہے، اسکی نبض پر اس کا ایک اثر مرتب ہوتا ہے، مختلف چیزیں خالی پیٹ پر ایک اثر کرتی ہیں بھرے پیٹ پر دوسرا اثر، یہ باتیں طبیب کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں! بھوک کی ماہیت کیا ہے۔ معدہ میں کیا کیا کیمیاوی اعمال رونما ہوتے ہیں! انہیں کب قل ھو اللہ پڑھتی ہیں۔ یہ "وظایف" اعضا کے عالم سے پوچھئے۔ یہ چیزیں معاشی کے لئے موضوع تحقیق نہیں معاشیات کے لئے تو وہ انسان، موضوع بحث ہیں جو مل جل کر ایک اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انسان اس کے لئے اگر دلچسپی کا باعث ہے تو صرف اپنی اجتماعی زندگی میں بطور فرد کبھی نہیں۔ اس اجتماعی زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک کا کام دوسرے سے نکلتا ہے، ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے اور دوسرے سے مدد حاصل کرتا ہے۔ مختلف لوگ مختلف کام کرتے ہیں اور جو جس کام کا اہل ہے اسے انجام دیتا ہے۔ اور اس طرح پوری جماعت کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں انسان کی حیثیت جدا جدا بے تعلق سالمات کی سی نہیں ہوتی بلکہ ایک جسم کے اعضا کی سی۔ پھر یہ مختلف کام کرنے والے لوگ اپنے تعلقات کو منضبط کرنے کے لئے کچھ قواعد بنا لیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ قواعد لکھے ہوئے ہوں

یا کسی "کونسل" (یا دیش بخیرا) نے انھیں پاس کیا ہو۔ یہ اکثر رسم و رواج کی شکل مین یہی تعلقات اجتماعی کو ایک ضابطہ مین لاتے ہین۔ چنانچہ معاشیات انسان کی اجتماعی زندگی سے بحث کرتی ہے جس کی خصوصیات سے ہے تقسیم عمل اور ایک مخصوص نظام آئینی۔

اس سلسلہ مین ہم مناسب سمجھتے ہین کہ انسان کی اجتماعی زندگی کی ایک اہم ترین خصوصیت اور وجہ امتیاز کی طرف بھی توجہ دلائین۔ انفرادی حیثیت سے تو آدمی کو اسی قسم کی حاجتین ہوتی ہین جیسی کسی اور حیوان کو، لیکن اس کی اجتماعی زندگی تمامتر اسکے دماغی اور روحانی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور یہی نہین کہ ان اعمال کا نتیجہ ہو بلکہ خود انکے نشو نما کے لئے ایک لازمی شرط بھی ہے۔ یہ وہ تازگی بخش اور حیات پرور فضا ہے جس مین اجتماعی زندگی کا پودا پھل پھول لاتا ہے، یہی وہ زینہ ہے جسکے ذریعہ انسانی زندگی ارتقا کے اعلے مدارج تک پہونچتی ہے۔ اس کے اجزا ترکیبی سب کے سب دماغی ہین، مثلاً علم و حکمت، فلسفہ، مذہب، فنون لطیفہ، اخلاق، آئین وغیرہ۔ عالم اجتماعی دراصل عالم افکار ہے۔

لیکن یہ دماغی اور فکری دنیا قدور و مقاصد کی دنیا ہے اور عالم فطرت سے بالکل الگ اور اس سے بالکل مختلف کیونکہ علت معلول سبب اور نتیجہ کا عالم ہے جماعت انسانی نظام قدرت سے جدا ایک چیز ہے۔ ان دونون عالمون کی تشریح ایک طویل بحث ہے یہان صرف اجمالاً انکا فرق دکھانا منظور ہے۔

قدور وہ مقاصد ہین جنکی توجیہ کے لئے کسی دوسرے اعلے اصول کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ جو خود اپنی ذات مین اپنی توجیہ بھی رکھتے ہون۔ مثلاً قدس، خیر، حق، حسن وغیرہ۔

حق اپنے حق ہونے کے لئے ظاہری کامیابی کے اصول کا پابند نہیں حق حق ہے چاہے اس کا اعلان اور اس پر عمل کرنے والا کسی سولی کی رونق کا باعث ہو یا اپنے "طرف کلاہ" میں جگہ دیکر "لعل وگہر" کے لیے "اوج طالع" کا باعث حسن جب اپنی جلوہ فروشی سے "دشمن ایمان و آگہی" ہو تب بھی حسن ہے اور کسی دہقان کے جھونپڑے کی تاریکی میں شمع کا کام دے رہا ہو تب بھی حسن یہ قدور ہر چند اپنی اپنی جگہ پر مستقل بالذات ہیں لیکن الگ الگ اور تنہا نہیں یہ اپنے کو ایک ترتیب اور نظام کے اندر پاتی ہیں۔ ان میں مدارج ہوتے ہیں اعلیٰ اور ادنےٰ قدور ہوتی ہیں اور اس سارے نظام میں کوئی ایک قدر اعلےٰ ترین مانی جاتی ہے۔ مختلف زمانوں اور مختلف حالتوں میں اس اعلےٰ ترین قدر کے نام مختلف رہے ہیں: کہیں قدس، کہیں ترقی، کبھی مسرت، کبھی زیادہ سے زیادہ افادہ۔ لیکن یہ ہمیشہ پائیگا کہ جہاں قدور ہیں وہاں ایک تدریجی نظام اعلےٰ و ادنیٰ میں منضبط ضرور ہیں۔ اس کے برخلاف اور اس سے بالکل جدا علت ومعلول، سبب اور نتیجہ کا عالم ہے۔ یہاں بہتر و بدتر، خیر و شر کا سوال ہی نہیں۔ یہاں اعلےٰ اور ادنےٰ کا ذکر ہی نہیں۔ یہاں صرف ماقبل و مابعد، آگے اور پیچھے کا دور دورا ہے۔ یہ سبب اور نتیجہ کی دنیا قدور سے ناآشنا اور مقاصد سے بےخبر ہے یہ ایک خالص میکانیکی، بالکل بےمعنی، مطلق بےمقصد ایک حالت سے دوسری میں تبدیلی سے عبارت ہے۔ "شبلی استاد" کے پیش نظر ایک مقصد ہے، لیکن "لطمہ ہائے موج" غرض وغایت سے بےخبر ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں یہ سوال کبھی پیدا نہیں ہوتا کہ "کیا ہونا چاہئے"، یہاں صرف یہ جستجو رہتی ہے کہ "کیا ہوا"۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا، یہ کبھی دریافت نہیں کر سکتے کہ کیوں

اور کس لئے ہوا؟

قدور کے متعلق ایک بات یہ ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ مقصد کا سب ایک فکری تعین ہوتا ہے - خیر حق حسن اقدور ہیں بلا اس کے کہ بیرونی دنیا سے آب و گل میں انکی تکمیل ہو یا نہ ہو - قدور اور انکی خارجی تحصیل دو بالکل جدا جدا چیزیں ہیں، طاعت و زہد کا ثواب جاننا ایک بات ہے اور ادھر طبیعت آنا اور جب طبیعت آجائے تو اسے بجا لاسکنا دوسری بات جب کسی قدر کا حصول پیش نظر ہو تو یہ قدر "مقصد" ہوجاتی ہے - اس کا حصول دنیائے آب و گل یعنی سبب او نتیجہ، علت او معلول کے عالم میں ہی ممکن ہے - لہذا ہر قدر فکری کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ایک مادی او صنعتی علت بھی ہوتی ہے یہ علت جو کسی قدر کے حصول کے لئے ضروری ہو "ذریعہ" کہلاتی ہے - یہ ذرائع ایک طرف قدور کی تحصیل میں کام آتے ہیں اور دوسری طرف مادی حیثیت رکھتے ہیں اس طرح گویا عالم قدور اور عالم اسباب کے درمیان ایک کڑی کا کام دیتے ہیں - ان "ذرایع" کو دوسرے مظاہر اور اسباب مادی سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ ہے انکا تعلق قدور سے اور اپنی اسی نسبت او تعلق کے باعث یہ ذرایع خود بھی ایک طرح مملکت قدور کے اراکین ہوجاتے ہیں -

اب اگر انسانی حیات جماعتی پر نظر ڈالئے تو اس میں بہت سے علاقے ایسے ملینگے جو مقاصد پر مشتمل ہیں - مثلاً حکمت ہے کہ اس کی قدر بنیادی ہے حق، فنون لطیفہ کی حسن، مذہب کی قدس، اخلاق کی خیر، آئین و ریاست کی عدل - اگر حیات انسانی کے اس رنگا رنگ تماشے میں کوئی جگہ ایسی نظر آتی ہے جہاں قدر اور مقصد اس معنی میں موجود نہیں جیسے مذکورہ بالا علاقوں میں تو یہ مملکت ہے معیشت کی - اس میدان میں کسی طرف نظر

اٹھائیے آپ کو وہ چیزیں نظر آئنگی جو بجاے خود کوئی قدر نہیں رکھتین بلکہ کسی مقصد اکسی
فرض کے لئے کام مین آتی ہین۔ اینٹ پتھر اور لکڑی کا وہ مجموعہ جسے گھر کہتے ہین وہ بجائے
خود کیا حقیقت رکھتا اگر اس سے جسم انسانی کو آب و باد کے اثر سے محفوظ رکھنے کا مقصد
حاصل نہ ہوسکتا دوآبہ کے کھیتیون کی خاک کسانون کی آنکھون کے لئے سرمہ طور سے
زیادہ ٹھنڈک کیون پہونچاتی اگر اس سے اس کی بھوک رفع کرنے اور اس کی تکلیف
سے بچانے کے لئے طرح طرح کی چیزیں نہ پیدا ہوتین غرض یہان ہر چیز کی خصوصیت
امتیازی ہے خدمت اکسی مقصد کے لئے کام آنا ہااور بجائے خود بے قدر ہونا۔ چنانچہ
معیشت کے معنی کے تعین مین نہایت اہم بات ہے کہ یہ عبارت ہے مقاصد کے لئے ذرایع
کے ایک مجموعہ سے۔ چنانچہ وہ تمام اعمال جو انسان اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہے کہ
اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اور اپنے وجود کی تکمیل کیلئے خارجی دنیا سے چیزوں کو لے
اور الصین ان حاجتون کے رفع کرنے کے لائق بناے معاشی اعمال ہین۔

یہ اعمال انسان کی تمدنی زندگی یعنی بہ الفاظ دیگر اسکی جماعتی زندگی کا ایک جزو
ہوتے ہین۔ اور تمدنی زندگی چونکہ مقصد ومعنی سے خالی نہین ہوتی اس لئے معاشی اعمال
مین بھی ایک معقول قوت ارادی کا اظہار ہوتا ہے اس مقصد ومعنی کو ہم معیشت کی پہلی
یا اس کے رجحان سے موسوم کر سکتے ہین۔

پھر یہ سارے اعمال چونکہ جماعتی زندگی سے تعلق رکھتے ہین کہ انسان طبعًا جماعت کا
خواہان ہے۔ اس لئے یہ ایک سے زاید آدمیون کے مل کر کام کرنے کو فرض کرتے ہین۔
لیکن جہان ایک سے زیادہ آدمیون کو ملکر کوئی معقول کام کرنا ہوتا ہے فوراً ضرورت
پڑتی ہے ایک ترتیب و نظام کی۔ چنانچہ ہر معیشت مین اس ترتیب نظام کا ہونا لازمی ہے

اور جس طرح مقصد معیشت کو ہم نے اس کی روح سے تعبیر کیا تھا اس نظام کو اس کا جسم کہہ سکتے ہیں کہ معیشت کی شکل ظاہری اسی نظام سے عبارت ہے۔

اور پھر چونکہ معیشت میں اشیاء مادی کی فراہمی سے سابقہ پڑتا ہے یعنی خارجی فطرت کی چیزوں کو اپنی حاجتوں کے رفع کرنے کے لائق بنانے کی غرض سے مختلف طریقوں کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ہر معیشت کے لئے لازمی ہے کہ اس میں ایک طریقۂ کار یا ایک "صنعت" ہو۔

الغرض مقصد یا روح یا ترتیب و نظام اور طریقہ کار یا صنعت ہر معیشت کے لازمی جزا ہوتے ہیں اور کسی قوم یا کسی گروہ یا جماعت کی معیشت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ ہر سہ نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ جب ان تینوں اجزا پر ہم بیک وقت غور کریں اور انھیں باہم ایک وحدت قرار دیں تو ہم اس قوم یا جماعت کے "نظام معاشی" کو معلوم کر سکتے ہیں۔ اور یہی "نظام معاشی" وہ مرکزی تصور ہے جس سے کام لے کر کسی جماعت کی معاشی زندگی کا فہم ممکن ہوتا ہے اور معاشیات نام ہے اس تصور کے ماتحت کسی جماعت کی معیشت کے سمجھنے کی کوشش کا۔

تمام ممتاز معاشیین نے یہ کوشش کی ہے کہ "معاشیات" کے لئے کوئی نہ کوئی مرکزی تصور قائم کریں اور اس کے اوپر اپنے پورے علم کی بنیاد رکھیں۔ مثلاً انگریزی معاشیین کا سب سے عام مرکزی تصور "معیشت قومی" کا تصور ہے۔ اور خود جرمنی میں آجتک نہایت ممتاز معاشیین نے اسی تصور کو اپنے نظام نظری کا مرکز قرار دیا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ شروع شروع میں مذہب تجارت" کے حاملوں اور بعد کو لسٹ کی تصانیف کے علاوہ قومی معیشت کے تصور کا ذکر صرف مقدمۂ کتاب میں ہوتا ہے اور بعد کو تمام وہ مباحث چھیڑے جن کا کوئی خاص

تعلق معیشت، قومی" سے نہیں ہوتا۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ معاشیین اس مرکزی تصور کو بھول جاتے ہیں بلکہ یہ کہ تصور تمام ان معاشی اعمال پر حاوی نہیں ہوتا جنکے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ معیشت قومی" کا یہ تصور بجائے خود بالکل خالی تصور ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک مفید نقطہ نظر ہے لیکن ایسا تصور نہیں جسکے ماتحت تمام معاشی مظاہر لائے جا سکیں۔ معیشت قومی جو ایک قوم یا ریاست کے انفرادی کاروبار معاشی کے باہمی تعلق سے عبارت ہے ایک ایسا تصور ہے جو خود اس تعلق کی نوعیت کی بابتہ ہمیں کچھہ نہیں بتاتا۔ اور اس تعلق کی نوعیت کا سمجھنا ہی اس معیشت کے فہم کے لئے ضروری ہے۔ سچ یہ ہے کہ معیشت قومی کے تصور کے ماتحت مظاہر معاشی کے سمجھنے کی کوشش حقیقت معیشت کے متعلق اس تصور کے باقیات ہیں۔ جسے علمی دنیا عرصہ ہوا کہ غلط تسلیم کر چکی ہے یعنی یہ خیال کہ معاشی زندگی کا ایک قدرتی نظام ہوتا ہے جو ظاہر ہے کہ ہر جگہہ ایک سا ہونا چاہئے۔ تعجب ہے کہ باوجود اس کے کہ تاریخی نقطہ نظر کے پیدا ہونے کے بعد اس خیال کی بے بنیادی ظاہر ہو چکی ہے تاہم اکثر نہایت ممتاز معاشیین اب تک اس کو معاشیات کا مرکزی تصور بنائے ہوے ہیں۔

لیکن بعض علمائے معاشیات ایسے بھی ہیں جنہوں نے محسوس کر لیا ہے کہ یہ تصور حیات معاشی کی مختلف شکلوں کو سمجھنے کے لئے کوئی مدد نہیں دیسکتا اور انھوں نے کوشش کی ہے معاشی زندگی کی تقسیم اس اعتبار سے کریں کہ اس میں پیدائش اور اس کی کیفیت کیا ہے اور اس طرح حیات معاشی کی بوقلمونی میں ایک طرح کا نظام پیدا کر کے اس کی ماہیت سمجھنے میں آسانی پیدا کریں۔ قوموں اور جماعتوں کو مروجہ طریق پیدائش اور ان کے اعتبار سے تقسیم کرنے کا خیال دراصل بہت قدیم ہے۔ چنانچہ خود ارسطو نے اپنی مشہور

کتاب "سیاست" میں خانہ بدوش، زراعت پیشہ، قزاق، مچھیرے اور شکاری جماعتوں کی تقسیم کی ہے اور انھیں فطری طریقہائے پیدائش دولت قرار دیکر انکے مقابلے میں وہ جماعت پیش کی ہے جسکا مقصد روپیہ کمانا ہو جسے یہ غیر فطری طریق بتلاتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اجتماعیات کی تصانیف میں بھی اس قسم کی تقسیم اکثر ملتی ہے لیکن اس تقسیم کو سب سے زیادہ فروغ ہوا فریڈرش لسٹ کی تصنیف سے جسمیں اس نے حالت معاشی کی پانچ قسمیں کی ہیں یعنی (۱) وحشت کا زمانہ (۲) گلہ بانی کا عہد (۳) زراعت کا عہد (۴) زراعت وصنعت کا عہد (۵) زراعت، صنعت و تجارت کا زمانہ۔ اس پر پھر دوسرے معاشیین نے مزید کام کیا ہے اور جرمنی میں خصوصاً شمولر نے اس خیال کی نہایت عمدہ تفصیل کی ہے اور مختلف عہدوں کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اور سچ ہے کہ اس تقسیم پر ہم یہ اعتراض نہیں کر سکتے کہ یہ خالی ہے اور معاشی زندگی کی رنگا رنگی کو ظاہر نہیں کرتی۔ ہر عہد کی بہت سی جزوی کیفیات ہمیں اس تقسیم میں ضرور ملتی ہیں لیکن جس چیز کی ہمیں تلاش ہے وہ ہے ان اجزا کا باہمی تعلق اور ربط یا ایک وحدت ذہنی سے اس کا کوئی مفید تحقیق تصور۔ اور یہی ہم اس تقسیم و تفصیل سے بھی نہیں پاتے۔ اچھا تک گلہ بانی، شکار اور زراعت کا تعلق ہے ہم اس تقسیم میں ایک جماعت کے خاص طریقہ پیدائش کا پتہ ضرور پاتے ہیں لیکن معاشی زندگی صرف پیدائش دولت سے تو عبارت ہے نہیں مثلاً ایک گلہ بانی کرنے والی جماعت آزاد انسانوں سے بھی مرکب ہو سکتی ہے اور اس میں غلام بھی ہو سکتے ہیں، پھر ان دونوں حالتوں میں کیا انکا نظام معاشی صرف اس بات کے معلوم ہونے سے ہماری سمجھ میں آسکتا ہے کہ یہ دونوں گلہ بانی کرنے والی جماعتیں ہیں؟ لیکن پھر ہو، ان ابتدائی معاشی حالات میں تو پیدائش دولت کی کیفیت سے معاشی زندگی کا خاصہ

...ہو جاتا ہے۔ لیکن جب معاشی زندگی زیادہ پیچیدہ ہوجاتی ہے تو پھر پیدائش دولت
...ن تمام قسم کی چیزون تک محدود نہین رہتی، اسوقت کسی ایک قسم کی پیدائش دولت کو
اس عہد یا ملک کی معاشی خصوصیت نہین کہہ سکتے اور اس عہد یا ملک کی معیشت کے سمجھنے
کے لئے ضرورت ہوتی ہے اس کے آئین وقوانین، جماعتی طبقات، تقسیم عمل اور طریقہ کار
الغرض ان تمام مظاہر کی جنپر یہ معاشی زندگی مشتمل ہے۔ ایسی صورت مین "حالت
پیدائش" مرادف ہوجاتی ہے "حالت معاشی" کی۔ اور اسی حالت معاشی کا سمجھنا تو
مقصد ہے، یہ اس کے فہم کے لئے مرکزی تصور کے طور پر کیونکر کام آسکتی ہے۔

ایک تیسری تقسیم جرمنی کے مشہور معاشی بیوشر نے کی ہے جو یورپ کے معاشیین و
مورخین کے نزدیک بہت مقبول ہے۔ یعنی معاشی زندگی کی ذہنی تنظیم اس لحاظ سے کیجائے کہ
چیزون کے بنانے والون اور صرف کرنے والون کے درمیان کتنا بڑا راستہ ہے؟
اس اعتبار سے وہ معیشت بلا مبادلہ کا ایک عہد قرار دیتے ہین؛ دوسرا عہد وہ جسمین پیدا
کرنے والا براہ راست استعمال کرنے والے کے لئے چیزین پیدا کرتا ہے۔ یعنی چیزین اپنے
گاہکون کے لئے بنائی جائین جیسے آج کل بھی کثرت سے ہندوستان مین ہوتا ہے اور جو
قرون وسطیٰ مین یورپ مین بھی عام رواج تھا؛ تیسرا عہد وہ ہے جسمین چیز پیدا کرنے والے
سے استعمال کرنے والے تک پہونچنے مین ایک طویل راہ طے کرتی ہے۔ یہ تقسیم ہمارے
علم کے مرکزی تصور کے طور پر کہان تک مدد دے سکتی ہے؟ یہ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آج
لاکھون روپیہ سے چلنے والا ایک جوتون کا کارخانہ جو اپنے مال کو خود اپنی دوکانون پر فروخت
کرتا ہے اور وہ موچی جو جوتا تیار کرکے گاہک کو دیتا ہے دونون ایک ہی تقسیم مین آتے
ہین۔ وہ تصور جو ان دو مشرق و مغرب کیطرح مختلف طریقہای پیدائش کو ایک ساتھ کرکے

مظاہر معاشی کی ترتیب و ... سبب کیا مدد دیسکتا ہے ... سبب کا شہر و آفاق کارخانہ جو پورے ایک شہر مین پھیلا ہوا ہے اور ایک لوہار جو اپنی بھٹی پر بیٹھا چند گاہکوں کے لئے کچھ پرزے بنا تا ہے دونوں کیا ایک ہین؟ لیکن کیا کرپ کا سارا کام گاہکون کی فرمایشوں پر نہین بنتا؟ صرف فرق یہ ہے کہ ایک کے گاہک غریب افراد اور دوسرے کے گاہک متمول حکومتین ہین!

غرض سطور بالا نے یہ ظاہر کر دیا ہوگا کہ معاشی زندگی کو قابل فہم بنانے کیلئے جو جو مرکزی تصور قائم کئے گئے وہ یا تو بالکل بے رنگ تھی یا مظاہر معاشی کے صرف ایک ... پر ... تھے صرف "نظام معاشی" کا تصور جسکا ذکر ہم نے اوپر کیا اس مین یہ صلاحیت ہے کہ مختلف قومون اور زمانون کے معاشی حالات مین کوئی ترتیب اس کی مدد سے پیدا کیجا سکے - یہ کافی ہمہ گیر ہے اور معیشت کے اجزائے ضروری یعنی مقصد نظام اور صنعت تینون پر حاوی ہے پھر یہ کافی صاف اور قطعی بھی ہے اور اس کی مدد سے معاشی زندگی کے عناصر ضروری کا فہم اور مقابلہ نہایت آسان ہوجاتا ہے - اور یہ اتنا عام بھی ہے کہ ہر ممکن معاشی زندگی اس تصور کے ماتحت لائی جاسکتی ہے - اور یہ اس کی نوعیت و کیفیت کے تعین کے لئے ان سب تصورات سے زیادہ کارآمد ہے - جنکا مختصر ذکر ہم اوپر کر چکے ہین اور چونکہ معاشیات نام ہے اس علم کا جو معاشی زندگی کا مطالعہ کر کے اس کے سمجھنے مین مدد دے اس لئے ہم کہہ سکتے ہین کہ وہ علم جو اعمال معاشی کا مطالعہ اس مذکورہ تصور کے ماتحت کرے یعنی جو اس زندگی کے مقصد یا رواج یا ترتیب یا نظام اور طریقہ کار یا صنعت کے تینون پہلوؤن سے دیکھے اس کا نام ہے "معاشیات"۔

باغی

(گذشتہ سے پیوستہ)

خدا خدا کر کے دونوں اسٹیشن پر پہونچے ٹکٹ بابو جھپٹ کر ٹکٹ گھر میں گیا اور
اوس نے فوراً وہ چھوٹی سی کھڑکی کھولی جس میں سے وہ کسانوں کو ٹکٹ دیا کرتا تھا۔
حالانکہ کوئی مسافر موجود نہ تھا اور وہ خوب جانتا تھا کہ کسان اگر گاڑی کے وقت سے چھ
گھنٹے پہلے نہ پہونچ جائیں تو پھر وہ نہیں آتے۔ لیکن اوسے اپنے ٹکٹ گھر سے بہت محبت تھی۔
وہاں بیٹھ کر وہ اپنے وسیع اختیارات کا لطف اٹھاتا تھا جنہیں وہ اس طرح استعمال کرتا تھا
کہ کسی کو ٹکٹ دیا کسی کو نہ دیا اور جسے چاہا خوب خوشامد کرائی۔ وہاں اوسے یہ احساس ہوتا
تھا کہ کسان اوس سے مرتبہ میں بدرجہا کم ہیں اور اون سے گفتگو اور برتاؤ کا طریقہ محض
اوس کی مرضی پر موقوف ہے۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کسانوں سے من مانے دام وصول کر لے بلکہ
عموماً کسان اوس سے کرایہ میں رعایت کی درخواست کرتے تھے اور وہ انھیں جھڑک کر
مقررہ کرایہ سے زاید وصول کرنے کی دھمکی دیتا تھا مگر آخر میں بڑا احسان جتا کر ٹھیک دام
پر ٹکٹ دے دیتا تھا۔ اور اگر کوئی کسان اپنے لڑکے یا لڑکی کے لئے جس پر بلوغ قانونی
کا شبہ ہو سکے آدھا ٹکٹ مانگتا تھا تو یا سو نہایت خشونت سے اور اوس سراغ رس کا سا
منہ بنا کر جو کسی مشتبہ آدمی سے جرح کرتا ہے اوس لڑکے یا لڑکی کو اپنی کھڑکی کے پاس
بلاتا تھا اور اوس کے دانت اور زبان کا معائنہ کرتا تھا اور بہت سے سوال پوچھتا تھا
جو اوس نے خود بنا رکھے تھے۔ اوس کا خیال تھا کہ وہ ان سوالات سے اوس لڑکے یا لڑکی

کی سمجھ کا اندازہ کرکے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اوس کی کیا عمر ہے عموماً اگر ذرا بھی موقعہ ہو تو وہ یہ فیصلہ کرتا تھا کہ پورا ٹکٹ خریدنا چاہئے۔کسان کو اوس کی بیوقوفی اور بیچپڑپن پر ڈانٹتا تھا اور دھمکاتا تھا کہ وہ اُسے کارکنان ریلوے کو دہوکا دینے کے الزام مین پولیس کے سپرد کردیگا مگر آخر مین یہ کہہ کر آدھا ٹکٹ دیدیتا تھا کہ پھر کبھی نہ دونگا۔ وہ ہمیشہ سمجھتا تھا کہ اوسکا ضمیر اوسے اس طرز عمل پر مجبور کرتا ہے۔اوس کے نزدیک کسانون کو دہمکانا اور گالی دینا بہت ضروری ہے ورنہ بقول اوس کے "خدا جانے کیا ہوجائے"۔

وہ کچھ دیر تک ٹکٹ گھر مین بیٹھا اپنے حسابات دیکھتا رہا وس کے بعد یہ خیال کرکے کہ اب اوسے اپنے اختیارات کے استعمال کرنے کا موقع نہین ملیگا اوس نے ٹکٹ گھر کو بند کردیا۔ پلیٹ فارم پر بڑے بابو ٹہل رہے تھے۔ وہ اب تک محویت کے عالم مین اوس پیغام پر غور کر رہے تھے جو انھین آم کے کنج کی زبانی ملا تھا۔ انھین یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب تک کنج مین ہین۔ وہ کان لگا کر اور دل لگا کر اوس پیام امن کو سننا چاہتے تھے اور اپنی روح کو اوس کی موسیقی سے پر کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ دنیا مین آم کے کنج کیطرح کسی کے لئے برکت، کسی کے لئے نعمت عظمیٰ ہوجائین، اور اون لوگون کے سامنے جو ان اسرار سے واقف نہ ہون متانت اور وقار کا مجسمہ بن کر رہین۔ شام کی تاریکی سے انھین کوئی الجھن نہ تھی، یہ سوچ کر بھی نہین کہ اب کنج اون کی نظر سے چھپ جائین گے۔ آج شام کو ان کنجون مین ایک نئی شان پیدا ہوگئی تھی اور اون کا اثر بھی اسٹیشن ماسٹر کے دل پر نئی طرح کا تھا۔ یہ اب درختون کے جھنڈ نہین تھے بلکہ ایک فلسفیانہ تصور بن گئے تھے۔ یہ اب اشیا نہین تھے جس کا خیال کیا جائے بلکہ خود خیالات تھے اس قابل کہ آدمی اون سے لطف اٹھائے اون مین محو ہو کر سو جائے اور (اپنے آپ کو) زندگی کے عظیم الشان سمندر مین

ایک قطرہ سمجھے اور اوس کی بے پایان وسعت مین گم ہو جائے ۔

ٹکٹ بابو نے دور سے دہوان دیکھا، اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سنبھل کر کھڑا ہو گیا تاکہ مسافرون سے ٹکٹ لے ۔ لیکن بڑے بابو اب تک اس اطمینان سے ٹہل رہے تھے گویا کوئی گاڑی وہان نہین آ رہی ہے گویا وہ ہر قسم کے فرائض اور افکار سے بے تعلق ہین ۔ جب گاڑی پہونچ گئی تو وہ آہستہ آہستہ اپنے آفس مین گئے وہان سے لین کلیر اور سبز جھنڈی لے آئے ۔ لیکن آج وہ اپنے خیالات مین اس قدر محو تھے کہ وہ اپنے معمول کے مطابق ڈرایور سے مسکرا کر پوچھنا بھول گئے کہ تمہارا انجن اگلے اسٹیشن تک کام دیگا یا نہین، اور جب گاڑی چھوٹنے کا وقت آیا تو اونھون نے زبان سے کچھ نہین کہا بلکہ صرف سبز جھنڈی ہلا دی۔

گاڑی سے صرف ایک مسافر اترا ٹکٹ بابو دروازہ پر اوسکا انتظار کرتا رہا جب وہ نہ آیا تو پلیٹ فارم کی طرف لپکا ۔ وہ اس پر بہت اصرار کرتا تھا کہ کسان ٹکٹ پلیٹ فارم پر نہین بلکہ مقررہ جگہہ پر دین ۔ حالانکہ انھین آسانی پلیٹ فارم پر ہی دینے مین ہوتی تھی کیونکہ اون کو متعدد گٹھریان کھول کر ٹکٹ نکالنا پڑتا تھا ۔ ٹکٹ بابو شاید اس ارادہ سے آیا تھا کہ مسافر کو خلاف ورزی قانون اور مزاحمت سرکار کے جرم مین خوب ڈانٹے ڈپٹے اور اوس کے کانپتے ہوے ہاتھون سے ٹکٹ نکالنے کا تماشہ دیکھے ۔ لیکن اوسے خلاف توقع ایک عجیب منظر دکھائی دیا ۔ اوس نے ایک تنومند کسان کو دیکھا جس کے ہاتھ مین بڑی سی لاٹھی تھی اور جو کھڑا ہوا غضب آلودہ نظرون سے ہر طرف دیکھہ رہا تھا ۔ کچھہ فاصلہ پر بڑے بابو کھڑے تھے اور خاموش ملامت کے انداز سے کسان کو دیکھہ رہے تھے ۔ کسان نے ٹکٹ بابو کو دیکھہ کر گرج کر کہا اور کون

سارجم سے ٹکٹ مانگ سکتا ہے" ٹکٹ بابو اس طرح کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے اوس کے پیر کھونٹے ہوں اور خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ کسان نے پھر اوسی لہجہ میں لاٹھی پلیٹ فارم پر ٹیک کر کہا "ہم سے کوئی سار ٹکٹ نہیں مانگ سکتا۔" ٹکٹ بابو رنو چکر ہو چکا تھا۔ اب وہ بڑے بابو کی طرف مخاطب ہوا۔ بڑے بابو جن پر ذرا بھی خوف طاری نہ تھا نہ جھجکے سے پوچھا "کیا تمہارے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔" کسان نے ایک قدم آگے بڑھ کر اور لاٹھی ٹیک کر کہا "تو ان تم ہم سے ٹکٹ منگیو" ٹکٹ بابو اپنے سونے کے کمرے کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ وہ چاہتا ہی تھا کہ ڈیا لی مچانا شروع کرے لیکن اوسے خیال آیا کہ کسان کو اسکی جائے پناہ معلوم ہو جائے گی اور وہ بھی قتل عام میں مارا جائے گا بڑے بابو اور کسان چند لمحہ تک خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور بڑے بابو نے جواب تک خوف زدہ نہ تھے کہا "دیکھو بھائی اگر تمہارے پاس ٹکٹ ہے تو دیدو نہیں اپنا راستہ لو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا مگر اس قدر لال پیلا ہونے کی کیا ضرورت ہے" کسان نے پھر بدتمیزی کے ساتھ کہا "چلے ہیں ہم سے ٹکٹ مانگن" اس کے بعد وہ دروازہ کی طرف مڑا اور نکل کر اکڑتا ہوا چلا گیا۔ بڑے بابو پھر ٹہلنے لگے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اور پھر آم کے کنج کے خیال میں غرق ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد ٹکٹ بابو اپنے سونے کے کمرے سے ڈرتا ڈرتا نکلا جیسے اوسے ہر لمحہ لاٹھی پڑنے کا خوف ہو اور سگنل والے کی کوٹھری کی طرف چلا۔ سگنل والا بھی اسی طرح احتیاط کے ساتھ ٹکٹ بابو کے کمرے کی طرف جا رہا تھا دونوں میں پلیٹ فارم پر مڈبھیڑ ہو گئی۔

ٹکٹ بابو نے آہستہ سے پوچھا "تم نے اوسے دیکھا تھا" سگنل والے نے کہا

رو ہا ن "ٹکٹ بابو نے کہا ، بڑا غضب ہوا اب وہ جا کر دوسرے کسانون سے کہے گا اور سب لاٹھی باندھ باندھ کر آئین گے اور ہمین مار ڈالین گے ۔میرے خیال مین ہمین فوراً پولیس کو اطلاع کرنا چاہیئے "۔

سگنل والا بولا ، ہان رپورٹ فوراً کرنا چاہیئے ہین ۔مگر تون سے تھانے مین جائین ۔ یہ جو گاؤن مین ہے اس مین تو مین کبھی نہین جاؤن گا ۔ ہان ریل کے کنارے کے کسی تھانے مین کہئے تو چلا جاؤن "۔

ٹکٹ بابو نے کہا " ہان میری بھی یہی رائے ہے ۔ اور مین بڑے بابو سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے نام یہ رپورٹ ضرور بھجواؤنگا کہ سارا علاقہ خطرناک ہوگیا ہے اور ہماری جانین محفوظ نہین "۔

بڑے بابو ٹہلتے ہوئے ان دونون کے پاس سے گذر رہے تھے مگر اُنھوں نے ان کو نہین دیکھا کیونکہ ایک تو رات ہوگئی تھی دوسرے وہ اپنے خیالات مین بالکل ڈوبے ہوئے تھے ۔ دیر تک یہ دونون خاموش اور بے حس وحرکت کھڑے رہے اور اسٹیشن ماسٹر کو اتنی تیزی سے ٹہلتے ہوئے دیکھتے رہے ۔

تھوڑی دیر کے بعد اون کی آواز آئی " بابو ۔ بابو ۔ آؤ نکل آؤ اب کوئی خطرہ نہین "، وہ سمجھے تھے کہ ٹکٹ بابو اب تک اپنے گھر مین ہے ۔

سگنل والے نے بابو کو ہٹو کا دیکر کہا " مدد جائیے آپ کو بڑے بابو بلا رہے ہین ۔ مین اپنے سگنل پر جاتا ہون ۔ اور آپ بڑے بابو سے کہہ دیجئے کہ ایک چوکیدار رکھ لین میری جان فالتو نہین ہے "، یہ کہہ کر سگنل والا لمبا ہوا اور ٹکٹ بابو کو وہین کھڑا چھوڑ گیا ۔ ٹکٹ بابو کو اب سوا ئے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اوس مقام کی طرف بڑھے جہان ادسے

اندھیرے میں بڑے بابو کے سفید کپڑے نظر آرہے تھے۔

اوس نے بہت آہستہ سے کہا "کیا آپ نے مجھے پکارا تھا" وہ بڑے بابو کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا گویا اون میں اوسے خونخوار کسان کی کچھ جھلک نظر آتی تھی۔

بڑے بابو نے اوس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہاں میں نے پکارا تھا۔ آؤ دیکھو کیسی پیاری رات ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دم بھر میں چاند کہیں سے نکل آئے گا۔ وہ دیکھو ایک جگہ ہے جہاں تاریکی سب سے زیادہ گہری ہے یہی وہ کنج ہے جہاں ہم تھوڑی دیر ہوئی بیٹھے تھے۔ کہو پھر چلتے ہو"۔

ٹکٹ بابو جانے کے خیال ہی سے کانپ گیا۔ اوس نے فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا "جی نہیں" کچھ دیر ٹھہر کر اوس نے پھر کہا "ہاں یہ تو بتائیے آپ اوس کسان کے معاملے میں کیا کریں گے۔ بہت سخت کارروائی کی ضرورت ہے" بڑے بابو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "میں کیا سخت کارروائی کروں جب میرے اردگرد ہر چیز پر امن وامان خاموشی اور سنجیدگی چھائی ہوئی ہے"ٹکٹ بابو نے نہایت حیرت کے ساتھ کہا "آپ کچھ نہیں کریں گے۔ مگر یہ تو سوچئے کہ سب کسان لاٹھی باندھ کر آیا کریں گے اور ہم اون سے ٹکٹ مانگیں تو ہمیں مار ڈالیں گے" بڑے بابو نے "نہیں وہ ایسا نہیں کریں گے" ٹکٹ بابو نے گھبرا کر پوچھا "آپ کیسے کہتے ہیں کہ وہ نہیں کریں گے"۔

"کیونکہ مجھے معلوم ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں جس شخص نے آج بدتمیزی کی وہ "باغی" تھا۔ وہ سب لوگوں کی طرح نہیں تھا۔ دوسرے کسان جہاں تک اون سے ہوسکتا ہے سارے قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور فطرت کی ہم آہنگی کے اثر سے وہ بھی امن پسند ہوجاتے ہیں"۔

"اور جو وہ سب باغی ہو جائین"

بڑے بابو پر دفعتہً یاس کا غلبہ ہوگیا اور وہ کہنے لگے

"باسو معلوم ہوتا ہے تم خود باغی ہو ورنہ ایسی باتین نہ کرتے ۔ تم عالم فطرت کو جو تمہارے گرد ہے ذرا بھی نہین سمجھ سکتے ورنہ تم ایسے خیالات نہ رکھتے ۔ مجھے دیکھو مین چالیس برس کا ہو گیا مگر مین ہر وقت ہر جگہہ بیدھڑک جا سکتا ہون ۔ تم جوان آدمی ہو مگر ڈرا کرتے ہو کہ لوگ بس تمہین مارنے کے لئے منتظر ہی بیٹھے ہین نہیں بھائی تم بھی باغی ہو تم بھی نہین سمجھتے ۔ آج شام والے کسان کی طرح تم بھی یہی خیال کرو کہ ہر چیز دنیا مین تمہاری مخالفت پر تلی ہے تو پھر تم بھی لاٹھی باندھا کرو نہ ۔

ٹکٹ بابو نے کچھہ جواب نہ دیا کیونکہ وہ سمجھا ہی نہین اور اگر اس مین ہمت ہوتی تو وہ اس پر بہت خفا ہوتا کہ بڑے بابو نے اوسے باغی کہا اور ایک معمولی کسان اور مجرم سے اوس کا مقابلہ کیا ۔ وہ چپ چاپ بڑے بابو کے پاس کھڑا تھا اور اوسے بڑا سہارا یہ تھا کہ اندھیرا ہے اسوقت کوئی حملہ کرنے نہ آئے گا ۔

بڑے بابو نے کہا " اور مین کر ہی کیا سکتا ہون اگر مین پولیس کو اطلاع کرتا ہون تو وہ کسی بے گناہ کو پکڑ کے اس پر جرمانہ کر دیگی ۔ یہ پولیس والے بھی نہین سمجھتے کسان اکٹھے ہو کر بلا ٹکٹ سفر کرنے نہین آئینگے کیونکہ وہ جانتے ہین اگر وہ ایسا کرین تو پولیس اونکا چالان کر دیگی ۔ تمہین ڈرنے کی کوئی وجہ نہین "

ٹکٹ بابو نے بہت زور دیکر کہا " مین ڈرتا نہین ہون صرف سردی کے سبب سے کانپ رہا ہون ۔ آپ جانتے ہین اب سردی پڑنے لگی ہے ۔ مگر سنئے بڑے بابو آپ کو کچھہ نہ کچھہ ضرور کرنا چاہئے ورنہ کسانون کی نظر مین ہماری بڑی بدرعبی

ہوگی اور خدا جانے کیا ہو جائے گا۔"

"میں اس وقت جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم کو گھر پہونچا دوں اب کوئی کام نہیں اس لئے ہمیں اب آرام کرنا چاہئے۔"

دونوں گھر چلے گئے۔

ٹکٹ بابو کو بہت دن تک خواب میں خونخوار کسان نظر آتے تھے اور نیند آنا دشوار تھا۔ اور جب کبھی اوسے دفعتہً اوس شام کا حادثہ یاد آتا تھا وہ جھپٹ کر ٹکٹ بابو کے پاس جاتا تھا۔ اور اون سے منت سماجت سے کہتا تھا کہ وہ شدید تدابیر اختیار کریں اور کسانوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔

شذرات

گذشتہ پرچہ مین محمد مسلم صاحب کے مضمون "منصور حلاج" کا عنوان سرورق پر چھپنے سے رہ گیا امید ہے کہ موصوف اور دیگر قارئین معاف فرمائینگے۔

ہمارے رسالہ کے مدیر اور جامعہ ملیہ کے استاد تاریخ اسلام مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کو اس مہینہ مین ایک صدمہ جانکاہ برداشت کرنا پڑا۔ موصوف کی اہلیہ محترمہ چہارشنبہ گذشتہ کو کئی ہفتہ کی علالت کے بعد راہی جنان ہوئین۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم موصوف سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہین اور خدا سے دعا کرتے ہین کہ انھین صبر جمیل عطا فرمائے۔ قارئین جامعہ یقیناً اس بارے مین ہمارے ہمنوا ہونگے اس لئے ہم اون کی طرف سے بھی رسم تعزیت ادا کرتے ہین۔

جامعہ ملیہ نئے اور پرانے کارکنون کے اتحاد عمل سے روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ اسکول اور کالج کی پڑھائی کا نظام بدلا جا رہا ہے اور قابل قدر اصلاحات ہو رہی ہین۔ طلبہ کی نگرانی کے لئے علاوہ استادون کے اتالیق مقرر ہوئے ہین۔ جو اون سے وقتاً فوقتاً ملتے ہین اور ان کی انفرادی ضرورتون کا لحاظ کرتے ہوئے اونھین ہر امر مین مشورہ دیتے ہین۔ ماہ مبارک کے بعد سے برابر نئے طلبہ اسکول مین آ

معتدبہ اضافہ ہوجائے گا۔ مزدوری پیشہ لوگوں کی تعلیم کے لئے جامعہ ۱۴ اپریل سے شبینہ مدارس کا انتظام کررہی ہے جن میں متحرک تصاویر کی مدد سے نوشت وخواند مسایل دینیات۔ حساب اور اصول حفظان صحت کی تعلیم دیجائے گی۔

جامعہ کے کارکنوں میں ایک مایۂ ناز اضافہ ہوا ہے جناب قاری سرفراز حسین صاحب عزمی کے نام نامی سے ہر تعلیم یافتہ مسلمان واقف ہوگا۔ جناب موصوف نے جامعہ ملیہ کے دفاتر کی نگرانی اور حسابات کی جانچ کے لئے اپنی قیمتی خدمات بلا معاوضہ وقف فرمائی ہیں۔ ہم جناب موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں خدائے تعالےٰ اوھیں ان توجی خدمات کا اجر دیگا۔

جامعہ ملیہ کے مفصل حالات پندرہ روزہ رسالہ پیام تعلیم سے معلوم ہو سکتے ہیں اوس میں آئندہ نمبر سے ماہوار اور یکمشت چندوں کی رقوم اور معطیوں کے نام چھپا کریں گے اس کے علاوہ ہر قسم کے مفید اور دلچسپ تعلیمی مضامین بچوں اور بڑوں کے لئے شائع ہوا کریں گے حجم ۱۸×۲۲/۴ کے ۸ صفحے ہوگا سالانہ چندہ ۱؎ مقرر کیا گیا ہے۔ مگر خریدان جامعہ سے صرف ۸؎ ہوگا۔

---

۱۹ اپریل کے جلسہ میں مرکزی خلافت کمیٹی نے طے کیا ہے کہ ایک وفد بسرکردگی مولانا سید سلیمان ندوی موتمر اسلامی میں شرکت کی غرض سے حجاز بھیجا جائے۔ وفد میں مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی صاحب بھی ہونگے۔ ہم امید

وفد کے ضروری یا غیر ضروری ہونے کے بارے مین اب کوئی رائے دینا فضول سمجھتے ہین البتہ اراکین وفد سے یہ ضرور کہین گے کہ حجاز کی سیاسی حالت اوس سے زیادہ پیچیدہ ہے جتنا لوگ سمجھتے ہین ۔ مغربی حکمت عملی کی ریشہ دوانیان برابر جاری ہین اور اون سے سوائے مقامی مدبرین کے کسی کو واقفیت کا موقع حاصل نہین اس لئے جو لوگ اخوت دینی کے جوش مین اہل حجاز کو مشورہ دینے جائین اونھین چاہیئے کہ کوئی اذعانی دستورالعمل پہلے سے بناکر ساتھ نہ لے جائین بلکہ وہان کے حالات کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد رائے دین ۔ ہم اونھین اس طرف بھی توجہ دلانا چاہتے ہین کہ ہندوستان اور حجاز بلکہ تمام ممالک اسلامی کے مابین علمی اور ذہنی تعلقات پیدا ہونا سیاسی کانفرنسون سے کہین زیادہ ضروری ہے اگر وہ اس بارے مین کوئی سہولت پیدا کرسکین تو ہم سمجھین گے کہ انکا سفر کامیاب ہوا ۔

آجکل رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے موقر رسالہ مین یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ بدایون (جہان کے للامشہور ہین) اصل مین بداؤ ہے یا بدایو یا بداؤن یا بدہاؤن یا بدآؤن یا بداون ۔ ہندوستان سے واقفیت رکھنے والے ارباب علم اور سول سروس والے اپنی اپنی رائے کا اظہار کررہے ہین سوال صرف یہ نہین ہے کہ ابتدا مین اس شہر کا نام کیا تھا بلکہ یہ بھی کہ آجکل ہندوستان مین اسے کیا کہتے ہین ۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اس بحث کے مضحک پہلو سے قطع نظر کرکے مسئلہ کے حل کرنے مین داد تحقیق دین ۔

ادبیات

انجام بخیر

ہائے وہ دن کہ محبت کا ہوا تھا آغاز   حسن تھا محو کرم عشق تھا مصروف نیاز
مائل جور نہ تھی وہ نگہہ عشوہ باز   کیا خوش آئند تھے الفت کے وہ پہلے انداز

میگذشتیم بہ جانان سر راہے گاہے
اوہم از لطف نہان داشت نگاہے گاہے

رفتہ رفتہ طپش قلب نے بدلا پہلو   شوق نے تھام لیا درد جگر کا بازو
نہ رہا ضبط کو بیتابی دل پر قابو   کر چلین اون کا تعاقب مری نظرین ہر سو

مگر میری اون سے ملاقات تھی گاہے گاہے
محفل غیر مین گاہے سر راہے گاہے

پھر تو اس درجہ بڑہی خار محبت کی خلش   کام کرنے لگی سینہ مین غضب کی کاہش
دل مین لہرانے لگی وصل صنم کی خواہش   چشم فتان سے یہی ہونے لگی فرمایش

اس طرف بھی[1] تجھے لازم ہے نگاہے گاہے
دم بدم لحظہ بہ لحظہ نہین۔ گاہے گاہے

آخر کار حقیقت کے جو دیکھے آثار   ہو ترشی زہد سے اترا مئے ظاہر کا خمار

---

[1] یہ تصرف ہے اصل شعر مین "نہین" ہے۔

لذت درد نے بخشا دل مضطر کو قرار　　عرض کرتا ہے یہ جانان سے یہ چشم خونبار

نہیں جون گل ہوس ابر سیاہی گاہی
کاہ ہون خشک مین اے برق نگاہی گاہی

قدیم و جدید وضع

اکبر مرحوم کی ایک پرانی نظم

قدیم وضع پہ رہتا ہون مین اگر قایم　　تو صاف کہتے ہین سید یہ رنگ ہے میلا
جدید وضع کو گر اختیار کرتا ہون　　خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی پوچھو تو وہ ادھر نہ ادھر　　ہر ایک نے پاؤن دے حد سے بغل پھیلا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک　　ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
ادھر یہ ضد کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے　　ادھر یہ شور کہ ساقی صراحی مے لا

غرض دوگونہ عذاب است جان مجنون را
بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ

رفتار تعلیم

مسلمان بہار کے محترم رہنما مولوی محمد شفیع صاحب گزشتہ چند ہفتون مین دوبارہ جامعہ تشریف لائے۔ موصوف نے جامعہ کے تمام شعبہ ملاحظہ کئے اور پسندیدگی کا اظہار فرما کر کارکنون کی ہمت افزائی کی۔ موصوف کوشش کر رہے ہین کہ بہار کے اسلامی مکاتب مین جامعہ کا نصاب تعلیم جاری ہوجائے۔

جامعہ مین ابتدا سے اس بات کی کوشش ہورہی ہے کہ مسلمان بچون کے لئے درسی کتابین لکھی جائین جن مین ان چار اصول کا لحاظ رکھا جائے۔

(۱) مضامین کا انتخاب اس طرح ہو کہ بچون کو تمدن انسانی کے تمام شعبون سے بہ قدر ضرورت آگاہی اور ان سے انس پیدا ہوجائے۔

(۲) مثالین زیادہ تر اسلامی تمدن سے لی جائین تاکہ جذبات ملیہ کی زبردست قوت بیدار ہو کر بچون کی تہذیب نفس میں مدد و معاون ہو۔

(۳) حب وطن مذہبی رواداری اور وسعت نظر پیدا کرنے کے لئے ہندوستان کے غیر مسلم مصنفون کی بہترین تصنیفات سے بھی بعض حصے اخذ کئے جائین اور ہندوستان کے باہر کے انشا پردازون سے بھی مدد لی جائے۔

(۴) ترتیب مضامین اور طرز ادا مین مصنف طرز بچّے کی نفسی خصوصیات پر نظر ہے۔

(۵) تاریخی حقیقت اور واقعات کی سچائی کسی مصلحت سے ترک نہ کی جائے۔"

اس نصاب تعلیم کے چار سلسلے تیار کرنے کا قصد تھا (۱) دینیات (۲) تاریخ اسلام (۳) تاریخ ہند (۴) نصاب اردو۔ ان میں تاریخ اسلام پر مولانا اسلم صاحب جیراجپوری نے پورا سلسلہ تیار کر دیا ہے۔ نصاب اردو کی ترتیب اور تدوین اب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی کے سپرد کی گئی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ سال بھر میں مدارج ابتدائی اور اور ثانوی کے لئے اردو کا نصاب تیار ہو جائے گا۔ دینیات اور تاریخ ہند کی طرف بھی توجہ ہو رہی ہے اور انشا اللہ بہت جلد اس سے متعلق ہم کوئی اعلان شائع کر سکیں گے۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اگر کسی طرح کا مشورہ ہمیں نصاب تعلیم کے بارے میں دے سکتے ہیں تو اس میں دریغ نہ فرمائیں ہم اسے شکریہ کے ساتھ مجلس تعلیمی کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

تعلیم نسواں کے متعلق جناب عبد اللہ یوسف علی صاحب کا ایک مضمون رسالہ نورجہان میں شائع ہوا ہے جسے اور رسایل بھی نقل کر رہے ہیں۔ ادارت نورجہان کی درخواست پر "پیام تعلیم" بھی یکم مئی کی اشاعت میں اس کے ایک حصہ کو شائع کر رہا ہے۔ ہم سب تعلیم دوست حضرات کو اس کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔

تعلیم نسواں کا مسئلہ جتنا ہماری قومی زندگی کے لئے اہم ہے اسی قدر پیچیدہ بھی ہے۔

عورتوں کی تعلیم کی ضرورت کو اب سب اہل الرائے تسلیم کرتے ہیں لیکن طریقہ تعلیم و نصاب تعلیم کے بارے میں ابھی تک بہت اختلاف رائے ہے۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ لڑکیوں کی تعلیم گھر پر ہو اور بعض زنانہ مکاتب اور مدارس کے قیام پر زور دیتے ہیں۔ اس معاملے میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں۔ واقعات نے خود فیصلہ کر دیا ہے کہ سوائے چند دولتمندوں کے اور کوئی گھر پر لڑکیوں کی ثانوی اور اعلےٰ تعلیم تو درکنار ابتدائی تعلیم کا بھی انتظام نہیں کر سکتا۔ مدرسوں کا قائم ہونا لابدی ہے البتہ ان کے انتظام میں خاص حزم و احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اب رہا تعلیم کا نصب العین اور نصاب اس کے متعلق رائے دینے کے صرف امور خانہ داری۔ سینا پرونا پکانا ریندھنا وغیرہ سکھایا جائے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انھیں ادب لطیف نقاشی۔ موسیقی۔ دستکاری وغیرہ کی تعلیم دینا چاہئے تاکہ یہ اپنے لطیف حسیات کی تربیت کریں اور اپنی خوش مذاقی سے اپنے شوہروں کے دل کو موہ لیں۔

مگر یہ دونوں گروہ یکطرفہ رائے رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک عورت کو صرف معاشی اور اقتصادی زندگی کا اور دوسرا صرف جمالی زندگی کا اہل سمجھتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عورتوں میں ان دونوں چیزوں کی صلاحیت اور انھیں ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے بلکہ اس کے علاوہ علمی ذوق سے بھی صنف نسوان محروم اور بے نیاز نہیں۔ لیکن سب سے اہم پہلو حیات نسوانی کا معاشرت (اپنے وسیع معنی میں) ہے۔ عورت نسل انسانی کی غمخوار ہے۔ بچوں کو پالنے پوسنے بیماروں کی تیمارداری اور مایوس دلوں کو تسکین دینے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ عورتوں کے لئے نصاب تعلیم بنانے والوں کو یہ نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ہم واضح کر دو گروہ میں آئے۔ گروہ جو چاہتا ہے کہ لڑکیوں کو علاوہ مذہبی مسائل

تنقید و تبصرہ

قریہ ویران۔

راحت حسین صاحب بی۔اے۔ ایل ایل بی۔ وکیل ضلع سارن نے انگلستان کے شاعر گولڈ اسمتھ کی مشہور نظم "قریہ ویران" کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ یہ نظم انگریزی ادب کی باعتبار زبان ونفس مضمون، بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے گاؤں "اوبرن" کی خوشحالی کا مقابلہ اس خراب حالت سے کیا ہے جبکہ اس پر چند سرمایہ داروں نے تصرف حاصل کر لیا اور گاؤں والوں کی تمام خوشیاں اور فراغتیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔

ترجمہ بامحاورہ ہے اور حتی الامکان ہر انگریزی لفظ کے لئے مرادف اردو لفظ استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ اس کوشش کو نباہا ہے۔ مقدمہ میں اردو شاعری پر بسیط تبصرہ ہے جو غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، اردو اور نظم کے عنوان سے مضمون کتاب اور گولڈ اسمتھ کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کی طباعت کتابت اچھی خاصی ہے۔ کاغذ بھی سفید اور چکنا ہے۔ قیمت عہ ہے۔ مرغوب ایجنسی لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

خطاب بہ اقبال۔

خطاب بہ اقبال کے نام سے سید شوکت حسین صاحب علیگ نے ایک فارسی نظم لکھی ہے اور اسے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا ہے۔ نظم کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

موصوف کے نزدیک اقبال کا فلسفۂ "اشک ریزی" بے حوصلگی اور کم ہمتی کے مرادف ہے
موصوف کا خیال ہے کہ "سر زندگی" "عمل" میں پوشیدہ ہے اور محض "اشک ریزی" سے
سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں کہ قوم کے قوائے عملیہ اور زیادہ شل ہو جائیں۔ "زندگی"
"... اسرار و رموز حیات" "و رز عمل" ان الفاظ کو سنتے سنتے کان پک گئے۔ بے دیکھے زندگی
کی چیستان حل کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اور یہ اندیشہ غلط نہیں کہ ان وسیع الفاظ کی پامالی
ان معانی کی بے وقعتی کا باعث ہو جائے جو ان الفاظ میں پوشیدہ ہیں "زندگی" اول تو
کوئی راز نہیں اگر ہے تو ایک کھلا ہوا راز ہے، کیا اچھا ہو اگر بجائے "راز زندگی" "ورد عمل"
کی تسبیح پڑھنے کے ہمارے بہترین دماغ اس راز کی تفصیل تفسیر کریں تاکہ راز زندگی
دوسروں پر بھی آشکارا ہو سکے۔

ویسے نظم خوب لکھی ہے اور یقینی طور پر یہ کوشش ہمت افزائی کی مستحق ہے۔ اس
پمفلٹ کی قیمت ۲/ ہے، شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ لاہور سے
مل سکتی ہے۔

فرسٹ بک آف پینی ریڈنگ۔

اس کتاب میں حافظ فیاض احمد صاحب انصاری محاسب و استاد جامعہ ملیہ نے
چند مفید اور سبق آموز انگریزی مضمون کو ایک جگہ جمع کر کے ساتھ ساتھ ان کا اردو
ترجمہ شائع کر دیا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ مدرسہ جامعہ کے دو طالب علموں کا باہمی مکالمہ
بھی درج کیا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ حافظ صاحب کا ارادہ ہے کہ وہ مستقل پینی ریڈنگ
سیریز شائع کر دیں گے، جو طلبائے اسکول کے لئے بہت مفید ہوگی۔ ہم موصوف کے اس خیال
سے متفق ہیں اور ان کے اس اچھوتے خیال کی داد دیتے ہیں اس کتاب کی قیمت ۶/ ہے اور مصنف سے مل سکتی ہے۔
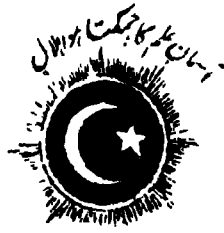
افغان

اپنی نورانی پلٹنوں سمیت سرحد ہند سے یکم جنوری ۲۹ء کو طلوع ہو کر کفر و طاغوت کی تاریکیوں پر چھا جانیوالا ہے۔ قرآن مقدس کی حکیمانہ تعلیم کا مبلغ۔ عروج و ترقی کے راستوں کا کھوج لگانیوالا آرگن۔ برادرانِ اسلام کے حالات بتانیوالا مورخ۔ دنیا بھر کے مذاہب کی تنقید کرنیوالا محقق۔ کرۂ ارض کے ماہوارنی واقعات پر تبصرہ کرنیوالا مدبر۔ ہر مرض کا تیر بہدف علاج بتانیوالا معالج۔ ادبی اخلاقی گلدستوں کا پیش کرنیوالا باغبان۔ دل آویز اشعار سنانیوالا بےنظیر شاعر۔ اور سائنس کے جدید مصنوعات کی حقیقت ظاہر کرنیوالا ہیئت داں ہے۔ پردہ نشین خواتین اسکی بہترین اخلاقی تعلیم سے بہرہ اندوز ہو سکتی ہیں۔ حصہ پشتو افغانی مستورات کیلئے مخصوص ہے کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب چندہ سالانہ للعہ صرف حصہ پشتو عہ نمونہ کا پرچہ چھ آنے

(ابوالمعانی آزاد۔ مدیر افغان۔ ہوتی مردان صوبہ سرحد)

اردو کا ماہانہ رسالہ

شمع۔ آگرہ

جنوری ۱۹۲۵ء سے شمع نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ لکھائی۔ چھپائی کاغذ غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب۔ محرکِ خیال اور معلوماتِ جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ اور تاریخی۔ سیاسی۔ اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیرانِ شمع مسٹر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ آگرہ ہیں۔ یہ حضرات بہترین تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں اور محض ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں انہیں کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے۔ تصاویر بھی شایع ہوتی رہتی ہیں

حجم ۱۱۲ صفحہ۔ قیمت سالانہ چھ روپیہ ۶؍ نمونہ کا پرچہ ۱۰؍

المشتہر مینیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہگنج آگرہ

”ہفتہ وار المومن“

”المومن“ جو تین برس سے ”قوم مومن“ کا ترجمان تنظیم اساوات کا علم بردار اور تمام غریب دیگر مسلم اقوام کا حامی ہے۔ ماہوار شایع ہوتا ہے۔ الحمد للہ کہ اب وہ قوم و ملت اور ملک کی قدر دانی سے انشاء اللہ جنوری سنہ ۲۸ء سے ہفتہ وار شایع ہوا کریگا۔ اگر آپ یا رچہ باف جماعت کی تاریخ زمانہ حال کی سچی تصویر اور علمی معاشرتی، اخلاقی، اقتصادی، صنعتی، تجارتی مضامین اور تعلیم دنیا خصوصاً ممالک اسلامیہ کی تازہ خبروں کا خلاصہ ہر ہفتہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہفتہ وار مومن، خریدیں سایز ذیل کراؤن ۲۰ × ۳۰ انچ ۱ - ۸ ہر نمبر کم از کم ۸ آٹھ صفحہ پر ہوگا۔ کاغذ سفید و چکنا کتابت و طباعت کے لئے ”المومن“ کا نام کافی ضمانت ہے۔ قیمت سالانہ للعہ روپیہ ششماہی ۸ فی پرچہ ۱/

مشتہرین کے لئے یہ نادر موقع ہے کیونکہ ہفتہ وار ”المومن“ عام نظروں سے گذرنے کے علاوہ ایسی قوم کا ارگن ہے جس کی تعداد ہندوستان مین تقریباً چار کروڑ بتلائی جاتی ہے اس کا ہر نمبر بہت کافی تعداد مین چھپیگا اور لاکھون انسانوں کی نظرون سے گذریگا حکماء، ڈاکٹران، تجار اور اہل صنعت و حرفت جلد اجرت کے متعلق خط و کتابت کریں۔

پتہ

مینیجر المومن - نمبر ۱۳۲ بنیا پکھور روڈ کلکتہ

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۶	مئی سنہ ۱۹۲۶ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

مطبوعات مکتبہ جامعہ ملیہ

تاریخ الامت
ابتدائے اسلام کی مکمل مسلسل اور مربوط تاریخ جو نہایت تحقیق کے ساتھ سلیس اردو میں لکھی گئی ہے۔

حصہ اول۔ سیرۃ الرسول قیمت عہ؍

حصہ دوم۔ خلافت راشدہ ،، ۔۔۔۔ ع

حصہ سوم۔ خلافت بنی امیہ ،، ۔۔۔۔ عہ؍

حصہ چہارم۔ خلافت عباسیہ ،، ۔۔۔۔ ع؍

حصہ پنجم۔ عباسیہ بغداد ،، ۔۔۔ ع؍

مبادی معاشیات
اکنامکس پر سلیس و فہمیدہ ترجمہ از پروفیسر ذاکر حسین صاحب استاد جامعہ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ تقریباً ۵۰۰ صفحہ قیمت عہ؍

انتخاب جوہر
طلبائے جامعہ کے قلمی رسالہ جوہر کا دلکش انتخاب نظم و نثر مع تازہ فوٹو مولانا محمد علی صاحب قیمت ۔۔۔۔ عہ؍

انتخاب میر
میر تقی کے کلام کا بہترین انتخاب مع مقدمہ مشتمل بر حالات میر و کلام میر از مولوی عبد الرحمن صاحب بی اے خوبصورت مجلد قیمت ۔۔ عہ؍

اورنگزیب عالمگیر
سائز ۲۲×۱۸ حجم ۱۲۵ صفحے کاغذ سفید کتابت و طباعت عمدہ مع ٹائٹل آرٹ پیپر پر رنگین و دیدہ زیب قیمت ۱۲؍

دیوان غالب
سائز [illegible] طبع نفیس خوبصورت مضبوط مجلد قیمت ۔۔۔ مر

مسدس حالی
سائز [illegible] طبع نفیس خوبصورت و مضبوط جلد قیمت ۔۔ مر

ہمارے نبی
صلعم اسلام کے سبق آموز حالات بچوں ہی کیلئے از پروفیسر سعید [illegible] قیمت مر

ترکوں کی کہانیاں
بچوں میں جرأت و غیرت پیدا کرنے والی چند ترکی بچوں کی سچی کہانیاں قیمت ۔۔۔۔۔۔ سہر

شعر و شاعری
سائز [illegible] کاغذ و طباعت و کتابت دیدہ زیب قیمت عہ؍

اسلامی تہذیب و قومی تعلیم
ڈاکٹر سر پی سی رائے کا خطبہ جشن دوم تقسیم اسناد جامعہ ملیہ قیمت سہر (اصل انگریزی) مع مقدمہ عبد المجید خواجہ قیمت ۔۔۔۔۔ ۱؍

ازہار العرب
عربی کی ادبی و اخلاقی سہل نظموں کا مجموعہ جامعہ کے نصاب درس میں داخل ہے۔ قیمت ۔۔۔ مر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ

قوموں کی زندگی کا مدار اس رشتہ پر ہے جو انہیں نظام کائنات اور خالق کائنات سے مربوط کرتا ہے اور وسیع معنوں میں مذہب کہلاتا ہے۔ جب تک کسی قوم میں یہ رشتہ مستحکم رہتا ہے تو افراد قوم کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑتا ہے اور وہ اپنے آپکو ودیعت الٰہی کا حامل یعنی اس امر کا ذمہ دار اور اہل سمجھتے ہیں کہ جسم اور روح کے اس طلسم کو جو حیات کہلاتا ہے، فنا کی قوتوں سے محفوظ رکھیں اور اسفل سے اعلیٰ کیطرف ابھاریں۔ مگر جب بعض ایسے اسباب سے جن کے سمجھنے سے فلسفۂ تاریخ اتبک عاجز ہے کچھ زمانہ کے بعد یہ رشتہ کمزور ہوجاتا ہے تو قوم کے لوگوں میں آرزوئے زیست مرجھا جاتی ہے انکے دلوں پر یاس کا غلبہ ہوجاتا ہے اور انکا نصب العین حیات طولاً وعرضاً دونوں حیثیتوں سے تنگ ہوجاتا ہے یعنی ہر فرد بجائے جماعت کی حیات کے خود اپنے نفس کی بقا کا اور بجائے حیات جاودانی کے چند سال

چند ساعت بلکہ چند لمحوں کی زندگی کا طلبگار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر رشتۂ مذہب اسی طرح کمزور ہوتے ہوتے ٹوٹ جائے تو قوم یا تو جسمانی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے فنا ہو جاتی ہے یا جسماً اگر باقی بھی رہی تو روحانی فضائل سے عاری بہائم کی سی زندگی بسر کرتی ہے اور اسکی روحانی اور ذہنی جد و جہد کے پائدار کارنامے جو اسکی تمدن کے آثار باقیہ کہلاتے ہیں کسی تازہ دم قوم کے قبضہ میں آجاتے ہیں اور انپر وہ ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھتی ہے۔

لیکن تاریخ عالم میں اسکی مثالیں بھی موجود ہیں کہ کسی قوم کی وجہ حیات یعنی رشتۂ مذہب کمزور ہو کر پھر مضبوط ہو جائے اور قوم تنزل کی طرف جھکنے کے بعد پھر ترقی کرنے لگے۔ یہ واقعہ اکثر اس طرح رونما ہوا ہے کہ فنا کیطرف جانے والی قوم کسی زندہ قوم سے ٹکرائی اس ٹکر سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اسکی دبی ہوئی قوتیں ابھر آئیں اور وہ اپنا رخ بدل کر پھر زندگی کے رستہ پر چلنے لگی۔

یہی صورت ہے جو مسلمانان عالم کو عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں کو خصوصاً پچھلی چند صدیوں کے اندر پیش آئی ہے۔ دنیا میں ہر جگہ مسلمان انحطاط میں مبتلا تھے اور زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن انکی خوش قسمتی سے انکا تصادم یورپ کے تمدن سے جو آج کل نہضت و ترقی کا علم بردار ہے ہوا جس کے اثر سے وہ خواب غفلت سے چونک اٹھے ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کرنیکے لئے دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اتبک تنزل کی دوڑ میں سب سے آگے ہندوستان کے مسلمان تھے۔ کیونکہ اگرچہ اور ملکوں کے مسلمان بھی دولت و حکومت کھو چکے تھے لیکن پھر بھی انمیں برائے نام آزادی باقی تھی جس کے سبب سے انکی خودداری ایک حد تک قائم رہی بہ خلاف اس کے ہندوستان کے مسلمان اس منزل سے بھی گذر گئے تھے اور نہ صرف علانیہ جسمانی اور ذہنی

غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے بلکہ اس پر فخر بھی کرنے لگے تھے۔ چنانچہ سب سے بڑی علامت اس کی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے تمدن کے ہر شعبے کو ترک کر کے مغربی تمدن اختیار کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور یہ نکتہ فراموش کر دیا تھا کہ جو قوم ایک خاص تمدن میں پڑ چکی ہے وہ اس سے الگ ہو کر کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن اسی یورپ کے زبردست ہاتھ نے جس نے اور ملکوں کے مسلمانوں کو سوتے سے جگایا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی جھنجھوڑ کر غفلت کی نیند سے بیدار کر دیا۔

اصول تاریخ کے مطابق ہندی مسلمانوں کی دوسری زندگی بھی اس طرح شروع ہوئی ہے کہ ان میں مذہبی اور اخلاقی احساس پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔ سرچشمۂ حقیقت وحیات سے ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ قائم ہونے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں زندگی کی آرزو پیدا ہو گئی ہے اور وہ اپنے بازوؤں میں زندگی کی قوت محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن یہ حیات قومی کا محض پہلا قدم ہے۔ جو مذہبی بیداری ہماری قوم میں پیدا ہوئی ہے وہ وجہ حیات ہو لیکن حیات نہیں اس سے ترقی کا ولولہ اور ترقی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے لیکن ترقی کا راستہ نہیں ملتا اب ضرورت اسکی ہے کہ اس بنیاد پر اس عمارت کی تعمیر شروع ہو جسے اصطلاح علمی میں تمدن اور ہم مسلمان وسیع معنوں میں مذہب کہتے ہیں جو ہمارے نزدیک زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہے۔ جیسے علم و تعلیم اقتصاد و معیشت حکومت و سیاست کے بوقلموں قصر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوتے ہیں اور دنیا کے ویرانے میں آبادی کی شان پیدا کرتے ہیں۔

اس عمارت کی پہلی منزل علم و تعلیم ہونا چاہیئے کیونکہ علم ایک طرف تو تمدن کے اور شعبوں کی نشو و نما اور بقا کا ضامن ہے اور دوسری طرف خود تمدنی زندگی کا ایک اہم جزو ہے اور تعلیم ایک طرف تو قوم کی صدیوں کی ذہنی اور روحانی کمائی کو آیندہ نسل کی طرف منتقل کر کے تباہی

سے بچاتی ہے اور دوسری طرف اس نسل میں یہ قابلیت پیدا کرتی ہے کہ بزرگوں سے پائے ہوئے تمدنی خزانہ میں خود اپنی جد وجہد سے اضافہ کرے۔ ابتدا اس سے ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کے علمی کارنامے کرم خوردہ کتابوں سے نکال کر مسلمان طالبعلموں کے سینوں میں محفوظ کردیے جائیں ملی حیثیت سے مسلمان دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتے جبتک وہ پہلے اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے علمی ذخیروں پر قابض نہ ہوجائیں۔

لیکن اس قول کے کہ مسلمانوں کو اپنی تعلیم کی ابتدا اپنے اسلاف کے ترکے سے کرنا چاہئے ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہ اس سے آگے قدم نہ بڑھائیں۔ یوں تو زندگی کے کسی شعبے میں بھی کوئی قوم دوسری اقوام سے بے تعلق نہیں برت سکتی لیکن علم وتعلیم میں خاص طور پر اس طرح قلعہ بند ہوکر رہنا ناممکن ہے کیونکہ تحقیق حق کسی قوم ومذہب کی پابند نہیں ہے اور اسمیں ہر قوم کو ہر دوسری قوم کے کارناموں سے فائدہ اٹھانا چاہئے ورنہ اسکی تعلیم یکطرفہ اور ناکمل رہیگی اور وہ متمدن اقوام کی صف میں جگہ پانیکی مستحق نہ ہوگی اور یوروپ کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کرنے سے تو مسلمانوں کو بلکہ ایشیا کی کسی قوم کو چارہ ہی نہیں ہے کیونکہ یہ بات آفتاب سے زیادہ روشن ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں جب کہ ایشیا خواب غفلت میں مدہوش تھا یوروپ نے علم وحکمت کی پرداخت کرکے انہیں کہیں سے کہیں پہنچادیا ہے اور اگر کوئی قوم اس تحقیقات علمی سے فائدہ نہیں اٹھائیگی تو گویا وہ صدیوں پرانی علمی جنتری کی ورق گردانی کرتی رہیگی اور کسی طرح جدید معیار فضیلت تک نہیں پہنچ پائیگی۔ لیکن جیسا کہ کہا جاچکا ہے ہمیں یوروپ سے اسی وقت کچھ سیکھنا چاہئے اور اسی وقت ہم کچھ سیکھ بھی سکتے ہیں جب ہم اپنے روایات اور تمدن کے سایے میں اپنے قوائے دماغی کی تربیت کرچکے ہوں۔

اسی طرح ہندی مسلمانوں کو اپنے برادران وطن سے جنکا تمدن دنیا کے قدیم ترین اور

اور بہترین تمدنوں سے سے بہت کچھ اخذ کرنا چاہئے۔ ہندوؤں کی تاریخ اور انکے تمدن سے واقفیت حاصل کرنا بھی اس لیے لازم ہے کہ ہماری اور انکی قسمت صدیوں سے ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور ہمیشہ رہیگی ہمیں انکے دوش بدوش زندگی کے مراحل طے کرنا ہیں اور انکے ساتھ مل کر ہندوستان کی متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالنا ہے۔ مختصر یہ کہ عقائد دینی کو چھوڑ کر ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں کیساتھ اپنی ترقی اور بہبود کا راستہ تلاش کرنا ہے ایک زمین پر اور ایک آب و ہوا میں رہ کر اقتصادی و حیثیت حکومت و سیاست کے معاملے میں دونوں مذہبوں کے پیرو ایک دوسرے سے مختلف راستے پر نہیں چل سکتے۔

الغرض ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے قومی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان تعلیم کا کونسا نصب العین اور اس تک پہنچنے کے لئے کیا وسائل اختیار کریں کہ وہ اپنی نئی نسل کو تمام قوموں کی تمدنی کمائی کی مدد سے لیکن اسلامی روایات کے سایہ میں پرورش دے کر مادر ہند کا سپوت فرزند ہندوستانی قومیت کا جانباز سپاہی اور دنیا کے تمدن کا مفید رکن بنا سکیں۔

ان اغراض کو پیش نظر رکھتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔

عہد جدید میں جامعہ یا دار العلوم کے مقاصد کا وسیع ترین مفہوم یہ ہے کہ وہ قوم کی تعلیمی اور علمی زندگی کا مرکز ہو۔ اس کے فرائض حسب ذیل سمجھے جاتے ہیں۔

(۱) تعلیم و امتحان۔

(۲) تحقیقات علمی۔

(۳) اشاعت علوم۔

(۴) قوم کے نوجوانوں کو کسب معاش کے لئے تیار کرنا۔

ہم اس مضمون میں اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ یہ چاروں کام کس طرح باحسن وجوہ انجام دے سکتی ہے تاکہ وہ مسلمان بچوں کو تربیت ذہنی کے اعلیٰ مراتب تک پہنچائے اور اُس نشاۃ ثانیہ کی بنیاد کو استوار کرے جو ملت میں رونما ہورہی ہے۔

انمیں سے پہلی چیز یعنی تعلیم کے مفید مفہوم کو معین کرنیکے لئے ہمیں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ تعلیم ایک طرح کا سفر ہے جسمیں چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱) راہرو۔ (۲) راہبر۔ (۳) منزلِ مقصود۔ (۴) راہ۔ راہرو ظاہر ہے کہ کسی جماعت کی نئی نسل یعنی بچے ہوتے ہیں۔ راہبر جماعت کے وہ افراد ہوتے ہیں جو عمر اور ذہن کے لحاظ سے بالغ ہوں۔ منزلِ مقصود مراد ہے جماعت کے تعلیمی نصب العین سے جو اس کے تمدنی نصب العین کے تابع ہوتا ہے۔ راہ عبارت ہے اُس طریقہ تعلیم سے جو مذکورہ بالا نصب العین کو حقیقت کا جامہ پہنانے میں مدد دے۔

یہاں ہم صرف تعلیم کے منزلِ مقصود یعنی تعلیمی نصب العین سے بحث کرنا چاہتے ہیں جسے ہم نے تمدنی نصب العین کے تابع قرار دیا ہے۔ دنیا میں مختلف جماعتوں کے نصب العین اُنکی سیرت اور اُنکے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اُنکا تمدنی نصب العین اُنکے مذہب کے سایہ میں تمام یکطرفیوں سے بری جامع اور مکمل ہے۔ لہذا اُنکا تعلیمی نصب العین بھی یکطرفہ نہیں بلکہ ذہنی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہونا چاہئے یہاں ہم اس نصب العین کی تفصیل مناسب نہیں سمجھتے مگر اسکی طرف اشارہ ضرور کرنا چاہتے ہیں مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین کا تعین کم و بیش ان الفاظ میں ہوسکتا ہے "بچوں کے تمام قوائے ذہنی اور جسمانی کو اُبھار کر اُنہیں صحیح ترتیب اور توازن پیدا کرنا یعنی انہیں انسان بنانا"۔ اسی مطلب کو دوسرے پہلو سے یوں ادا کیا جاسکتا ہے "بچوں

کو اسلامی تمدن کے تمام شعبوں کا محرم انکے باہمی ربط اور علاقہ سے واقف، اور صحیح اسلامی دستور العمل پر عامل بنا کر انہیں مسلمان بنانا" پہلی اور دوسری عبارت کے مفہوم میں بظاہر بہت فرق معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ بچے کے قوائے ذہنی کی نشو و نما کا ذکر ہے دوسری جگہ تمدن کے مختلف شعبوں کے محرم ہونے کا۔ لیکن اگر یہ ملحوظ رہے کہ تمدن کے مختلف شعبے خود افراد کے قوائے ذہنی کے مظہر ہوتے ہیں تو صاف ہو جائیگا کہ بچوں کی شخصیت کو مکمل کرنا اور انہیں تمدن سے اپنا رابطہ استوار کرنے میں مدد دینا ایک ہی بات کے دو پہلو ہیں پہلا شخصی پہلو ہے۔ دوسرا تمدنی۔ مگر چونکہ تمدن کی حامل ہمیشہ کوئی جماعت ہوتی ہے چنانچہ ہمارے تمدن کی حامل ملت اسلامی ہے۔ اس لئے ہم بجائے تمدنی پہلو کے ملی پہلو بھی کہہ سکتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ ہندوستان میں صرف ملت اسلامی آباد نہیں بلکہ دوسری جماعتیں بھی ہیں۔ جن کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو زندگی بسر کرنا ہے۔ اور کم سے کم سیاسی اور اقتصادی مقاصد میں انکا اور مسلمانوں کا اشتراک عمل ضروری ہے۔ اسلئے ہمارے تعلیمی نصب العین میں یہ بھی داخل ہونا چاہئے کہ بچوں میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کا احساس کر کے انہیں ہندوستانی بنایا جائے۔

مسلمانوں کو اپنی تعلیم میں یہ تینوں پہلو شخصی، ملی، قومی مدنظر رکھنا چاہئے اور اپنے طلبہ کو انسان کامل، سچا مسلمان اور پکا ہندوستانی بنانیکی کوشش کرنا چاہئے۔

ان مقاصد کے ذکر کے بعد ہم چند الفاظ میں انکے حاصل کرنے کا طریقہ بتانا چاہتے ہیں۔ تعلیم کی چار منزلیں ہوتی ہیں۔ بنیادی، ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ۔ انمیں سے اعلیٰ تعلیم طالب علم کو اسوقت ملتی ہے جب اسکی سیرت بن چکی ہوا ور پختہ ہو چکی ہو۔ اس لئے یہ تعلیم محض علمی قدر رکھتی ہے اور طلبہ پر اخلاقی اثر کم ڈال سکتی ہے۔ تعلیم میں تربیت اور تہذیب نفس کی جو قوتیں

ہیں انکے ظاہر ہونے کا خاص وقت بنیادی، ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا زمانہ ہی جو طلبہ اسکول میں گذارتے ہیں اور صرف اسکول ہی کی تعلیم میں ہمارے مندرجہ بالا مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہم پہلے اس تعلیم کا ذکر کرینگے اسکے بعد اعلیٰ تعلیم سے بحث کریں گے۔

ہمارا پہلا مقصد بچے کی شخصیت کے مختلف عناصر کا اُبھارنا اور انہیں مناسب توازن پیدا کرنا ہے۔ نظری حیثیت سے اس مقصد کے حاصل کرنیکا بہترین ذریعہ ادب اور زبان کی صحیح تعلیم ہے۔ اور عملی حیثیت سے یہ کہ بچے کی روزمرہ زندگی میں وہی تنوع یک آہنگی کے ساتھ ساتھ پیدا کیا جائے جو جماعت کی تمدنی زندگی میں ہوتا ہے یا ہونا چاہئیے۔ پہلا ذریعہ اسکول کی جماعتوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا دارالاقامہ میں یا گھروں پر۔ پہلے ذریعہ کے کارآمد ہونیکے لئے یہ شرط ہے کہ ادبی نصاب اس طرح کا ہو جسمیں تمدنی زندگی کے ہر شعبے مذہب۔ معاشرت۔ علم۔ اقتصاد۔ سیاست اور فنون لطیفہ وغیرہ کے ابتدائی مسائل چھیڑے جائیں اور سہل اور عام فہم عبارت میں ان سے بحث ہو سب سے اچھی صورت تو یہ ہوتی کہ ان مسائل کا کوئی مسلمہ نظریہ بچوں کو نہ بتایا جاتا بلکہ خود اُن کو موقعہ دیا جاتا کہ غور وفکر کے بعد ساری مشکلات کو حل کریں۔ لیکن بچوں کی نفسی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مستقل غور وفکر کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ اتنا صبر کہ کسی مسئلہ کے متعلق فیصلہ کرنیکے لئے وہ اس صلاحیت کے پیدا ہونے کا انتظار کریں۔ اس لئے اُستاد مجبور ہے کہ انہیں ان تمام مسائل زندگی کے حل بتائے جنہیں وہ بہترین سمجھتا ہے۔ پھر بھی یہ کوشش ضرور کرنا چاہیئے کہ بچے ان فیصلوں کو قطعی نہ سمجھ لیں اور آیندہ چلکر انپر دوبارہ غور کر سکیں

دوسرا یعنی عملی طریقہ بچوں کی شخصیت کے نشو ونما میں مدد دینے کا بہت طویل بحث

چاہتا ہے جسکا یہاں موقع نہیں۔ البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ اس بارے میں عموماً ہمارے یہاں اقامت گاہوں میں اور گھروں میں بڑی غفلت برتی جاتی ہے۔ عام طور پر صرف بچوں کے مذہبی اور علمی رجحانات اُبھارنے میں بڑی بھلی مدد دیجاتی ہے لیکن دوسرے ذہنی قوےٰ کو یا تو دبانے کی کوشش کیجاتی ہے یا انہیں انکے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں مضر ہیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ والدین یا اتالیق اپنی نگرانی میں انہیں سادہ اور سہل معاشرتی و اقتصادی کاموں کی طرف متوجہ کریں بے ضرر سیاسی اعمال کیطرف رغبت دلائیں اور انہیں کمال احتیاط کیساتھ نفاست طبع اور ذوق جمال پیدا کریں تاکہ جملہ قوائے ذہنی جو انہیں قدرت نے عطا کئے ہیں تربیت پاسکیں۔

مسلمانوں کی تعلیم کا دوسرا مقصد ہم نے بچوں کو تمدن اسلامی کا محرم بنانا قرار دیا تھا یہ اصل میں پہلے عام مقصد کی ایک خاص صورت ہے۔ انسان یا شخصیت کا نصب العین نظری حیثیت سے بہت اہم ہے لیکن عمل میں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرد بشر قوم وملت کی قید سے آزاد ہوکر انسان مطلق نہیں بن سکتا اور نہ یہ ضروری ہے۔ ہر شخص انسانیت کے "عکس رخ" کو صرف اپنی ملت کے تمدن کے "پیالے" میں دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمان بچوں کی صحیح تعلیم صرف اسلامی روایات کے سایہ میں ہوسکتی ہے۔ ان بچوں کو تمدن اسلامی سے کماحقہٗ واقف کرنیکے لئے ایک خاص مضمون اسلامیات کے نام سے ہونا چاہئے جسمیں بہ قدر ضرورت عربی زبان، تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور خصوصیت کے ساتھ بزرگان دین کی سیرت پڑھائی جائے۔ اسکے علاوہ تاریخ کے مضمون میں علاوہ ہندوستانی تاریخ کے تاریخ اسلام کا درس بھی ہونا چاہئے۔ ان سب چیزوں کی تعلیم کا یہ انداز ہونا چاہئے کہ اسلامی تمدن کے اصول اور اسکے نشو ونما کا سرسری خاکہ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد طالب علم کے ذہن نشین

ہو جائے۔ اب رہا عملی پہلو اسکی صورت یہ ہونا چاہئے کہ والدین یا منتظمین دار الاقامہ بچوں کو شعائر اسلام کی پابندی کی تاکید کریں اور حتی الامکان بلا جبر و اکراہ افہام تفہیم اور اسوۂ حسنہ کے اثر سے انکی روزمرہ زندگی کو ملی خصائص کا مجموعہ بنانیکی کوشش کریں۔

اس دوسرے مقصد اور ہمارے تیسرے مقصد میں بظاہر تباین معلوم ہوتا ہے عام لوگوں کے خیال میں ملت کا دلدادہ ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھ سکتا لیکن ذرا سے غور سے معلوم ہو جائے گا کہ کسی ملت میں اتحاد کا رشتہ زیادہ تر مذہبی اور کسی حد تک معاشرتی رشتہ ہے اقتصاد و سیاست وغیرہ کے معاملہ میں اشتراک عمل کیلئے مذہب و ملت کی قید بے معنی ہے اور اور اس کا لگانا عملاً ناممکن ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے بچوں کو بڑا ہو کر ہندوستان میں دوسری ملت کے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے ان سے مل کر ملک کو غیر قوم کی حکومت سے آزاد کرنا ہے۔ اور انکے پہلو بہ پہلو سارے سیاسی اور اقتصادی مسائل طے کرنا ہیں اسلئے ضرورت ہے کہ ان بچوں کو اس رشتہ کی اہمیت بھی بتائی جائے جو انہیں سارے ہموطنوں سے وابستہ کرتا ہے۔ اس غرض کیلئے مدرسے کی تعلیم میں تاریخ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ تاریخ بادشاہوں اور حکام کے عزل و نصب اور جنگ و جدل کے افسانہ کا نہیں بلکہ قومیت کے نشو و نما کی روداد کا نام ہو تو اسکی تعلیم ہمارے تیسرے مقصد یعنی بچوں میں احساس قومیت اور حب وطن پیدا کرنے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔ عملی حیثیت سے یہ احساس لڑکوں میں اسطرح پیدا کیا جا سکتا ہے کہ انہیں اپنے ملک کے خوشنما مناظر، سربفلک شاندار عمارتیں، فنون لطیفہ کے مایۂ ناز کارنامے، صنعت اور دستکاری کے بیش بہا نمونے دیکھنے کا موقع دیا جائے سچے رہنمایان قوم کے حالات زندگی سے آگاہ کیا جائے اور قومی جشنوں کے منانے (خدا کیلئے اسکے معنی قومی سیاسی جلسوں کی شرکت نہ سمجھے جائیں) کا موقعہ دیا جائے۔

(باقی آئندہ)

دجلهٔ بغداد

(شاعر)

اے دجلهٔ طوفانی! یکسر بکجا رانی　　با جوشن داودی، یا فرج سلیمانی
گه شیحه بگردانی، گه سلسلهٔ عنبانی　　افرشتهٔ یزدانی؟ اهریمن زندانی؟
از بهرِ چه می غرّی؟ از بهرِ چه گریانی

اے دختر کہساران! تو پیک سما ہستی　　پاکیزه روا ہستی، پاکیزه ادا ہستی
آئینه نما ہستی، آتش تر پا ہستی　　هم هوش فزا ہستی، هم هوش ربا ہستی
گه جلوهٔ عریانی، گه جلوهٔ پنهانی

در روز فرود آید، خورشید به امانت　　هم خواب همی گردد، شب گنبد گردانت
قندیل مه انور، بوسد رخ رخشانت　　می لرزد و میگوید، جانم همه قربانت
اے چهرهٔ نورانی! اے فرهٔ یزدانی

نوروز دگر سر زد، هنگام بهار آمد　　گردون به سحاب آمد، گیتی به نگار آمد
فصل مے و جام آمد، فصل گل و یار آمد　　بنگر که کنار تو، چون عاشق زار آمد
بس لالهٔ نعمانی! بس یوسف کنعانی

بینم که سرِ موجت، چون کوه بگردون شد　　هنگامهٔ تاتاری، از قعرِ تو بیرون شد؟
یا تازه درون دل، یاد سخن هارون شد　　بگوئی بچه چین شد؟ چون شد که دلت خون شد؟
خون است که میریزی، خون است که افشانی

۱؎ از ماه مارچ تا جون، موسم سیلاب است۔ در ظرف این مدت دجله خیلے طوفانی میشود و آبش همچو خون سرخ مینماید۔

اے دجلۂ طوفانی! یکسر بکجا رانی | با جوشن داؤدی، یا فوجِ سلیمانی؟
گر سُبحہ بگردانی، گہ سلسلہ جنبانی | افرشتۂ یزدانی؟ اہرمن زندانی؟
از بہر چہ مے غری؟ از بہر چہ گریانی؟

(دجلہ)

از من چہ ہمی پرسی، از درد دل خونین | با من چہ ہمیگوئی؟ از زادِ دیٔ فردین
شد موجِ رواں من، آرام گہ برزین | تو در خوت بنگر، با دیدۂ عبرت بیں
تا در ورقِ ایام، ایں راز ہمی خوانی

در انجمن دوراں، بس دور زماں دیدم | بس فصلِ بہار آمد، بس فصل خزاں دیدم
ہم فقرِ کہاں دیدم، ہم فرِ جہاں دیدم | ہر ذرہ عالم را، چوں ریگ رواں دیدم
گہ زندہ شود گیتی، گہ باز شود فانی

بس عہد کہن گشتہ، در قعرِ الم پنہاں | شد سینہ سوزانم، آبستنِ جاویداں
آرے بکنارِ من، آمد چو فلک پویاں | گہ از صفتِ گریاں، گہ از صفتِ خنداں
کلدانی و ایرانی، یونانی و تورانی

قومے ز عرب آمد، با گوہرِ مخاری | خوابیدہ جہانے را، آورد بہ بیداری
بُرید بہ شمشیرش، زنجیر ستمگاری | وز دستِ جہانداراں، بربود جہانداری
تا باز بیاموزد، آئینِ جہانبانی

ساقیٔ حجاز آمد! با بادۂ اسلامی | ہر کس کہ چشید آں مے، بگذاشت مے آشامی
از نشّۂ آں بادہ، بیروں شد از خامی | ہم ہندی و ہم مصری، ہم رومی و ہم شامی
کشمیری و افغانی، چینی و خراسانی

بغدا دپدید آورد، آئینِ پیمبر را | برخواند بہ سرملت، مراللہ اکبر را
بنشاند بہ یک محفل، دہقان و سکندر را | بنمود رہِ وحدت، مرمسلم و کافر را

با شمعِ مسلمانی، با بانگِ حدی خوانی

در دورِ مسلمانی، بس بزمِ شہاں دیدم | بس صاحبِ تیغ آمد، بس شعلہ زباں دیدم
بس کشتیٔ زریں را، بر سینہ رواں دیدم | ایں وادیٔ صحرا را، گلزارِ جہاں دیدم

شد لالۂ صحرائی، شد سوسنِ بستانی!!

آں بزمِ جہانگیراں، با گردشِ گردوں شد! | آں فرِ کلہ داراں، افسانہ، افسوں شد!
از غصۂ ولم خوں شد، پرسی کہ چنیں چوں شد؟ | بغداد دگرگوں شد، آں باغ دگرگوں شد!!

نے ماند جہانبانی، نے ماند مسلمانی!!

توحید مسلماں را، با نقشِ صنم بینم | آئینِ خدائی را، مقہورِ ستم بینم
نے سطوتِ دیں بینم، نے تیغ و علم بینم | یک گلۂ مردم را، در فکرِ درم بینم

شد فرۂ اسلامی، شد جوہرِ انسانی!

از خطۂ مغرب شد، طوفان اروپائی | تاریک شد از ابرے، ایں گنبدِ مینائی
از برقِ جہاں سوزش، خیرہ شدہ بینائی | آتش ہمہ مے بارد، بر پستی و بالائی

مشرق شدہ از دوشش، یک منزلِ زندانی

ایں فتنۂ افرنگی، با دورِ زماں گردد | گہ شعلہ فشاں گردد، گہ ریگِ رواں گردد
در دشت نہاں ماند، در شہر عیاں گردد | با توپ و تفنگ آید، با تیغ و سناں گردد

از بہرِ جہاں سوزی، از بہرِ ستم رانی

اہرمنِ استعمار، از راہِ نیاز آید | گہ جادۂ چیں گیرد، گہ رو بہ حجاز آید

کنجشک صفت لیکن، با پنجۂ باز آید — بنگر بچہ زنگ و فن، این شعبدہ باز آید
با اسلحۂ دیواں، با لشکر شیطانی

این دیو سیہ باطن، اندام سحر دارد — در دست گہر دارد، در سینہ شرر دارد
یک دفتر آزادی، ہموارہ ببر دارد! — در شرق فرود آید، پیوستہ نظر دارد
بر کشور جمشیدی، بر ملک سلیمانی

شرق است ہماں خاکے کز نور فروزاں شد — زحسن چو گلشن شد، در فیض چو باراں شد
این وادیٔ ظلمت را، چوں مہر درخشاں شد — افسوس بہم برخورد، آوخ ہمہ ویراں شد
آں گلشن یزدانی، آں محفل روحانی!!

قلب ملل مشرق، چوں قلب کبوتر شد — ایں مرغک ترسیدہ بے پنجہ و بے پر شد
عقلم بہ شگفت آمد، جانم ہمہ آذر شد — چو دولت دارائی، در دست سکندر شد
با خنجرِ ہندی، با گرز ساسانی؟!

نیرنگ ہمی سازد، دائم فلک گرداں — ہموارہ در آویزد، اہرمن با یزداں
ناموس حیات آمد، ایں کشمکش دوراں — باید کہ یکے گردد، در سایہ یک پیماں
افغانی و ایرانی، تورانی و تاتاری

ہرگز نتواں انداخت، ایں جمع پراگندہ را — وحدت نشود پیدا تا ملت بیضا را
اسلام کند منسوخ، آئین کلیسا را — آنگاہ ہمی بینی، یک گلکدہ دنیا را
ابلیس چو بگریزد، از محفل سبحانی

در آئینہ گردوں، بس فتنہ نہاں بینم — بس ملت عالم را، با تیغ و نشاں بینم
شیطان فرنگستاں بے روح و رواں بینم — گلزار ہمیں را، چوں باغ جناں بینم

بشگفت بصحرا ور، بس لالۂ نعمانی

گرمی بحیات اندر، از شعلۂ خوں باشد   ہنگامۂ ایں محفل، از جوشِ جنوں باشد

دردِ دلِ بیمارے، از غصہ فزوں باشد   ہر ذرۂ گیتی را، مرگے ز سکوں باشد

رفتم کہ ہمی جوشد، خوں در دلِ طوفانی

(محمد اکبر منیر)

مطبوعات جدیدہ

تاریخ نجد آج سے تقریباً دو صدی پیشتر نجد میں جو دینی و اصلاحی تحریک شروع ہوئی تھی وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے اسقدر عظیم الشان تحریک تھی کہ عالم اسلامی کو اسمیں نہایت عمیق دلچسپی لینی چاہئے تھی لیکن چونکہ اسطرف صدیوں سے مسلمانان عالم علمی و ملی جمود و تنزل میں انتہا کو پہنچ چکے تھے اور اپنے عظیم الشان سلف کے صفات عالیہ بلکہ انکی وراثت کے متاع گرانمایہ کو بھی ہاتھوں سے کھو رہے تھے۔ اسلئے وہ اس سے خبر بھی نہ ہوسے۔ اور اگر ہوئے بھی تو صرف اسقدر کہ وہ کفر و ارتداد کی ایک شورش ہے۔

خود ہندوستان جہاں مشرقی علوم کے حامئین کے پاس انکے زعم کے مطابق حقیقی دین اور اصلی علوم اسلامیہ تھی اور مدتہائے دراز سے وہابی و بدعتی اور مقلد و غیر مقلد و آمین و رفع یدین وغیرہ کے تنازعات چلے آتے تھے۔ کمتر لوگ تھے جو اس تحریک کے مغز سے آشنا تھے۔ اسطرف کچھ دنوں سے اہل یورپ کی بدولت جب نجدیوں کے متعلق تحریریں شائع ہوئیں تو یہاں کے جدید تعلیمیافتہ طبقہ میں اس تحریک کی کچھ اہمیت محسوس ہوئی۔ لیکن ابتک علماء ہند اور عوام الناس میں پھر بھی وہی بیخبری رہی۔ جب اہل نجد نے حجاز اور حرمین کو بھی لے لیا تو یہاں کے لوگوں نے انکی طرف توجہ سے دیکھا لیکن صرف اسیقدر کہ وہ غدار شریف اور اسکی اولاد سے سیاسی اور فوجی قوت کے لحاظ سے بہتر ہیں۔

لیکن اصلیت یہ ہے کہ نجدی تحریک نہ سیاسی ہے نہ فوجی ہے نہ انقلابی ہے بلکہ گیارہویں صدی کے وسط میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے جو اس عہد کے ایک مخلص اور با اثر عالم تھے اہل نجد کی حالت کو نظر تامل سے دیکھکر یہ سمجھ لیا کہ نہ صرف میرے اہل ملک بلکہ عام عرب اور بالعموم عالم اسلامی حقیقی دین سے دور ہو کر مفید رسموں اور بدعتوں کا پرستار رہگیا ہے اور مسلمانوں کے اس ہولناک زوال کا اصلی سبب یہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہایت قوت عزم اور اخلاص کیساتھ حقیقی دین یعنی قرآن و سنت کی تعلیم و اشاعت

شروع کی اُسی کا آج ہم یہ اثر دیکھ رہے ہیں کہ انکی جماعت کو اس سرزمین مقدس اور اسلام کے خاص مرکز یعنی حرمین شریفین پر اللہ تعالیٰ نے تسلط بخشا اور آج سارا عرب اس جھنڈے کے نیچے آگیا اور تمام اقوام و ممالک مسلمہ کے وہاں وفود پر وفود چلے جا رہے ہیں۔

مولانا اسلم جیراجپوری اُستاد تاریخ جامعہ ملیہ نے اس تحریک کے ابتدا سے لیکر آجتک کے مکمل حالات اختصار کیساتھ لکھکر مندرجہ بالاعنوان سے شائع کروئے اس کتاب کا ماخذ بیشتر خود علمار نجد کی تصانیف ہیں اور علامہ آلوسی زادہ تنکری بغدادی کی تاریخ جس کی وجہ سے اس کتاب کا پایہ اعتبار بہا بلند ہے پہلے نجد کا جغرافیہ اس کے اضلاع اور انکی آبادیوں کی تفصیل ہے۔ پھر اہل نجد کے تمدنی اخلاقی معاشرتی۔ دینی اور علمی زندگی وغیرہ کی کیفیت ہے۔ اس کے بعد شیخ محمد بن عبدالوہاب کے زندگی کے حالات اور انکے علمی و عملی کارناموں کا بیان ہے۔ پھر انکی تعلیمات اور دعوت و تحریک کی بابت پر مفصل بحث ہے۔ اسی ضمن میں جماعت اہل حدیث کا بھی ذکر ہے۔ اسکے بعد امرا آل سعود کے محاربات و فتوحات کی تاریخ ہے الغرض یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن کوئی بات ایسی نہیں چھوڑی گئی ہے جو ضروری ہو۔

یہ کتاب نجد اور نجدی تحریک کے متعلق اُردو زبان میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ آج تک کسی نے اُردو میں یہ تاریخ نہیں لکھی تھی۔ نواب صدیق حسن خاں نے ترجمان وہابیہ کے نام سے بے شک ایک رسالہ شائع کیا تھا لیکن اسکا مقصد نجدی تحریک کی تاریخ نہ تھا بلکہ وہ اس معذرت میں انہوں نے لکھا تھا کہ حکام انکو وہابی نہ سمجھیں۔ پھر انہوں نے جو کچھ لکھا وہ نہایت غیرمعتبر عیسائیوں کی تاریخوں سے نقل کیا اور بے ترتیب و بے معنی لکھا۔ لیکن یہ کتاب نجدی تحریک کی صحیح معتبر سلیس اور مختصر تاریخ ہے۔ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

فلاکت اور ارباب کمال

زمانۂ گذشتہ میں تمام دنیا میں بلکہ ایشیائی اور خاصکر اسلامی ممالک میں ابتک بالعموم اہل کمال کا تمغۂ امتیاز فلاکت ہی۔ اکثر بڑے بڑے علما، شعرا اور ائمہ جو اپنے زمانوں میں نہ صرف لیاقت اور قابلیت میں سربرآوردہ بلکہ شہرت اور مقبولیت میں بھی بلند پایہ تھے دنیاوی زندگی کے لحاظ سے نہایت مفلوک الحال اور مصیبت زدہ تھے۔ وجہ اسکی ظاہر ہے کہ انکو اپنے کمالات کے مقابلہ میں دنیا کی طرف توجہ اور اسکی تحصیل کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اور دنیا دار چونکہ کمال کے عام طور پر قدر دان نہیں ہوتے اسلئے وہ بیچارے محرومی اور ناکامیابی کی زندگی گذارتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیائی شعرا نے یہانتک کہدیا کہ فلک پیر کمال اور ارباب کمال کا دشمن ہے۔ جو شخص دنیاوی فارغ البالی اور جور فلک سے محفوظ رہنا چاہے اسکو تحصیل کمال کیطرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔ چنانچہ عرفی کہتا ہے ؎

ازمن بگیر عبرت و کسب ہنر مکن | با بخت خود عداوت ہفت آسماں مخواہ

یہ خیال عرفی ہی کا نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے لوگوں کا بھی ہے۔ چنانچہ تقریباً آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں علامہ شہاب الدین ابن دلجی نے ایک کتاب "الفلاکۃ والمفلوکون" لکھی جسمیں ارباب کمال کی فلاکت زدگی کے اسباب اور اس کے وجوہات پر نہایت مبسوط او دلچسپ اور لطیفانہ بحثیں کیں نیز تاریخ اسلام سے مفلوکین اور منکوبین اہل کمال کی ایک فہرست بھی نکالکر درج کی۔

یہ کتاب ۱۳۲۲ھ میں مصر میں شائع ہوئی۔ سال گذشتہ جب حکیم مسیح الملک صاحب مصر تشریف لیگئے تو ایک دوست نے انکو ہدیتاً عنایت کی حکیم صاحب موصوف نے اس کو بہت پسند کیا اور واپسی کے بعد لاکر اہل جامعہ کے حوالہ کر دیا۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس میں سے

التقاط کرکے ناظرین جامعہ کو بھی اس مصیبت زدہ جماعت کے بعض منتخب حضرات کے حالات سنائیں۔

منکوبین کا ہم ذکر چھوڑتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو تھے تو خوش حال لیکن بعض وجوہ سے ان پر آفتیں پڑیں اور وہ مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ اس جماعت میں **امام مالک** بھی ہیں کہ انہوں نے بنی عباس کے عامل کے ہاتھوں ستر کوڑے کھائے **امام ابوحنیفہ** بھی ہیں کہ انکو منصور نے تنوا کوڑے پٹوائے اور قید کر دیا تا آنکہ اسی میں انکی وفات ہوئی۔ **امام احمد بن حنبل** بھی ہیں کہ انکو مامون اور معتصم نے بھاری زنجیروں میں ۲۸ مہینے تک قید رکھا اور خلق قرآن کے مسئلہ پر انکو کوڑوں سے پٹواتے رہے۔ پھر بنی عباس کے اکثر خلفاء و وزراء بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کا ذکر ہم کو مقصود نہیں ہے۔ ہم تو صرف ان لوگوں کا حال لکھنا چاہتے ہیں جو باوجود فضل و کمال و شہرت و مقبولیت کے دنیاوی عیش و آرام سے ناکام و محروم رہے اور زمانہ نے کوئی قدر انکی ذات کی نہ کی۔

قاضی عبدالوہاب بن علی بن نصر مالکی متوفے ۲۲۲ھ اپنے عہد میں بغداد کے مقبول ترین علماء میں سے تھے۔ لیکن افلاس کا یہ عالم تھا کہ آخر گذارہ ناممکن ہوگیا۔ اس لئے مصر کو روانہ ہوئے۔ جس روز چلے بغداد کے جملہ علماء و ادباء و روساء رخصت کرنیکے لئے آئے۔ فرمایا کہ میں اس شہر کی محبت دل میں بہت رکھتا ہوں لیکن کیا کروں اگر یہاں میرا صرف دو روٹی روزانہ کا سہارا ہوتا تب بھی کبھی نہ چھوڑتا۔

جب مصر پہنچے تو سارا قاہرہ استقبال کیلئے امنڈ آیا اور سلطان کی طرف سے نہایت اعزاز ہوا۔ مگر پہلا کھانا وہاں کھایا تھا کہ بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے۔ آخری وقت ایک ٹھنڈا سانس لیکر فرمایا۔ زندگی بھر کلفت اٹھائی جب عیش آیا تو زندگی گئی۔

نضر بن شمیل بصرہ کا ممتاز شاعر نحوی اور ادیب تھا۔ لیکن فلاکت زدہ مجبوراً خراسان کیطرف نکلا۔ رخصت کرنے کے لئے تین ہزار اعیاں و امراء و علما بصرہ نکلے نضر نے کہا کہ واللہ اگر اس شہر میں روزانہ ایک کلیجہ بھی سد رمق کیلئے مجھے مل سکتا تو میں یہاں سے سفر نہ کرتا۔

افسوس یہ ہے کہ اس تین ہزار میں سے ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں مدد کر سکتا ہوں۔ آخر قسمت نے اسکو مامون کے دربار میں پہنچایا وہاں اس نے خلیفہ کی ایک غلطی کی تصحیح کر دی جس پر اسکو پچاس ہزار درہم انعام میں مل گئے اور وزیر فضل بن سہل نے جب اسکی لیاقت دیکھی تو تیس ہزار خود بھی دیدئے لیکن مرد ہی میں ۲۰۴ھ انتقال کر گیا۔ گھر نہیں واپس آسکا۔

امام ابیوردی اپنے وقت میں فقہ کے مجتہد سمجھے جاتے تھے۔ لیکن فقر و فاقہ کا یہ عالم تھا کہ دو سال کا زمانہ انپر گذر گیا اور جاڑے میں کوئی جبہ نہیں بنا سکے۔ جب کوئی پوچھتا تو اپنے افلاس چھپانیکے لئے کہدیتے کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہیں بناتا۔

شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول ۵۸۷ھ فلسفہ حکمت اور ذہن و ذکا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ہیاکل تلویحات اور تفسیر میں رقم القدس انکی لاجواب تصنیفات ہیں لیکن غربت کی وجہ سے حجامت تک نہیں بنوا سکتے تھے اور جوئیں چہرے اور کپڑے پر رینگتی تھیں۔ حلب میں ملک ظاہر نے کچھ انکی قدر دانی کی تھی لیکن لوگوں نے سلطان صلاح الدین کو لکھا کہ اپنے بیٹے کی خبر لو ورنہ شہاب الدین اسے گمراہ کر ڈالیگا۔ اسلئے اس نے ملک ظاہر کو لکھا کہ انکو نکال دو پھر انکے قتل کا بھی حکم دیا۔

امام خلیل بن احمد فراہیدی ازدی فن نحو میں امام اور سیبویہ کے استاد ہیں۔ اور فن عروض کے موجد۔ زندگی بھر تعلیم۔ حج اور جہاد میں مشغول رہے ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔ ایکبار سلیمان بن حبیب بن مہلب والی فارس و اہواز نے انکو اپنے بیٹوں کی تعلیم کے لئے طلب

کیا۔ انہوں انکار کیا اور جواب لکھا کہ میں اپنے علم کو فروخت نہیں کرنا چاہتا۔

تقریباً آٹھ سال کا زمانہ گذرا کہ میں نے اس واقعہ کو "استغنائے علم" کے عنوان سے نظم کرکے شائع کیا تھا۔ یہاں بھی درج کرتا ہوں۔

علامہ خلیل بن احمد شہیر عام ۔۔۔ موجد تھے جو عروض کی اور نحو کے امام

بابائے علم و راہبر علم خضر علم ۔۔۔ جنکے عیال ہیں علمائے ادب تمام

دل خواہشات لذت دنیا سے پاک تھا ۔۔۔ رہتے تھے ذوق علم و عبادت میں وہ مدام

خوددار و باوقار و غیور و ظریف تھے ۔۔۔ مشکل سے گرچہ انکو میسر تھی نان شام

اہواز کے رئیس سلیمان نے ایک بار ۔۔۔ بھیجا کسی کے ہاتھ یہ انکی طرف پیام

تشریف لائیں آپ ہمارے دیار میں ۔۔۔ دیدار کے یہاں متمنی ہیں خاص و عام

خواہش ہے میرے بیٹوں کو تکمیل علم کی ۔۔۔ مد نظر ہے انکے لئے خاص اہتمام

ہم لوگ سب ہیں گوش برآواز دیکھئے ۔۔۔ کب خود وہ قدوم سے ہوتے ہیں شادکام

جب سن چکے امام یہ قاصد کی گفتگو ۔۔۔ بولے کہ مجھکو کچھ امرا سے نہیں ہے کام

پھر ایک نان خشک کا ٹکڑا اٹھا لیا ۔۔۔ اسکو دکھا کے کرنے لگے اس طرح کلام

جبتک یہ مجکو ملتا ہے آزادگی کے ساتھ ۔۔۔ میں کیوں کسی رئیس کا جاکر بنوں غلام

کیوں علم کو ذلیل کروں مال کے لئے ۔۔۔ یہ چند روزہ اور وہ ہے دولت دوام

اسلم جو ذوق علم کا ہے لذت آشنا
دنیا کو جانتا ہے وہ اک جیفۂ حرام

امام نحو ابو عثمان مازنی بصری علوم ادبیہ میں بے نظیر تھے اور زہد و ورع میں فرد لیکن باوجود اس کے کئی کئی دن فاقہ سے گذارنا پڑتا تھا۔ ایک ذمی نے ان سے کہا کہ سیبویہ کی الکتاب مجھے پڑھا دیجئے تو سو دینار پیش کروں۔ انہوں نے انکار کیا۔ مبرد نحوی نے ان سے کہا کہ افلاس میں یہ انکار ٹھیک نہیں۔ فرمایا کہ اس کتاب میں تقریباً تین سو آیتیں قرآن کریم کی ہیں۔ میری غیرت اسلامی گوارا نہیں کرتی کہ دنیا کی لالچ میں یہ موتی ایک سور کے گلے میں ڈالوں۔

اسکا انعام اللہ تعالیٰ کیطرف سے یہ ملا کہ خلیفہ کے دربار میں ایک نحوی بحث چھڑی جسکو انہوں نے نہایت محققانہ طریقہ سے فیصل کیا۔ اس نے ایکہزار دینار انعام دیا۔

امام سیبویہ ابو بشر عمرو بن عثمان بن قنبر بصری جس کی الکتاب عربی نحو کا منادی اور مرجع ہے مفلسی کی وجہ سے کہیں پناہ نہیں پاتا تھا۔ یہانتک کہ بامید قدر دانی طلحہ بن طاہر کے دربار میں پہنچا۔ لیکن وہاں جاتے ہی سنہ ۱۸۰ھ میں انتقال کر گیا۔ عمر کل ۳۲ سال کی تھی۔

امام عبدالرحمن سہیلی روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام والے بھی بیچارے سخت فلاکت زدہ تھے۔ کبھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ آخر عمر میں والئی مراکش نے انکو طلب کیا وہاں تین سال رہے تھے سنہ ۵۸۱ھ میں انتقال کر گئے۔

یاقوت حموی رومی جس نے معجم البلدان اور معجم الادباء جیسی بے نظیر کتابیں چھوڑی ہیں غربت اور محتاجگی میں دیس دیس مارا پھرا آخر اسی گردش اور سرگردانی میں بلا کسی تمتع کے سنہ ۶۲۶ھ میں وفات پاگیا۔

امام ابو حامد اسفرائنی متوفی سنہ ۴۰۶ھ اپنے عہد کے امام مطلق مانے جاتے تھے اور اقصائے عالم سے لوگ ان سے علم حاصل کرنیکے لئے آتے تھے۔ امام قدوری کا قول ہے کہ وہ اگرچہ شافعی تھے لیکن میرے نزدیک شافعی سے زیادہ فقہ میں انکی نظر عمیق تھی۔ مقبولیت کا یہ عالم

تھا کہ خلیفہ سے صاف صاف کہا کہ تم چوٹی سے ایڑی تک کا زور لگا لو لیکن میرے منصب سے مجھکو نہیں گرا سکتے اور اگر میں دو سطریں بھی لکھدوں تو آج دنیا تمکو بے معزول کئے نہیں چھوڑے گی۔ طبقات شافعیہ میں سبکی نے لکھا ہے کہ زندگی بھر انہوں نے ایک گلی کی چوکیداری کر کے اپنی گذران کی۔

امام الائمہ ابن خزیمہ متوفی ۳۱۱ھ بخاری اور مسلم کے اُستاد اور علم کے بحر زخار ہیں۔ انکی کیفیت یہ تھی کہ کبھی ایک جوڑے سے دو جوڑے کپڑے انکے پاس نہو سکے کہ دھلواتے۔

امام زبیدی حنفی مذہب کے امام ہیں اور تقریباً سو تصانیف اُنہوں نے چھوڑی ہیں۔ ۵۵۵ھ میں انتقال کیا۔ علامہ بن جوزی لکھتے ہیں کہ وزیر ابن ہبیرہ کا بیان ہے کہ میں صبح سے دوپہر تک زبیدی کے ساتھ علمی گفتگو کرتا رہا۔ انکے منہ میں کوئی چیز تھی۔ میں نے باصرار دریافت کیا کہ کیا ہے۔ کہا کہ مجھے کھانے کو نہیں ملا تو کھجور کی چند گٹھلیاں منہ میں ڈال لی ہیں کہ تسلی رہے

میدانی لغت اور محاورات کا امام گذرا ہے جب اس نے کتاب الامثال لکھی تو علامہ زمخشری نے ازراہ حسد اس کے نام پر نون بڑھا دیا یعنی "نیدانی" بنا دیا اس نے انکے نام میں میم کو نون سے تبدیل کر دیا یعنی "زنخشری" جس کے معنے ہوئے زوجہ فروش

محمد بن معالی نے اپنی کتاب ضالۃ الادیب میں لکھا ہے کہ اگر وقار۔ شہامت اور فضل کی کوئی تصویر ہو سکتی ہے تو وہ میدانی کی شخصیت ہوگی۔ لیکن باوجود ان خوبیوں کے ہمیشہ قلاش ہی رہا ۵۳۰ھ میں انتقال کیا۔

ابو العلاء ہمدانی حنبلی محدث متوفی ۵۶۹ھ علم و فضل میں مشہور روزگار تھے اور ملوک و عوام سب میں مقبول لیکن ہمیشہ خشک روٹی کھاتے رہے اور بجز تیل کے کوئی سالن نصیب نہیں ہوا۔ رات کو جو کچھ لکھتے تھے وہ مسجد کے چراغ کے سامنے کھڑے ہو کر لکھتے تھے

چراغ جلانے کی بھی استطاعت نہ تھی۔

امام ابو سہل صعلوکی خراسان کے نامور امام گذرے ہیں۔ اس زمانہ کے علماء و فقہاء سے کئی بار بڑے مناظرے ہوئے اور یہ سب پر غالب آگئے۔ امام سبکی نے طبقات میں لکھا ہے کہ انکے پاس کوئی جبہ تک نہ تھا۔ زنانہ جبہ پہنکر تدریس کیلئے آیا کرتے تھے ۳۶۹ھ وفات پائی۔

معلم ثانی امام ابو نصر فارابی متوفی ۳۳۹ھ جس نے مشرق میں ارسطو کو نئے سرے زندہ کیا اور جو فلسفہ حکمت اور علوم عقلیہ کا امام ہے باوجود اپنے ان تمام کمالات کے دمشق میں ایک باغ کی چوکیداری کرکے زندگی بسر کرتا رہا۔ امیر سیف الدولہ نے اسکی قدردانی کے لحاظ سے ایک رقم بھی دینی چاہی اس نے بڑے اصرار کے بعد اسمیں سے صرف چار درہم لئے جس کو اسی وقت خرچ کر دیا۔

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی علم حدیث میں اپنے عہد کے امام تھے۔ اور اسکی ترتیب و تدوین و تعلیم میں اپنی زندگی گذارتے تھے ایکبار انکے پاس صرف ایک ہی درہم تھا اور ضرورت تھی کاغذ کی اور کھانے کی بھی انکا خیال یہ تھا کہ میں کاغذ خرید کر لاؤں روزی اللہ تعالیٰ کہیں سے بھیجدے گا۔ لیکن بھوک اسقدر شدت کی تھی کہ اب فیصلہ کاغذ کے حق میں بیکار تھا۔ کیونکہ بے کھائیکے لکھنے کی طاقت کہاں۔ آخر یہی طے کیا کہ اسکا کھانا خریدیں۔ حسب دستور درہم منہ میں رکھکر چلے۔ اتفاقاً راستہ میں وہ ذرا سی غفلت کی وجہ سے معدہ میں چلا گیا۔ اب زمین کی طرف دیکھتے ہیں اور آسمان کی طرف اور اپنی اس کیفیت پر مسکراتے ہیں فقیہ ابو طاہر اسی حالت میں آگئے۔ تبسم کا سبب پوچھا۔ ہرچند ٹالا لیکن وہ مصر رہے۔ آخر سبب بتلانا پڑا تب وہ انکو اپنے گھر لیگئے۔ کھانا کھلایا۔ اور کاغذ کے لئے بہت سے درہم دئے

امام بیہقی شافعی شعب الایمان والے بھی ہرچند کہ امام وقت تھے لیکن ابنائے زمانہ

سے بے نیاز کبھی قناعت کا دامن نہیں چھوڑا اور نہایت فقر و فاقہ میں زندگی گذار کر ۵۹۹ھ میں انتقال کیا۔

عبدالرحمن بن محمد انباری صاحب بدایۃ الہدایۃ فی الاصول و ہدایۃ المذاہب وغیرہ مشہور اور مقبول ارباب کمال سے گذرے ہیں مورخ موفق عبداللطیف نے لکھا ہے کہ ان سے زیادہ متین۔ قابل اور متورع انسان ہم نے نہیں دیکھا لیکن کبھی انکو رات کو چراغ جلانے کے لیے تیل نصیب نہیں ہوا۔ ایک ہی جوڑا کپڑا تھا جسکو پہنکر جمعہ پڑھنے کیلئے آتے تھے اور گھر میں پرانے پھٹے کپڑے پہنتے تھے خلیفہ مستضی نے انکے پاس پانسو دینار بھیجے۔ انکو واپس کر دیا خلیفہ نے کہا کہ اپنے بیٹے کیلئے لے لیجئے کہا کہ اگر تم نے اسکو پیدا کیا ہو تو اسکے رزق بنو۔ شعبان ۵۷۷ھ میں وفات پائی۔

امام محی الدین نواوی شارح مسلم جیسے محدث کو زندگی بھر صرف ایک ہی وقت کھانا نصیب ہوا۔ اور ہمیشہ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے۔ کبھی اتنی وسعت نہ ہوئی کہ نکاح کر سکتے۔ یا کم سے کم حمام میں غسل کو جا سکتے۔ زہد کا یہ عالم تھا کہ دمشق جیسی جنت میں رہکر بھی کبھی وہاں کے پھل نہ کھائے۔ کیونکہ یہ خیال تھا کہ یہاں مال اوقاف زیادہ ہے اور لوگ ناجایز طریقہ سے اسکی پیداوار بازاروں میں لاکر فروخت کرتے ہیں ۶۷۶ھ انتقال کیا۔

ابوالحسن علی بن احمد قالی ادب کے امام گذرے۔ ابن درید کی کتاب الجمہرہ کا ایک نسخہ انکے پاس تھا جسکو یہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن فقر کی بدولت آخر اسکو بیچنا پڑا۔ اور شریف رضی بغداد کے نامور شاعر نے اسکو خریدا۔ دیکھا تو اسپر یہ اشعار لکھے ہوئے تھے۔

انستُ بہا عشرین حولاً و بعتہا	لقد طال وجدی بعدہا و حنینی
میں اس سے بیس سال تک مانوس رہا پھر مجھے اسکو بیچنا پڑا	اس کے بعد مجھے اسکا بڑا رنج و صدمہ ہوا

وما كان ظنى انى سا بيعها ولو خلدتنى فى السجون ديونى

میرا خیال اس کو بیچنے کا نہ تھا گو مجھے اپنے قرض کی بدولت ہمیشہ قید ہی میں رہنا پڑتا

ولكن لضعف و افتقار وصبية صغار عليهم تستهل جفونى

لیکن تنگی محتاجگی اور بچوں کی وجہ سے جو چھوٹے چھوٹے ہیں اور جنکی مصیبت پر میرے آنسو نکل پڑتے ہیں

امام سہروردی صاحب عوارف المعارف متوفی ۶۳۲ھ باوجود اس کے کہ اپنے زمانہ کے روشن چراغ تھے نہایت تنگ حال رہے اور مرتے وقت کفن بھی نہ چھوڑا۔

یہ حالات میں نے اسلئے التقاط کئے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں جو اہل کمال زمانہ کی بے قدری سے کس مپرسی میں پڑے ہوتے ہیں انکے دل کو تسلی ہو کہ اہل ہنر کیساتھ ہمیشہ زمانے نے دشمنی رکھی ہے۔

ایک خاص نکتہ یہاں اور بھی ذکر کے قابل ہے کہ ہر عہد میں ارباب کمال نے اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کی شکایتیں کی ہیں۔ اور صرف مفلوک الحال ہی لوگوں نے نہیں بلکہ فارغ البال اور کامیاب لوگوں نے بھی۔ گویا یہ ایک عام خاصہ انسانی ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے خوش نہیں رہتا۔ لیکن ان سب کے برخلاف ہم کو دنیا میں ایک ممتاز ترین ہستی نظر آتی ہے جس نے باوجود تمام صاحبان کمال سے زیادہ دکھ اور مصیبت اٹھانے کے اور اپنے ابنائے زمانہ کی مخالفت اور دشمنی دیکھنے کے بھی پکار کر کہا کہ

خیر القرون قرنی

کیونکہ یہ ایک حقیقت تھی جس کو ظاہر کرنا ضروری تھا۔ یہ فخر نہیں تھا کہ چھپایا جاتا۔ چنانچہ زمانہ نے ثابت کر دیا کہ دراصل اس ذات مقدس کی زندگی اور بالخصوص اسکی زندگی کے آخری

تینتیس سال مینتیس موتیوں کی ایک مالا تھی جو زمانہ کی گردن میں پڑی ہوئی تھی۔
اب یہ آپ کا کام ہے کہ اس بزرگ ترین ہستی کو پہچانیں اور اس پر درود بھیجیں۔ فقط

سلم جیراجپوری

کون وفساد

فلسفی وو بحث کل کرتے تھے تھانہ کے قریب
کیوں تغیر آشنا ہے عالم کون وفساد

فیصلہ کیا خوب فرمایا ہے تھانہ دار نے
فلسفہ سے ذوق جنکو ہو وہ دینگے اس کی داد

سوتے سوتے چونک کر بولے کہ او کانسٹبل
ایکدم چالان کردو کون کرتا ہے فساد

ممبر کونسل

یہ نہیں معلوم اس نے یس کہا یا نو کہا
میں تو کہہ گذرا کہ صاحب سچ ہی تو شہ یہ کہا

(عابد)

ہزار سالہ جرمن ادب

از ڈاکٹر موریس گولڈ شائن

ڈاکٹر گولڈ شائن جنکا مضمون ہم آج کی اشاعت میں ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جرمنی کے ایک مشہور ادیب ہیں۔ آپ برلن کے نامور اخبار فاسشے سائیٹنگ کے ادبی حصہ کے مدیر ہیں۔ اور آپ نے ہماری فرمائش پر ذیل کا مضمون خاص رسالہ "جامعہ" کیلئے مرحمت فرمایا ہے۔

مدیر

جرمن ادب عبارت ہے اس تمام ادب سے جو جرمن زبان میں ہے۔ اسکا رقبہ جرمن حکومت کی مملکت کے مرادف نہیں بلکہ اس سے کہیں متجاوز ہے۔ اس کے حلقہ اثر میں موجودہ جرمن آسٹریا اور علی الخصوص شہر وین نیز آسٹریا کے المانی علاقے شامل ہیں۔ موجودہ چیکوسلوواکیا کے المانی اللسان حصے اور خصوصاً شہر پراگ اسی کا جزو ہیں۔ اور بالآخر سوئیزرلینڈ کا جرمن بولنے والا حصہ بھی اسی سے متعلق ہے۔ سیاسی حد بندیاں جو کبھی ان تمام حصوں کو یکجا کر دیتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے جدا، وہ پچھلی صدیوں میں بار بار بدلتی رہی ہیں، چنانچہ سب سے آخر میں صلحنامۂ ورسائی نے اسمیں بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اتحاد لسانی اور اس وجہ سے ادبی یگانگت اور صرف یہی نہیں بلکہ فی الجملہ ذہنی اتحاد کا جو رشتہ ان سب حصوں کو ایک بندھن میں باندھتا ہے وہ ہمیشہ قائم و برقرار رہا ہے۔

جرمن زبان کا اصلی وطن وسط یورپ ہے۔ اسکی مغربی و جنوبی حد بندی رومانی زبانیں کرتی ہیں اور مشرق و جنوب و مشرق میں اس کے ڈانڈے سلافی زبانوں سے ملتے ہیں۔ شمال اور شمال مغرب میں اسکا تعلق بعض مشابہ زبانوں سے ہے۔ زبانوں کا گرمانی خاندان

جرمن زبان اور ان قریب کا تعلق رکھنے والی دوسری زبانوں پر مشتمل ہے۔ اس خاندان میں جرمن زبان مغربی شاخ کی رکن ہے۔ حکماء کا خیال ہو کہ شروع شروع میں صرف ایک ہی مشترک مغربی گرمانی زبان تھی یعنی وہ زبان جو غالباً اس وقت رائج ہوگی جب رومی سپاہ کو معرکہ آرائی اور نوآبادی کے سلسلہ میں گرمانی قوم سے سابقہ پڑا۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں بعض تغیرات صوتی کے باعث جرمن زبان مشترک مغربی گرمانی زبان سے الگ ہوتی گئی۔ علماء لسانیات نے ان تغیرات صوتی کی تو ٹھیک ٹھیک تحقیق کرلی ہے۔ البتہ اس بات کا تعین اب تک ناممکن یا کم از کم محض قیاسی ہے کہ یہ تغیرات کس زمانہ میں رونما ہوئے۔

بہر حال جرمن زبان پہلے بھی بولی جاتی تھی اور اب بھی الپائی سلسلہ کوہ سے لیکر دونو جرمن سمندروں یعنی بحر شمال اور بحر شرقی تک کل علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ اس علاقہ میں جو بلند حصہ ہے یعنی الپس میں، اور اس کے قریب وہاں کے باشندوں کو "اعلیٰ" جرمن کہتے ہیں سمندر کے قریب کے نشیبی علاقہ میں رہنے والوں کو "ادنیٰ" جرمن انکے درمیان میں جو لوگ رہتے ہیں انہیں "وسطی" جرمن کہتے ہیں۔ یعنی جائے قیام کے اعتبار سے یہ سہ گانہ تقسیم کیگئی ہے۔

لیکن زبان کے اعتبار سے بھی یہ جغرافی تقسیم محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ہم نے اوپر جو ذکر کیا ہو کہ بعض تغیرات صوتی پیدا ہوئے تو ان میں سے بعض تغیرات ایسے تھے جو صرف "اعلیٰ" جرمنوں کی زبان میں رونما ہوئے اور اسطرح انکی زبان بین طور پر "ادنیٰ" جرمنوں سے علیحدہ ہوگئی۔ اس وقت سے یہ 'ادنیٰ' اور 'اعلیٰ' کی جغرافی ومقامی تقسیم تھی یہ ساتھ ہی ساتھ ایک لسانی تقسیم بھی ہوگئی۔ رہنے 'وسطی' لوگ تو انکی زبان بھی ان دونوں 'اعلیٰ' اور 'ادنیٰ' کے بین بین ایک درمیانی سی چیز بنگئی ہے۔

اس جغرافیائی اور لسانی تقسیم کے علاوہ زمانہ کے اعتبار سے بھی ایک سہ گانہ تقسیم ہے۔ اعلیٰ جرمن میں جن تغیرات صوتی کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ مسیح کے کوئی چھ سو سال بعد شروع ہو چکے تھے۔ اس زمانہ میں جس عہد کا آغاز ہوا اسے لوگ عہد قدیم کہتے ہیں اور اس زمانہ کی زبان کو "قدیم اعلیٰ جرمن" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عہد کی ادنیٰ جرمن کو بھی اسی طرح "قدیم ادنیٰ جرمن" کہتے ہیں۔ خود ہمارا جو زمانہ ہے اسے عہد جدید کہتے ہیں اور اس لحاظ سے جدید اعلیٰ جرمن اور جدید ادنیٰ جرمن کی تفریق کی جاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان عہد وسطیٰ ہے اور یہیں بھی پھر وسطیٰ ادنیٰ اور وسطیٰ اعلیٰ جرمن کی تقسیم ہوتی ہے۔ زمانہ کے اعتبار سے جو تقسیم کی گئی ہے اسکو اگر وسطیٰ جرمن پر بھی عاید کریں تو پھر قدیم، وسطیٰ، اور جدید وسطیٰ جرمن کی تقسیم کرنی پڑے گی لیکن یہ تقسیم عام طور پر لسانیات میں رائج نہیں۔

یہ جو لفظ ہے "اعلیٰ جرمن" اس کا ایک اور خاص مفہوم بھی ہے۔ یعنی کچھ اتفاق کی بات ہے کہ عہد وسطیٰ اور عہد جدید دونوں میں یہ "اعلیٰ جرمن" صرف بلندی پر رہنے والے جرمنوں کی زبان ہی نہیں رہی اور صرف اسی لحاظ سے اسے نشیب میں سمندر کے قریب رہنے والوں کی زبان "ادنیٰ جرمن" سے علیحدہ نہیں سمجھا گیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہ تمام جرمنوں کی عام فہم تحریری زبان بھی تھی حالانکہ باہمی گفتگو کی اور زبانیں ایک دوسرے سے بہت مختلف اور اکثر باہم ناقابل فہم تھیں۔ یہ تحریری زبان قرون وسطیٰ میں اور آج بھی ایک مخلوط زبان ہے۔ اسمیں "اعلیٰ جرمن" کا عنصر بہت زیادہ اور "ادنیٰ جرمن" عنصر بہت کم ہے۔ پھر ایک معنی کر ہم عہد قدیم کی "اعلیٰ جرمن" کو بھی ادبی زبان کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر چند کہ "ادنیٰ جرمن" میں تصانیف کبھی بھی بالکل معدوم نہ تھیں تاہم اصلی جرمن ادب اعلیٰ جرمن میں ہے اور اس اعتبار سے ہم قدیم، وسطیٰ اور جدید اعلیٰ جرمن کو تاریخ ادبی کے تین عہد بھی قرار دے سکتے ہیں۔

اعلیٰ جرمن کا عہد قدیم جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے تقریباً ۷۵۰ء میں شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کی محض چند چیزیں بچکر ہم تک روایتہً پہونچی ہیں۔ اس عہد کی جو مفصل کتابیں ہیں ان میں جرمن زبان کو عیسائی مذہب کے مطالب کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ چند صدی پیشتر یہ مذہب گرمانی اقوام تک پہنچ چکا تھا۔ دوسرا جو کلام ہے اسمیں گرمانی دیوتاؤں اور مشاہیر کی دنیا ہنوز زندہ ہے۔ انہیں سے ایک نظم صرف بعد کے لاطینی ترجمہ کی شکل میں موجود ہے۔ اس قدیم اعلیٰ جرمن میں صرف ایک اصلی نظم باقی ہے جس میں گرمانی بہادروں اور مشاہیر کا تذکرہ درج ہے مشہور و معروف ہلڈبرانٹ کا گیت اور یہ بھی بہت مختصر اور صرف نیم ناتمام بھی ہے۔ اس تصنیف میں ذکر ہے اسکا کہ ایک بوڑھا جنگ آزما جلا وطنی کے ایام کاٹ کر اپنے وطن کو واپس آتا ہے۔ سرحد پر ایک نوجوان سنتری اسے روک دیتا ہے۔ یہ بوڑھا اثنائے گفتگو میں پہچان لیتا ہے کہ یہ نوجوان اسی کا بچہ ہے جسے یہ چھوٹا سا چھوڑ کر گیا تھا اور مارے فخر اور خوشی کے پھولا نہیں سماتا لیکن یہ نوجوان کسی طرح یقین نہیں کرتا کہ یہ اس کا باپ ہے اور اس بوڑھے کو مقابلہ پر مجبور کرتا ہے نظم کا خاتمہ موجود نہیں۔ قیاس ہے کہ خاتمہ نہایت المناک ہوگا۔ شاید یوں کہ جنگ ہوتی ہے باپ جیتتا ہے اور اپنے پوت کی نعش پر کھڑا ہے اور خاتمہ سے پہلے شاید مرتے وقت بیٹے نے اپنے باپ کو کسی طرح پہچان کر اسے باپ تسلیم بھی کر لیا ہو۔ اعلیٰ جرمن کے اس قدیم عہد کو لوگ سنہ ۱۱۰۰ء تک شمار کرتے ہیں۔ اسکے بعد اعلیٰ جرمن کا عہد وسطیٰ شروع ہوتا ہے۔ جرمن سرزمین پر شدید قتل و خونریزی ہوتی ہے۔ حروب صلیبی یورپ کو ممالک شرق سے ملاتی ہیں اور اسی زمانہ میں نو ساخت درباروں اور بانکوں کے مجمعوں میں ایک عجیب و غریب اور رنگارنگ تمدن نشو و نما پاتا ہے جس کے اجزا ہیں جسمانی حسن اور قوتوں کی نگہداشت، خوشگوار اور لطیف مراسم عورتوں کی خدمت میں ایک شاعرانہ شیفتگی وغیرہ۔ اور یہی سب چیزیں اس عہد کے ادب میں شامل ہیں۔

ادب میں اپنا رنگ دکھاتی ہیں اور یہ انہیں کی ترجمانی کرتا ہے۔ بڑی بڑی اور استادانہ تصانیف جو محیر العقول کثرت کیساتھ اس عہد میں پیدا ہوئیں انہیں بعد میں لوگوں نے تقریباً بالکل فراموش کر دیا۔ اور کہیں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے میل کے وقت جاکر لوگوں نے خانقاہوں کی کتب خانوں سے ان قلمی نسخوں کو نکالنا شروع کیا اور اس فراموش کردہ عہد اور اسکی شاعری کو دوبارہ زندہ کرنیکی تدابیر نکالیں پھر تو اس وقت قرون وسطی کے جرمن تمدن اور شاعری سے واقفیت ہر جرمن کی اعلی تعلیم کا جزو ضروری تسلیم ہوتا رہا ہے۔ اور پچھلی صدیوں کے فنون لطیفہ نے بار بار کوشش کی ہے کہ اس قدیم مواد کو نئی نئی شکلوں میں پیش کریں۔ دنیا میں معروف تو ہوئے ہیں واگنر کے موسیقی والے ڈراما جنہیں "نیبلنگ کی انگشتری" کا ماخذ جرمنوں کی سب سے بڑی قومی نظم "نیبلنگ کا گیت" ہے "ترستان وار ولدے" کی بنیاد استراسبرگ کے مشہور شاعر گاٹفرید کے منظوم قصہ پر اور "پارسیفال" کا ڈھیر اشنباخ کے مشہور تر مصنف وولفرام کے اشعار سے لیا گیا ہے۔ قرون وسطی کی بیانیہ اور واقعاتی نظموں کے علاوہ اس عہد میں تغزل کا بھی زور تھا خصوصاً عشقیہ شاعری کا۔ پھر واقعات حاضرہ کے سلسلہ میں بھی نظمیں لکھی جاتی تھیں اور اس ارادہ سے کہ ان واقعات کی رفتار پر کوئی اثر ڈالا جائے۔ اس زمانہ کے خانہ بردوش مغنیوں میں سب سے ممتاز فوگل وائڈی کا والٹر تھا جو باوجودیکہ وجاہت ظاہری کے اعتبار سے کم حیثیت کا آدمی سہی لیکن ذہنی اعتبارات سے بلاشبہ اپنے عہد کے مشاہیر میں شمار کئے جانیکا مستحق ہے۔

قرون وسطی کی ساری ادبی تصانیف نظم کے قالب میں ہیں۔ نظم کی شکلیں بہت مختلف ہیں اور اس کے قواعد نہایت سخت اور تمام کلام میں ردیف وقافیہ کی قید ہے۔ کوئی سنہ ۱۵۰۰ء کے قریب آکر نثر کا ادب شروع ہوتا ہے۔ باکموں کی شاعری اپنے تمام ذخائر ختم کر چکی ہے۔

کیونکہ جب شہروں نے تمدنی زندگی کی قیادت کا کام سنبھالا تو یہ بانکوں کی ساری زندگی ہی ختم ہونے لگی۔ اُدھر یوحنا گوٹنبرگ نے فن طباعت کی اختراع کرکے تحریر کی اشاعت میں سہولت پیدا کر دی اور یوں لوگوں کو جلد جلد تصنیف کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ اس عہد کے ذہنی محرکوں کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ خیالات کی لطیف تشکیل کی جائے۔ ہاں اسکا نتیجہ تبادلہ خیالات ضرور ہوا۔ ایک آزاد خیال نسل نے کلیسا کی تعلیم کی مخالفت شروع کی، خالص علمی تحقیق کو فروغ دینے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ نیز اس امر کی مساعی کہ سچی مذہبیت کو علماء مذہب کی مردہ اور بوسیدہ تعلیم کے مقابلہ میں زندہ کیا جائے۔ اس اصلاح کلیسا کا ہراول مارٹن لوتھر تھا۔ یہ شروع شروع میں راہب اور اس حیثیت سے وٹن برگ کے مدرسہ عالیہ میں معلم تھا۔ اسی شخص نے جرمن قوم کے سامنے مذہب مسیحی کی کتب مقدسہ جرمن زبان کے قالب میں پیش کیں انجیل کا یہ ترجمہ جو ۱۵۳۴ء میں مکمل ہو گیا تھا وہ عظیم الشان ذہنی کارنامہ ہے جس سے جرمن ادب کے دور جدید کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کتاب کے بعد جو اور کتابیں چھپیں آئی زبان کیلئے بھی اس نے نمونہ کا کام دیا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کے وقت سے ہی اس نئی "اعلیٰ جرمن" کا تدریجی نشوونما شروع ہوا۔ جو آج بھی بطور تحریری زبان کے زندہ ہے۔

لوتھر کا زمانہ مکمل اور ڈھلے ترشے شاعرانہ کارناموں کے لئے اسقدر قابل یاد نہیں جتنا کہ اس مواد شعر کی فراہمی کیلئے جسے بعد آنیوالی نسلوں نے لطیف شکل دی۔ لیکن پھر بھی اس عہد میں جو نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے اور عام ذہنیت میں جو خمیر سا اٹھ رہا تھا اسکی تشکیل لطیف کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہوتی اگر ایک بڑی یورپی جنگ نہ چھڑ گئی ہوتی جس کی معرکہ آرائی اور خونریزی جرمن سرزمین پر ہی عمل میں آئی ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک جو جنگ سی سالہ پاپائے روم اور لوتھر کے مقلدوں میں ہوتی رہی اس نے جرمنی کے سیاسی، تمدنی اور ادبی ارتقاء کو اسی

ٹنے والا اور ایسے ہی نقصان پہنچائے۔ جیسے کہ گذشتہ جنگ عظیم اور اس کے عواقب سے ناقابل تلافی مضرت کا اندیشہ ہے۔ ۱۶۴۸ء کے بعد جرمنی میں بس ہر چیز کے کھنڈر ہی کھنڈر باقی تھے اور جس طرح اور سب چیزوں میں تغیر کیلئے نئی بنیادیں ڈالنی ضروری تھیں اسی طرح ادب و شاعری میں بھی کام کو از سر نو ہی شروع کرنا تھا۔ اس زمانہ میں بس ایک ادبی کارنامہ ظہور پذیر ہوا یعنی گریمل ہاؤزن کا رومان (Simplicius Simplicissimus) جو ۱۶۶۹ء میں شائع ہوا اور جسمیں زمانہ جنگ کے جنون کی نہایت سچی لیکن ساتھ ہی نہایت شاعرانہ تصویر کھینچی گئی ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں جرمن ادب کیلئے ایک نئے تلاطم اور عروج کا دور شروع ہوتا ہے۔ اسکے ہراول چند بڑی شخصیتیں تھیں۔ کچھ ہی عرصہ میں یہ تحریک اپنی معراج کمال کو پہنچ گئی اور یہی عہد ہمارے ادب کا کلاسک عہد بن گیا۔ لیسنگ نے ماہیت شعر پر اپنی نظری تحقیق اور اپنی بے پناہ تنقید سے ایک نئی راہ کی داغ بیل ڈالی اور اپنے ناٹکوں میں اس کی مثالیں پیش کیں۔ اس کے ناٹک آج بھی جرمن اسٹیج کی رونق ہیں۔ ویلانڈ نے اپنی اعلیٰ سمجھ اور غیر معمولی ذخائر معلومات کیساتھ زبان میں خوب لوچ اور نزاکت پیدا کی کلوپسٹاک نے نظم کو چار چاند لگا کر اس سے اعلیٰ انسانی اور مذہبی جذبات کی ترجمانی کا کام لیا۔ ان تین پیشروں کے بعد تین وہ شخص آئے جنہوں نے اس کام کو پورا کیا ہرڈر نے (جو انمیں سب سے معمر تھا) عقل اور سمجھ کو چھوڑ کر جذبہ اور احساس کی راہ معلوم کی اور مصنوعی شاعری کے نمونوں کو چھوڑ کر قومی کیطرف توجہ کی۔ شیلر نے (جو انمیں سب سے کمسن تھا) ڈراما کو اس عہد کی کشمکش اور قوموں کے حوصلہ اور آرزو کی آواز بنا دیا جس کی قومی صدائے بازگشت آج تک دنیائے ادب میں گونج رہی ہے۔

لیکن ان دونوں کے بیچ میں آتی ہے جرمن ادب کی سب سے بڑی اور ادب عالم کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ایک یعنی یوہنا وولفگانگ گوئٹے (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) غزل کی حیثیت سے ہمہ گیر اور انشاء، ڈراما اور رومان میں عمیق حقائق اور خالص جذبات کی تشکیل کرنے والا فلسفی اور علمی محقق ہونے کی حیثیت سے بھی اعلیٰ مقام رکھنے والا جس نے اپنی ان تمام کمالات سے "فاؤسٹ" نامی ڈراما میں بدرجہ اتم کام لیا ہے اور اسی نے یہ انسانیت اور دور حاضرہ کے انسان کی تقدیر کی نہایت موثر اور حسرت انگیز داستان ہے۔ اسے ہم بجا طور پر موجودہ جرمنی کی قومی نظم کہہ سکتے ہیں۔ شہر ویمار جہاں یہ کم و بیش ۵۰ سال بحیثیت وزیر مقیم رہا اسی کی وجہ سے جرمنی کا ذہنی مرکز بن گیا اور آج بھی اسی نام جرمن ادبی و ذہنی روایات کا حامل ہے۔

خود گوئٹے کی زندگی میں جرمنی کے نوجوانوں میں ایک تحریک پیدا ہوئی اور پھیلی یعنی رومانٹک تحریک۔ اس نے قدیم متقدمین اور کلام کی شکل ظاہری کی شدید پابندیوں کو چھوڑ کر جذبات کی دھندلی گہرائیوں کی طرف رجوع کیا اور قوم کے ماضی کی یاد میں پناہ ڈھونڈی۔ اس تحریک سے طرح طرح کے فائدے مترتب ہوئے۔ زبان، ادب، تاریخ، فنون لطیفہ سب کی علمی تحقیق میں اس تحریک نے نئے نئے نقطہ ہائے نظر پیدا کئے اور فلسفہ و موسیقی بھی اس کے فیض سے محروم نہ رہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں جرمنی کے اندر سیاست داخلی کی معرکہ آرائیاں شروع ہوگئیں۔ خالص شاعری کی جگہ سیاسی شاعری نے لینا شروع کر دی اور جس زمانہ میں یہ سرگرمیاں ہو رہی تھیں جن کا نتیجہ بالآخر ۱۸۷۱ء میں آکر جرمن قوم کے اتحاد کی شکل میں نکلا اس عہد میں ہر چند کہ بڑے شاعر کلیۃً تو مفقود نہ تھے تاہم فروغ بس قدیم اساتذہ کے کلام کی کمزور

اور سطحی نقالی ہی کو تھا۔

۱۹۱۸ء کے بعد سے ایک نئی ادبی انقلاب کا دور شروع ہوتا ہے جسمیں بہت توجہ ان گوناگوں مسائل کیطرف کی گئی جو ہیئت اجتماعی کو پیش آرہے تھے اور جسمیں یہ کوشش کیجاتی تھی کہ فطرت کا کامل تتبع کیا جاے۔ اسی تحریک انقلابی کی فضا میں جرمنی کے سب سے مشہور شاعر نے نشو ونما پائی ہے یعنی گرہارٹ ہاوپٹ مان یہ ایک تحریک اب بھی جاری ہے اگرچہ جنگ عظیم کے ساتھ ہی ساتھ اس تحریک کے بالکل متضاد صورت حال بھی رونما ہو چلی ہے اور اس نئی تحریک کی بانگ درا یہ ہے کہ واردات ذہنی وقلبی کو بالحاظ انکے فطری یا غیر فطری ہونے کے، بلکہ بلالحاظ انکے قابل فہم یا ناقابل فہم ہونے کے، اسی طرح نہایت شدت کیساتھ ظاہر کردیا جائے۔ جنگ، اور جنگ میں ہماری شکست نے پھر ملک کے اندر روحی انقلاب اور معاشی دشواریوں نے ادبی وجمالی تخلیق کے کام کو بھی درہم برہم کردیا ہے اور کون بتا سکتا ہے کہ ہمارے نوجوان اور جدید ترین شعراء کی بلند آہنگ بے راہ روی کی منزل کیا ہوگی!
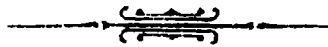
ہندوستان کا افلاس

ہندوستان کی معاشی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بدقسمتی سے ہماری عام غربت اور افلاس کی تصویر سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ اس واقعہ کے ثبوت کیلئے کسی دلیل یا اعداد و شمار پیش کرنیکی ضرورت نہیں جس نے بھی آنکھیں کھولکر ہندوستان کی کسی بستی کیحالت دیکھی ہے وہ محسوس کریگا کہ ہزاروں میں صرف چند ہی ایسے نفوس کی مل سکتی ہیں جنکو پیٹ بھر کھانا اور جسم ڈھانکنے کے لئے سفید کپڑا نصیب ہی، باقی زیادہ تر اللہ کے بندے ایسے ہیں جنکے پاس نہ ستر پوشی کیلئے کپڑا ہے نہ زندگی بھر میں کبھی دونوں وقت پیٹ بھر غذا میسر آتی ہے۔ انکے ننگے جسم جنمیں ہڈی چمڑے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ان کی معاشی زندگی کی ایک ایسی دردناک تصویر پیش کرتے ہیں کہ اس ملک کی عام غربت اور افلاس کے مسئلہ پر جلد از جلد ہر صاحب علم اور تدبیر کیلئے توجہ کرنا ضروری ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ان اسباب کی تحقیق کیجائے جنکی وجہ سے غربت اور افلاس کی موجودہ حالت پیدا ہوگئی ہے یا اسکو دور کرنے کے لئے کوئی تدبیر اور علاج سوچا جائے۔ ضرورت ہے اس مسئلہ کی واقعیت پر محققانہ بحث کیجائے۔ اس لئے کہ بہت سے ارباب حل و عقد اور خصوصاً حکمراں جماعت اس مسئلہ کی واقعیت ہی کو تسلیم نہیں کرتی۔ دنیا بھی اس غلط فہمی میں ہے جس ملک کی زرعی پیداوار سے دنیا کی بازاریں بھری رہتی ہیں۔ جہاں کی کپاس اور دوسری قسم کی خام پیداوار سے تجارتی ممالک کے کارخانوں کیلئے مواد ملتا ہے اور پھر جس ملک کے لئے سونے چاندی کی اتنی زیادہ مانگ ہے کہ متمدن ممالک کے نظام زر اور مبادلہ میں انتشار پیدا ہو جانے کا کبھی کبھی خطرہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ملک میں کوئی بھوکا اور ننگا کیونکر رہ سکتا ہے؟

قدرت کی فیاضیوں سے ہندوستان کی ضرب المثل زرخیزی اور دولت و ثروت کے متعلق تاریخ قدیم کے مورخین نے جو کچھ لکھا ہے وہ قصہ کہانیاں نہیں بلکہ واقعات سمجھے جاتے ہیں، پھر آخری دور میں جب سے ہندوستان برطانیہ کے ظل عاطفت میں آیا ہے اُسوقت سے ترقی کی دوسری راہیں بھی کھل گئیں ہیں، یعنی قیام امن و امان، تار و ڈاک کا انتظام، دخانی جہاز، ریل اور دوسرے وسائل آمد و رفت، ان سب باتوں کے بعد کوئی کیونکر باور کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی غالب آبادی غربت اور افلاس کے نیچہ میں ہے اور کل قوم کی معاشی زندگی خطرہ میں ہے! یہی نہیں بلکہ ان حالات کی بنا پر یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ملک و قوم کی مجموعی دولت اور خوشحالی میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے!

اگر اس دعوے کے خلاف غربت اور افلاس کا شکوہ کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ سیاسی اغراض کیلئے شورش کو زیادہ موثر بنانے کا یہ ایک کامیاب طریقہ ہے جو حکومت کے خلاف عوام الناس نیز دیگر ممالک کی ہمدردی حاصل کرنیکے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کیطرف سب سے پہلے ایک ایسے شخص نے توجہ دلائی جس کے ہاتھوں سے ہندوستان کی سب سے پہلی سیاسی انجمن کی بنیاد پڑی تھی، اس لئے اس مسئلہ کی خالص معاشی اہمیت کیطرف جس قدر توجہ ہونی چاہئے تھی وہ کبھی نہیں کی گئی، پھر بھی اس باب میں جو کوشش بعض معتبر جانبدار معاشی محققین نے کی ہیں اور جنکی تحقیق کے نتائج سے ملک کی عام غربت اور انتہائی افلاس کا دعوی پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے وہ ہم اس مضمون میں ناظرین کے غور و فکر کیلئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی قوم یا ملک کی دولتمندی یا غربت محض اضافی ہوتی ہے نہ کوئی قوم یا ملک مطلق غریب کہا جا سکتا ہے نہ مطلق دولتمند، ایک معیار البتہ ایسا مقرر کیا جا سکتا ہے جس کے لحاظ سے کسی قوم کی معاشی حالت کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جائے۔ یہ معیار بھی باعتبار کارکردگی

کے مقرر کیا جاتا ہے۔ اور کارکردگی کے اس معیار کو قائم رکھنے کیلئے جس قدر آمدنی درکار ہو اگر وہ اوسط آمدنی اس قوم کے افراد کو حاصل ہو تو وہ قوم معاشی نقطۂ نظر سے خوش حال کہلائیگی نہ غریب، دوسری صورت یہ ہو کہ دوسرے متمدن ممالک کی معاشی حالت سے مقابلہ کیا جائے تو اپنی قوم کی غربت یا دولتمندی کا نسبتاً اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم اس مضمون میں انہیں دو طریقوں سے اپنی معاشی حالت کی تحقیق کرینگے۔

ہندوستانیوں کی فی کس سالانہ آمدنی کے متعلق بہت سے تخمینے کئے گئے ہیں سب سے پہلے دادا بھائی نوروجی نے ۱۸۷۰ء میں اوسط آمدنی کے متعلق اپنی تحقیقات کے نتائج ایک کتاب کے ذریعہ مدلل طریقہ پر پیش کئے اور یہ دکھلایا کہ ہندوستانیوں کی فی کس سالانہ آمدنی اس وقت بیس روپیہ سے زیادہ نہ تھی۔

۱۸۸۰ء میں قحط کے اسباب اور حالات کی تحقیقات کرنیکے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس کمیشن نے جو اعداد و شمار جمع کئے انکی بنا پر سر ڈیوڈ باربر نے ۱۸۸۲ء میں فی کس سالانہ آمدنی کا تخمینہ حسب ذیل طریقہ پر کیا۔

زرعی آمدنی	۳۵۰۰۰۰۰۰۰۰
غیر زرعی آمدنی	۱۷۵۰۰۰۰۰۰۰
میزان	۵۲۵۰۰۰۰۰۰۰

اس وقت آبادی تقریباً ۱۹ کروڑ ۵۴ لاکھ ۲۹ ہزار تھی۔ اس لحاظ سے گویا سالانہ آمدنی کا اوسط فی کس ستائیس روپیہ ہوا۔

اسی طریقہ پر لارڈ کرزن نے اپنے عہد حکومت میں بعض نکتہ چینیوں کا منہ بند کرنے کے لئے زرعی اور غیر زرعی آمدنی کے اعداد و شمار جمع کرائے اور وہ جس نتیجہ پر پہونچے اس کا اظہار سرکاری

طور پر ۲۸، مارچ ۱۹۰۱ء کو وائسرائگل کونسل کے سامنے میزانیہ پر تقریر اور تبصرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا :-

"حال ہی میں (۱۹۰۱ء) قحط کے تحقیقاتی کمیشن نے جو اعداد و شمار جمع کئے ہیں ان سے مد لیکر میں نے ہندوستان کی کل زرعی پیداوار کی قیمت کا اندازہ لگایا ہے .... اسکی میزان کل ۴۵۰ کروڑ روپیہ ہوئی ہے ۱۸۸۰ء میں جو تخمینہ کیا گیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت زرعی آمدنی کا اوسط فی کس اٹھارہ روپیہ سالانہ تھا لیکن اگر اسی رقبہ کی پیداوار کا تخمینہ حال کے جمع کئے ہوئے اعداد و شمار سے کیا جائے تو میں پاتا ہوں کہ باوجود اضافہ آبادی کے زرعی آمدنی برابر بڑھتی رہی اور اسوقت فی کس سالانہ اوسط زرعی پیداوار کا بیس روپیہ ہوتا ہے یعنی ۱۸۸۰ء کی بہ نسبت دو روپیہ فی کس زائد اب اگر میں یہ فرض کر دوں (اور اس مفروضہ کے غلط ہونیکی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی) کہ غیر زرعی آمدنی میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوا ہے تو فی کس آمدنی کا اوسط تیس روپیہ سالانہ ہوتا ہے یعنی ۱۸۸۰ء کی اوسط آمدنی کے مقابلہ میں تین روپیہ فی کس زائد"

سرکاری طور پر ہندوستان کی اوسط آمدنی دریافت کرنیکی چونکہ یہی دو کوششیں تھیں جو ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۱ء میں کی گئیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ جس طریقہ استدلال سے یہ مبالغہ آمیز نتیجہ نکالے گئے ہیں انکی تحقیق اور وضاحت کرکے یہ دکھلایا جاتا کہ جمع، باقی، ضرب اور تقسیم کرنے میں وائسرائے اور انکے مشیر مال نے کوئی غلطی نہ کی ہوگی لیکن جن اعداد پر ریاضی کے قاعدوں سے عمل کیا گیا ہے وہ زیادہ تر فرضی تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ "اسکی تفصیل آجتک نہیں شائع کی گئی حالانکہ دارالعوام میں بار بار سوالات کے ذریعے دریافت کرنیکی کوشش کی گئی کہ جن اعداد و شمار کی بنا پر اور جس طریقہ پر وائسرائے نے اپنا اوسط نکالا تھا وہ ظاہر کر دیے جائیں" (صفحہ ۴۴ ڈگبی پراسپرس انڈیا)

بہرحال اگر سرکاری تخمینہ کو تسلیم کرلیا جائے تو تیس روپیہ سالانہ یا ڈھائی روپیہ ماہوار یا پانچ پیسہ روپیہ کی آمدنی سے کوئی شخص آج سے پچیس برس پیشتر بھی جب گرانی اتنی زیادہ نہ تھی کیونکر اپنی ناگزیر ضروریات کو بھی پورا کرسکتا تھا! یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان کی ۵۰ فیصدی کے گذر اوقات کا واحد ذریعہ اس وقت بھی (جب لارڈ کرزن نے فی کس تیس روپیہ سالانہ کا اوسط نکالا تھا) زراعت تھا۔ اور والنہ اسے موصوف کے تخمینہ کے مطابق اس وقت زرعی آمدنی کا اوسط فی کس بیس روپیہ سالانہ سے زیادہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو پچاسی فیصدی ہندوستانیوں کی اوسط آمدنی کل ۱½ ۲ پیسہ یومیہ کی تھی۔ اگر ناگزیر ضروریات زندگی میں وہی چیزیں شامل کیجائیں جن سے روح اور جسم جدا نہونے پائیں تو دو وقت پیٹ بھرنیکے لئے اناج اور اسکے ساتھ نمک اور ایک چادر بھی تو سردیوں میں جسم پر ڈالنے کے لئے ان داموں میں میسر نہیں آسکتی تھی! یہ غربت نہیں تو زندگی اور کس حالت پر اس لفظ کا اطلاق ہوسکتا ہے؟

جنگ کے زمانہ میں اور جنگ کے بعد بھی ہندوستان کی معاشی حالت دریافت کرنیکی مختلف کوششیں کی گئیں۔ ۱۹۲۱ء آنریبل مسٹر ای ایم گک نے پچاس روپیہ فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط نکالا۔ حکومت مدراس کے محکمہ زراعت نے اس صوبہ کی کل زرعی آمدنی کا تخمینہ ۲۴۹ کروڑ روپیہ کیا۔ صوبہ مدراس کی کل آبادی کے ⅘ حصہ کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ زراعت سے ہے یعنی کل آبادی کا ⅕ حصہ زراعت پیشہ نہیں ہے چنانچہ غیر زرعی آبادی کی آمدنی کا تخمینہ انکی تعداد کے لحاظ سے زرعی آمدنی کا ۴۰ فیصدی کیا گیا۔ لہذا کل آمدنی زرعی اور غیر زرعی ۳۴۴ کروڑ روپیہ سالانہ ہوتی ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق صوبہ مدراس کی آبادی ۴ کروڑ ۲۳ لاکھ تھی اس طرح اگر کل آمدنی کو اس آبادی پر تقسیم کیا جائے تو فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط ایکسو روپیہ نکلتا ہے۔

صوبہ بمبئی میں مختلف گھرانوں اور خاندانوں کے حسابات آمد و خرچ کی تحقیقات اور مطالعہ کرنے کے بعد اس صوبہ کے افسران محکمہ مردم شماری نے یہ نتیجہ نکالا کہ شہری آبادی کی آمدنی کا اوسط سو روپیہ فی کس سالانہ تھا۔ (سنہ ۱۹۲۱ء میں) دیہی آبادی کی اوسط آمدنی ۷۵ روپیہ فی کس سالانہ اور ایسے علاقوں میں جہاں زمین اچھی نہیں ہے اور بارش کا بھی کوئی ٹھیک نہیں وہاں آمدنی کا اوسط ۴۳ روپیہ ۱۲ آنے فی کس سالانہ تھا در انحالیکہ آمدنی کے مقابلہ میں فی کس سالانہ خرچ کا تخمینہ اوسطاً ۴۴ روپیہ تھا، گویا ایک بہت بڑی آبادی قوت لایموت حاصل کرنیکے لئے مجبور ہے کہ قرض لیکر زندگی کے دن گذارے۔

اوسط آمدنی کے تخمینوں میں (جنکا ذکر اوپر کیا گیا ہے) اعداد جس طرح بتدریج بڑھے ہیں انپر غور کرتے ہوئے دو باتیں نظر انداز نہ کرنا چاہئے ورنہ اپنی معاشی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اول یہ کہ ہندوستانی کسانوں کی روزمرہ زندگی میں زر کے استعمال کی بہت کم نوبت آتی ہے ہر کسان اپنی ضروریات زندگی خود پیدا کرتا ہے اور سال بھر کے کھانے کا انتظام کرنے کے بعد اگر کچھ فاضل بچتا ہے تو اسکو بیچ ڈالتا ہے لیکن وہ بھی اکثر اپنی مرضی اور خواہش سے نہیں بلکہ اپنے مہاجن کے ڈر اور دباؤ سے یا زمیندار کا لگان ادا کرنے کیلئے، دوسرے یہ ہے کہ قیمتوں میں جو عام اضافہ برابر ہو رہا ہے اسکا بھی اس آمدنی کے مقابلہ میں خیال رکھنا چاہئے ذیل میں ایک نقشہ بعض اشیاء و اجناس کی قیمتوں کے انڈکس نمبر کا درج کیا جاتا ہے۔ اس سے قیمتوں کے اضافہ کی کیفیت واضح ہو جائیگی۔

اشیاء	۱۹۰۰	۱۹۰۵	۱۹۱۰	۱۹۱۲	۱۹۱۶	۱۹۱۸	۱۹۱۹
گیہوں	۱۰۶	۸۴	۱۰۹	۱۰۷	۱۲۸	۱۴۹	۲۱۱
رنگونی چاول	۹۴	۷۵	۹۰	۱۲۴	۱۰۱	۸۸	۱۳۱
دیسی چاول	۸۳	۸۶	۹۹	۱۱۷	۱۲۷	۱۰۹	۱۷۰
سوتی کپڑا	۹۲	۱۰۰	۱۱۸	۱۱۵	۸۰	۱۴۱	۱۰۶
ریشمی کپڑا	۹۱	۹۶	۱۱۴	۱۱۹	۱۲۶	۱۹۵	۳۲۲
نمک	۹۵	۹۶	۱۰۸	۱۰۰	۱۹۸	۴۹۶	۳۳۰
اسٹک	۰	۱۱۸	۱۰۶	۱۰۱	۱۷۵	۱۵۸	۲۳۲
مٹی کا تیل	۱۰۹	۹۰	۱۰۸	۱۱۰	۱۲۴	۱۸۹	۲۲۰
اوسط	۹۶	۸۰	۱۰۷/۵	۱۱۳/۶	۱۲۴/۶	۲۰۳	۲۳۷/۵

نقشہ سے معلوم ہوگا کہ اجناس کی عام قیمتیں بیس برس کے اندر تقریباً ڈہائی گنی ہوگئی ہیں۔ اس لئے اگر آمدنی میں کچھ اضافہ ہوا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ روپیہ کی قوت خرید بھی تقریباً ۶۰ فیصدی گھٹ گئی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ قیمتوں کا اضافہ مستقلاً قائم رہنے والا نہیں ہے جنگ کے زمانہ میں خصوصی اسباب کی وجہ سے قیمتیں بڑھ گئی تھیں اور اب پھر پرانی سطح پر آجائینگی۔ چنانچہ جوشی اور واڈیا نے اپنی ایک حال کی تصنیف میں ۱۹۱۲ء-۱۹۱۳ء کے خالص پیداوار کی بنیاد پر فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط نکالا ہے اور انکی تحقیقات کے مطابق ۴۴ روپیہ ۵ آنہ ۶ پائی کا اوسط نکلتا ہے لیکن وہ لکھتے ہیں کہ "اگر ہم جنگ کے زمانہ میں جو قیمتیں بڑھ گئی ہیں انکا خیال رکھکر بھی حساب لگائیں تو فی کس اوسط آمدنی ستر بہتر روپیہ سے زیادہ نہیں ہوسکتی ہے لیکن ان اعداد سے اس

1. Kale: Indian Economics. P.645. 2. Wealth of India

دہوکے میں نہ پڑنا چاہئے، کہ آمدنی میں کوئی واقعی اضافہ ہوا ہے۔ جہانتک زرعی آبادی کا تعلق ہے (اور جو اکثریت میں ہے) انکی حالت قیمتوں کے بڑہجانے کی وجہ سے نہایت ابتر ہوتی جاتی ہے[1]۔"

یہاں تک تو اُن تخمینوں کا ذکر تھا جو وقتاً فوقتاً تمام ہندوستان کی اوسط آمدنی کے متعلق کئے گئے ہیں اور جن سے ہندوستان کی عام غربت اور افلاس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا تھا ہندوستان کی غالب آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے اور ہندوستانیوں کی غربت اور افلاس کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد وہی بے زبان بھوکوں کے مارے اور برہنہ جسم دیہاتی ہوتے ہیں نہ کہ بمبئی اور کلکتہ کے بڑے بڑے دوکاندار، یا پنجاب کے ساہوکار، یا صوبہ آگرہ کے زمیندار اور تعلقہ دار۔ بعض محققین نے دیہاتوں کی معاشی زندگی کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور انہوں نے جو دردناک تصویر دیہاتوں کی زندگی کی پیش کی ہے اس سے ہمارے افلاس کی حالت اور اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ہرلڈ مان نے چند ہندوستانی دوستوں کی معیت میں صوبہ بمبئی کے دکنی علاقہ کے بعض دیہاتوں کی معاشی تحقیقات کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایکسو گیارہ گھروں میں سے ایکسو تین کی اوسط آمدنی ۲۱۸ روپیہ سالانہ یا ۴۴ روپیہ فی کس سالانہ ہوتی ہے اور یہ رقم ڈاکٹر صاحب موصوف کی رائے میں انسان کی قوت لایموت کیلئے بمشکل کافی ہوتی ہے۔ موضع پیپلد سوداگر (ضلع پونا) کی معاشی تحقیقات کرنیکے بعد ڈاکٹر ہرلڈ مان کو معلوم ہوا کہ وہاں ۲۵ آدمیوں کی اوسط آمدنی ۷۷ روپیہ فی کس تھی، ۱۲۷ آدمیوں کی ۶۲ روپیہ فی کس اور بقیہ ۳۵۲ آدمی جنکی آمدنی صرف ۳۲ روپیہ فی کس تھی وہ انتہائی افلاس اور تباہی کی حالت میں دن گذارتے تھے۔ اس لئے کہ یہ رقم

---

[1] ویلتھ آف انڈیا صفحہ ۱۰۸

2. Harold Mann: Land & Labour in Deccan Villages No I

پیٹ بھر کھانیکے لئے بھی کافی نہ تھی۔ اسی طرح ایک اور موضع کی حالت معلوم ہوئی کہ وہاں ۵ فیصدی خاندان بڑی مصیبت اور تنگی کی زندگی گذارتے تھے

صوبہ مدراس میں ڈاکٹر گلبرٹ سلیٹر نے اپنے طور پر معاشی تحقیقات کی اور اس صوبہ کی فی کس آمدنی کا اوسط ۲۰ روپیہ سالانہ بتلایا۔ اور کہا کہ "ہندوستان ایک متمول ملک ہے لیکن مفلسوں سے آباد ہے" اس کے بعد ڈاکٹر سلیٹر نے اپنی تفصیلی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اگر کل آبادی کو دیکھا جائے کیا غریب کیا امیر تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اس کا ⅘ حصہ اناج (مثلاً گیہوں، چاول اور کودوں) پر صرف ہوتا ہے اور باقی ۲ پنس یا دو آنہ فی کس روزانہ بچتے ہیں جس میں ہر قسم کی دیگر ضروریات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ان ضروریات میں روٹی کے ساتھ کھانیکے لئے نمک اور دال بھی شامل ہے اس کے علاوہ کپڑا، دوا علاج، گھربار، خیرخیرات، رسوم اور تہوار، بیاہ شادی کے خرچ، اور چونکہ پان تمباکو، اور تاڑی ایک کثیر آبادی کیلئے عادت ثانیہ بن گئی ہے جس کا خرچ بعض دیگر اشد ضروریات پر بھی مجبوراً مقدم کیا جاتا ہے اس سے یہ خرچ اور اسی طرح کے اور تمام احتیاجات کیلئے صرف ۲ر فی کس روزانہ ملتے ہیں یہ حالت متوسط الحال غربا کی ہے۔ اس لئے غریب ترین طبقہ کی حالت کا خود اندازہ کیا جاسکتا ہے"[1]

انڈین سول سروس کے ایک رکن مسٹر جی سی جیک جو اس احساس کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں کہ انکے ہموطنوں کے طرز حکومت پر (جہانتک کہ ہندوستان کی معاشی حالت کا تعلق ہے) تھوڑے عرصہ سے بہت حملے کئے جارہے ہیں یہ امید کرتے ہیں کہ جو اعداد و شمار انہوں نے جمع کرکے ترتیب دئے ہیں ان سے حکومت کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ کرنے میں غالباً بہت مدد ملے۔ انکی تحقیقات کے نتایج بھی قارئین کے سامنے پیش ہیں۔

1. Slater's Introduction to Economic conditions by P. Pillai. 225.

مسٹر جیک نے صوبہ بنگال کے ضلع فریدپور میں خود تحقیقات کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ زراعت پیشہ آبادی کا ۵ر ۴۹ فیصدی حصہ فراغت سے زندگی بسر کرتا ہے ۵ر ۲۸ فیصدی کسی قدر تکلیف کی حالت میں ہے۔ ۱۰ فیصدی کی اکثر ضروریات پوری نہیں ہوتی ہیں اور چار فیصدی بالکل مفلسی کی حالت میں ہے" پہلے درجہ کے لوگوں کی آمدنی کا اوسط ۵۰ روپیہ فی کس سالانہ بتلایا جاتا ہے۔ دوسرے درجہ والوں کا ۴۳ روپیہ، تیسرے درجہ والوں کا ۳۲ روپیہ اور چوتھے درجہ والوں کا ۲۰ روپیہ سالانہ، آمدنی کی ان رقوم سے قارئین خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مسٹر جیک جنکی نہ صرف غیر جانبداری بلکہ ایک حد تک اپنے ہموطنوں کی ہمدردی اور حمایت کا جذبہ مسلم ہے وہ بھی جو اعداد و شمار پیش کرتے ہیں ان سے ہماری معاشی حالت کچھ زیادہ بہتر یا قابل اطمینان نظر نہیں آتی۔

ایک طریقہ اور ہے جس سے کسی جماعت کی معاشی حالت دریافت کیجا سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ مختلف خاندان اور گھرانے اپنی اپنی آمدنیوں کو کیونکر صرف کر سکتے ہیں۔ علماء معیشت نے تجربہ اور تحقیق سے یہ دریافت کیا ہے کہ غریب خاندانوں میں عموماً آمدنی کا زیادہ حصہ کھانے اور پیٹ بھرنے پر صرف کیا جاتا ہے۔ باقی صحت، تعلیم اور تفریحات وغیرہ پر بہت کم خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن جس قدر خوش حالی بڑھتی ہے اسی لحاظ سے کھانے پر فیصدی خرچ کم ہوتا جاتا ہے۔ لباس، کرایہ مکان، روشنی اور ایندھن پر مصارف تقریباً یکساں رہتے ہیں اور صحت، تعلیم، اور تفریحات پر خرچ برابر بڑھتا جاتا ہے۔ پروفیسر رادھاکمل مکرجی نے بہت سے ہندوستانی خاندانوں کے حسابات آمد و خرچ کا اسی نقطۂ نظر سے عرصہ تک مطالعہ اور تحقیق کرنیکے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ حسب ذیل نقشہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی ہماری غربت اور افلاس صاف نظر آتا ہے۔

مختلف پیشہ کے لوگوں کی آمد کا فیصدی خرچ[1]۔

	مزدور	کسان	بڑھئی	لہار	بساتی	متوسط الحال
کھانے پر	۹۵٫۴	۹۴	۸۳٫۵	۷۹	۷۷٫۷	۷۴
لباس پر	۴	۳	۱۲	۱۱	۹	۴٫۷
دوا علاج "	—	۱	۱٫۵	۵	۵٫۹	۸
تعلیم "	—	—	—	—	۱	۳٫۳
رسوم وتہوار	٫۶	۲	۲	۴	۵	۸
تفریحات "	—	—	۱	۱	۱٫۴	۲
میزان	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰

اسی طرح مختلف طریقوں، مختلف حالتوں اور مختلف اوقات میں جو تحقیقات کی گئی ہیں اُن سے ہر سمجھدار شخص صرف ایک نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کی غربت اور انکا افلاس انتہائی درجہ کو پہنچ گیا ہے۔ یہی گھن اور یہی روگ ہے جو ہماری قومی اور جماعتی زندگی کو رفتہ رفتہ تباہ کرتا جا رہا ہے اور دوسری اقوام کے مقابلہ میں ہماری حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا معیار زندگی گرتا جا رہا ہے اور روحانی و جسمانی بیماریاں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔

دوسرے ممالک میں فی کس سالانہ آمدنی کا جو اوسط ۱۹۱۴ء میں تھا وہ ذیل میں

---

1. K. Mukerji: Foundation of Indian Economics P. 57

درج کیا جاتا ہے[1] اس کے مقابلہ میں اپنی معاشی حالت کا اندازہ اور بھی اچھی طرح ہوسکتا ہے۔

ملک	آمدنی	ملک	آمدنی
۱۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۸۰۰ روپیہ فی کس سالانہ	۶۔ جرمنی	۴۵۰ روپیہ فی کس سالانہ
۲۔ برطانیہ	۷۵۰ " " "	۷۔ اٹلی	۳۴۵ " " "
۳۔ آسٹریلیا	۸۱۰ " " "	۸۔ اسپین	۱۹۵ " " "
۴۔ کناڈا	۶۰۰ " " "	۹۔ جاپان	۹۰ " " "
۵۔ فرانس	۵۷۰ " " "	۱۰۔ ہندوستان (تخمینہ وادیا جوشی)	۴۵ " " "

اب سوال یہ رہجاتا ہے کہ ہمارا ملک باوجود اپنے قدرتی ذخائر اور زمین کی زرخیزی کے اور باوجود اتنی کثیر زراعت پیشہ آبادی کے جس کی جفاکشی اور محنت ضرب المثل ہے۔ دنیا کا غریب ترین ملک کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب تفصیل اور تحقیق کیساتھ انشاء اللہ ہم دوسرے مضمون میں پیش کرینگے۔

---

1. Wadia & Joshi: "Wealth of India"
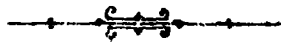
بدمعاش

ایک بہت ہی دبلا پتلا چھوٹے سے قد کا کسان جس نے ایک دھاری دار قمیص اور پیوند لگا ہوا پاجامہ پہنے تفتیش کرنے والے حاکم کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے چہرہ پر بال بہت بڑھے ہوئے اور جگہ جگہ چیچک کے داغ ہیں۔ آنکھوں کو گھنی گھنی اور ابھری ہوئی بھووں نے چھپا سا لیا ہے۔ اور ان میں ایک عجیب المناک کیفیت سی پیدا کردی ہے۔ سر پر بہت گتھے ہوئے بالوں کی ایک جھاڑ جھنکاڑ سی ہے جس نے اسکے چہرہ کی بگھیڑ کو کڑی سے بہت کچھ شاہ بنا دیا ہے۔ یہ ننگے پاؤں ہے۔

حاکم یوں سلسلہ گفتگو شروع کرتا ہے " دنیس گریگوریف! ادھر بڑھو اور میرے سوالات کا جواب دو۔ بتاریخ ہفتم ماہ جولائی حال بوقت صبح چوکیدار ریلوے لائن ایوان سمیونوف اکن فوف نے دوران گشت میں تکلوی نمبری ایک سو اکتالیس پر ایک ڈھبری کھولتے ہوئے پایا جس سے پٹریاں تختہ چوبی پر بستہ ہوتی ہیں۔ وہ ڈھبری دیکھو یہ ہے۔ چوکیدار نے بشمول اس ڈھبری کے تمہیں حراست میں لے لیا۔ کیوں ایسا ہوا؟"

کسان "کیا۔۔۔۔آ"

حاکم "اکن فوف نے جو کچھ بیان تحریر کرایا ہے بات وہی ہے نہ؟"

"سچ۔ جی بات ہے"

"بہت ٹھیک - اچھا تو تم نے اس ڈہیبری کا سرقہ کیوں کیا؟
"کیہ..... آ"

اپنی اس "کیا" کو بس ختم کرو - اور میرے سوال کا جواب معقول دو تم یہ ڈہیبری کیوں کھول رہے تھے؟

کسان نے کچھ کرہ کی چھت کی طرف دیکھ کر نہایت کرخت آواز میں کہا: "ہر دو کام اُنکو تھا - ناہیں تو ہم کا ہے کا کھولیں -
"یہ ڈہیبری نہیں کس لئے درکار تھی؟"
"جا ڈہبری؟ جا سے ہم جنسی کا بوجھ بناوت ہیں"
"یہ ہم کون؟"
"جی، ہم سب - جی بکلیمو کے کمیتر"

"بھلے آدمی سنو میرے سامنے احمق تو مت بنو سمجھ کی باتیں کرو - یہاں وزن زن بنانے کے متعلق جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا"

"ہم نے جُھٹ پن سے جھوٹ ناہیں بولو، اب ہم جھوٹ بولت ہیں ......"
پھر ذرا پلکیں مار کر دبی ہوئی شکایت آمیز آواز میں: "سرکار کیا بے وجن کئی کام چلائے لیت ہیں دیکھو صاب، ہم نے کانٹے میں جیتا چارہ لگا دیو۔ تم جانو جھینگر تو جے بے وجن تھوڑی ڈوب جات ہے ..... ہم جھوٹ بولت ہیں .. ... بوجھو کیڑا ڈوبی ناہیں اوپر پیرتا رہو تو کیا پھاندہ؟ ایجی مچھری تو سب تھا ہے ہی لگت ہیں سو کبھی کبھی ہیاں ہمری دریا میں تو چھوٹی مچھری ہئے ناہیں جے پیلو بھیو پانی چاہت ہے"
"یہ مجھے ساری مچھلیوں کی داستان کیوں سنا رہے ہو؟"

"کیسے آ؟ کیوں۔ سرکار خدا اپنے آپ ہی پوچھت رہیں۔ ہمری طرف سرکار لوگ بھی مچھری پکڑت ہیں۔ بڑے وجن بنا تو ننھے ننھے چھوکرا بھی مچھری مارن ناہیں جات ہیں۔ جون کچھو سمجھی ناہیں بوچا ہے بنا وجن مچھریاں مارن کو نکہے۔ سو سرکار سگلے سڑی کو تو پھلیک ناہیں۔"

"اچھا تو تمہارا بیان ہے کہ تم نے یہ ڈھبری پنی پٹری کا وزن بنانے کے لئے کھولی؟"

"اور ناہیں تو؟ ہم انٹ تھوڑی کھیات ہیں جون اس مارے ڈھبری کھولیں۔"

"لیکن تم اس کام کیلئے سیسہ لے سکتے تھے، یا کوئی اور گولی، یا کسی قسم کی کیل۔۔۔"

"سیسہ کچھو سڑک پر پڑو تھوڑی ملت ہے۔ مول لینا پڑت ہے۔ اور کیل کسو کام کی ناہیں۔ بس یو تو ڈھبری ٹھیک رہت ہے باسے بڑھ کے کچھو ناہیں جاہیں بوجھ ہوت ہے اور بیچا بیچ میں چھید رہت ہے۔"

"بیوقوف بنا ہی چلا جاتا ہے جیسے ابھی کل کا بچہ ہے یا ابھی آسمان سے ٹپکا ہے۔ کندۂ ناتراش تو یہ نہیں سمجھتا کہ ان ڈھبریوں کے کھولنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر مجھے چوکیدار نے نہ دیکھ لیا ہوتا تو ممکن تھا کہ گاڑی پٹری سے اتر جاتی اور آدمیوں کی جانیں تلف ہوتیں۔ گویا تم آدمیوں کو قتل کرتے۔"

"دیا رے دیا، رام دہائی۔ ہم کاہو کا ہے کو قتل کرن لاگے۔ ہم کو کا اینٹ۔۔۔ لوگ تھوڑی ہیں سرجو را رام چندر جی کی کرپا سے ساری عمر گجری، ہم نے تو سپنے ماں بھی کبھو سے کام ناہیں کیو۔ درگا جی کی دہائی حجور سے کیا کہت ہیں۔"

"اور نہیں تو تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ ریل گاڑی کے حادثات کا ہے سے وقوع پذیر ہوتے ہیں؟

جہاں وہ تین ڈبیہ یاں کھلیں بس ایک حادثہ موجود ہے ۔"

ڈینس کچھ سمناتا اور اپنی آنکھیں عدم تیقن کے انداز سے حاکم کے چہرہ پر جاتا ہے ۔

"کیوں بھلا ؟ برسا برس سے ہمارے گاؤں والے ڈبیری کھولت ہیں اور سب بھگوان

کی کرپا ہے۔ مجبور ہادتو بادثواور پران مارن کی بات کرت ہیں۔ ہم ایک پتھری اٹھا

لیجات ہیں لیکن لے لکڑی کا بڑو سا بوٹا وہ رہ دیت رہیں تو پتہ ہے گاڑی ھلٹی الٹ جائے

پڑے ۔ ۔ ف ف ۔ ایک ڈبیہ پاسے ؟"

لیکن تمہارے فہم میں یہ امر آنا چاہئے کہ ڈبیری پٹڑی کو سلیپروں سے جکڑتی ہے ؟"

"جے ہم جانت ہیں ۔ ۔ ہم ساری ڈبیریاں تھوڑی کھول لیت ہیں۔ کوئی لگی بھی

بہت ہیں ۔ سو جب ۔ ۔ ۔ ہم سب کچھ تھوڑی کرت ہیں۔ حجور ہمو سمجھت ہیں "

ڈینس جمائی لیتا ہے اور منہ پر صلیب کا نشان انگلی سے بناتا ہے ۔

حاکم ۔ پچھلی مرتبہ گاڑی اس جگہ پٹڑی پر سے آرہی تھی ؟ اب اسکی وجہ دریافت ہوئی "

"حجور کیا کہت رہیں ؟"

میں تمہیں بتارہا ہوں کہ گذشتہ سال گاڑی کے پٹڑی پر سے اترنے کی وجہ اب میری

سمجھ میں آئی ۔ میں سب سمجھتا ہوں "

حجور سارے پڑھے گئے لوگ جائی کام کے لئے ہیں۔ ساری سرکاری لوگ جانئے

سمجھن کے لئے ۔

پر مانا کھوب جانت ہے کہ نہیں سمجھ دے۔ حجور نے تو سب کچھ پوچھو دریافت کیو اپنی

اکل پر جور دیو پر ۔ ۔ ۔ جو کھر ہے جے چوکیدار جے تو ہمو جیو کھیتر ہے نہ سمجت ہے نہ بوجھت

ہے ؟ اس گدی میں ہاتھ دیو اور دیکی دھکا اور یہاں لا کے کھڑا کر دیو ۔ ۔ ۔ حجور پہلے

اپنی اکل لڑالیویں تو ہم کو بتا دے ویں۔ جے کہاوت تو سرکار جانت ہیں "کھیتی کی اکل
بن کھیتی کی اکل ہووت ہے اور مجبور رہا ہیں لکھ دیویں اُن نے ہیں دھکّن ناروجنڑ ہیں اور
چھاتی ہے۔"

"جب تمہارے جھوپڑے کی تلاشی لی گئی تو اس میں ایک ڈھبری اور ملی۔ تم ڈبریں جگہ
سے کھولی تھی اور کب؟"

"کون دوسری ڈھبری۔ بوجو لال صندوکچیا کے تلے پڑی ہت تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ کہاں پڑی تھی بس ہاں تمہارے جھوپڑے میں ملی۔ بتاؤ تم نے اسے
کہاں سے کھولا تھا؟"

"با کو ہم ناہیں کھولو۔ بوجو کا نڑھے متیاں کا لڑکا ہے اگن تکا جانے ہم کو دی ہے۔
بوجو صندکچیا تلے پڑی بھی تھی۔ بو اگن کے کونا والی ہو تو ہم نے اور متروفانوں دونن نے
اکھٹا مل کے کھولی رہے۔"

"کون متروفان؟"

"متروفان پتیرد! اجور جا کو نام ناہیں سنو رہیں؟ ہم سے کھیڑا ایں جال بناوت ہے
جال۔ سرکار لوگ کھریدت ہیں اکیّی ہات بیچت ہیں۔۔ اس کو ڈھبری بڑی چھینٹی رہت ہیں
یوں سمجھو صاب کہ ایک جال میں دس ڈھبری۔"

"سنو! قانون تعزیرات کے دفعہ ۱۰۸۱ کی رو سے ریل کی پٹڑی کی برائیسی بالارادہ
ضرر رسانی کے لئے جس سے اس پٹڑی پر آمد و رفت معرض خطر میں آ جائے اور ملزم کو علم ہو کہ
اس سے کوئی حادثہ وقوع میں آ سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ سمجھتے ہو؟ علم ہو! اور تمہیں ضرور علم ہونا
چاہئے تھا کہ ڈھبری کھولنے سے کیا نتیجہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ تو مجرم حبس دوام کا مستوجب ہے"

" سرکار ٹھیک جانت ہیں۔ ہم بیکوف لوگ ہیں، ہم کیا جانیں؟ "

"تم سب سمجھتے ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ بنتے ہو"

" ہم کاہے کو جھوٹ بولن لگے۔ سرکار اکین نہ کریں تو کھیڑا کے کسانوں سے بوجھ لیں بے وجن تو سرکار بس بھنگا پکڑا تے دیوت ہیں۔ سٹری سی مچھری لک بے وجن ہات ناہیں لگت ہے۔

حاکم مسکراکر: " اچھا تو جھنیگا ہوچکا، اب کچھ ننگی کے متعلق سناؤ "

" ہمرے اوہر تو ننگی ہوت ہی ناہیں ہے۔ بے وجن کی ڈوریں ہم تتریا لٹکا کے پھنکت ہیں۔ باہیں کبھو کبھار ننھی تیری مچھریا لگ جاوت ہے، برے بس یو ہیں کبھو کبھار "

حاکم: " بس ختم کرو۔ ۔ ۔ زبان بند "

ایک خاموشی سی چھا جاتی ہے ڈینس کبھی ایک پاؤں پر اپنا بوجھ دیتا ہے کبھی دوسرے پر۔ سبز کپڑے سے ڈھکی ہوئی جو میز سامنے پڑی ہے اسکی طرف دیکھتا اور جلدی جلدی پلکیں مارتا ہے گویا اسکی آنکھوں کے سامنے سبز کپڑا نہیں سورج کی تیز شعاعیں ہیں۔ حاکم تیز تیز کچھ لکھ رہا ہے۔

ڈینس ایک طویل خاموشی کے بعد پوچھتا ہے " ہم جاویں "

" نہیں میں تمہیں حراست میں لیکر جیلخانہ بھیجتا ہوں "

ڈینس کی پلکیں اب نہیں چلتیں اور یہ اپنی گھنی گھنی ابروؤں کو اوپر اٹھا کر حاکم کی طرف تجسس آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے۔

" کیسے؟ کیا مطلب؟ جیلخانہ۔ ۔ ۔ کو؟ سرکار ہمرے کنے بھالو وخت ناہیں ہے

ہم میلا کو جاوت رہیں۔ یگور کے سے تین روبل چرہی کھریدیں باسطے لین کو ہیں ۔۔۔۔ اور"

"بس منہ بند۔ بیچ میں مت بولو"

"جیلخانہ کو؟ کسی بات کے مارے جانو ہوئے تو ہم جاویں۔ برے ایسے ہی نہ کچھ کام نہ کاج۔ کس مارے؟ ہم جانت ہیں ہم نے کسو کو کچھو چھینو چرایو ناہیں، کسو کو مار پیٹو ناہیں۔ ۔ ۔ اور جو سرکار رنگان کے مارے کچھو سمجھت ہیں تو نجو مکھیا کی بات ناہیں سنیں۔ سرکار مختار سے دریافت کرلیں۔ جے مکھیا، جے۔ جے تو کوسیطان ہے، یکو۔"

"زبان بند رکھو"

ڈینس بڑبڑا کر ۔ ۔ ۔ "ہمری جیب جیسی ہے ہم ہا کو تو تھامے ہیں۔ برے جا کی تو ہم قسم اٹھاوت ہیں۔ اس مکھیا نے تو جھوٹ بولو یہ بولو۔ ۔ ۔ ہم تین بھیا ہیں تین۔ کزما گریگوریو، پھر یگور گریگوریو اور ہم ڈینس گریگوریو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

حاکم۔ (چلا کر) "تم میرا حرج کرتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ سپاہی! اسے لے جاؤ"

دو قد آور سپاہی ڈینس کو پکڑ کمرے سے باہر لیجاتے ہیں اور یہ بڑبڑائے جاتا ہے!

ہم تین بھیا ہیں ایک بھائی کو کسور دوسرے یہ تھوڑی ہوت ہے۔ کزما اپنا لگان ناہیں دیوت ہے اس لئے ڈینس تمکو جواب دینو پڑے۔ سچ ہے! بڑو انصاپ ہے۔ ہمرے یہاں جنرل صاحب مرگئے اللہ انہیں جنت میں رکھے نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ انصاپ ذرا عکل سے کرنو چاہئے بس ایسی اوٹ پٹانگ ناہیں ۔ ۔ ۔ ۔ جی؟

تمہروجی چاہے تو کوڑے مارلیں سرکار برے اسکے جیسے پنچ مارنے چاہئیں جیسا کوڑے مارلو ابرے سچے من سے"

ہندوستان کا قدیم فن طب و جراحت

۲- علم جراحت

(از سعید انصاری بی ۔ اے جامعی)

اس مضمون کا پہلا نمبر جنوری سنہ ۱۹ء میں نکل چکا ہے، جو فن طب پر تھا، دوسرا
اب جا رہا ہے جو فن جراحت پر ہے۔ ہر دو مضامین اپنی اپنی جگہ پر مستقل ہیں،
اس لئے امید ہے کہ ناظرین کو تسلسل کا منقطع ہو جانا کچھ زیادہ ناگوار خاطر نہ ہوگا۔
اس مضمون کا پہلا نمبر نکلنے کے بعد بعض احباب شاکی تھے کہ میں نے ایک تعلیمی
غیر متعلق موضوع کیوں اختیار کیا۔ میں نے جیسا کہ گذشتہ نمبر کے اپنے تمہیدی نوٹ
میں اشارہ کیا تھا کہ قدیم ہندوستان کے علم و تہذیب پر خوش ہونے کا موجودہ
ہندوستان کے ہر شخص کو یکساں حق حاصل ہے اسی خیال نے مجھے اس مضمون کے دوسرے
نمبر بھی پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ نیز ایک غرض اس سے یہ بھی ہے کہ ابنائے وطن قدیم علم
و فن کو کس طرح ایک ایک کرکے تحقیق و جستجو کے بعد اجاگر کرتے ہیں۔ کیا ہم بھی خدمت
علم کیلئے ایسا کرنے کو آمادہ ہیں؟ اس خیال اور توقع کے بعد امید ہے کہ میری
یہ حقیر کوشش نامقبول نہ ہوگی۔ سعید

عام لوگوں کو شاید اس بات کا علم نہ ہو کہ علم جراحت کی ابتدا سب سے پہلے ہندوستان
ہی سے ہوئی۔ بڑے بڑے اعمال جراحیہ مثلاً اعضا کا کاٹنا، شانہ سے پتھری نکالنا، آنتوں
کا چیرنا وغیرہ وغیرہ، نیز ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اعمال جراحیہ مثلاً ہڈی جوڑنے اور جوڑ
بٹھانے کی ترکیبیں بھی یہاں کے ماہرین فن کو بخوبی معلوم تھیں۔ قدیم تصانیف میں آلات

جراحیہ کا جو بیان آتا ہے، اسے دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے۔ سشرت، اشٹنگ ہردے اور دوسری پرانی کتابوں میں اُن آلات کا ذکر جن سے کاٹنے کا کام لیا جاتا تھا اور اُن آلات کا ذکر جو کاٹنے کے کام نہیں آتے تھے، ان دونوں کی ایک طویل فہرست دی ہوئی ہے۔ ان آلات کی ترتیب و تقسیم ان کی شکل و صورت یا ان کے مقصد و غرض کے اعتبار سے کیگئی ہے۔ قدیم زمانہ کے علم جراحت کا اگر آج کل جدید علم جراحت سے مقابلہ کیا جائے تو لامحالہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ آجکل کے بہت سے آلات جراحیہ کا قدیم زمانہ میں بالعموم اور بکثرت رواج تھا۔ سشرت اور بھگوت نے تو بعض آلات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ انہیں اور موجودہ آلات میں کوئی فرق و امتیاز نظر نہیں آتا، مثلاً دانت اکھیڑنے کے زنبور، پتھری معلوم کرنے اور پیشاب نکالنے کی سلائیاں، نشتر وغیرہ بالکل آج کل کے جدید آلات کی طرح ہوتے تھے۔ ان کتابوں میں مختلف قسم کی پٹیوں کا بھی ذکر ہے جنمیں سے تمام قسمیں آج بھی استعمال کیجاتی ہیں اور بعض کا تو آج پتہ بھی نہیں۔ آلات کے متعلق ذیل کے تصریحات اور نقشے امید ہے کہ ناظرین کیلئے دلچسپی کا باعث ہوں۔

آلات

قدیم زمانہ میں تمام آلات جراحیہ بالعموم دو طرح کے ہوتے تھے ایک وہ جن سے اعضا وغیرہ کے کاٹنے کا کام لیا جاتا تھا، انہیں "شاسترا" کہتے تھے۔ دوسرے وہ جن سے کاٹنے کا کام نہیں بلکہ اور دوسرے قسم کے کام لئے جاتے تھے، انہیں "یانترا" کہتے تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے موخر الذکر آلات کا ذکر کیا جائے۔ جن کی چھ قسمیں ہیں تفصیل ذیل میں درج کیجاتی ہے۔

(۱) "سوستک یانترا"

(۲) "سندش یانترا"

(۳) "تال یانترا"

(۴) "ناڑی یانترا"

(۵) "شلک یانترا"

(۶) "اپ یانترا"

اس قسم کے آلات کی جو تشریح سشرت نے کی ہے وہ پڑھنے "سوستک یانترا" سے تعلق رکھتی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

"یہ آلات لمبائی میں تقریباً ۱۸ انچ ہونے چاہئیں اور ان کے پھل کیلوں سے آپس میں خوب جڑے ہوں۔ یہ کیلیں مسور کی دال کے برابر موٹی ہوں اور انکا دستہ اس طرح خم ہو کہ وہ انکشس کی طرح خوب مضبوطی کیساتھ ہاتھ میں آسکیں۔ ان کے منہ عموماً شیر، چیتے، تیندوے، گیدڑ اور عقاب وغیرہ کے منہ کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ اکثر جسم سے دو شلیہ (یعنی تیر یا برچھے کے پھل نکالنے کے کام آتے ہیں، جو بعض وقت ہڈیوں میں اٹک جاتے ہیں یا کبھی سڑی گلی اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے نکالنے کیلئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں"

(سشرت: "سترا ستھم" باب ہفتم)

بہت سے آلات درندوں اور پرندوں کے نام پر ہوتے تھے اور سشرت اور واگبھٹ نے جن جن درندوں اور پرندوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے آج اگر ہم سب سے نہیں تو اکثر سے ضرور واقف ہیں۔ ایسے آلات کی تقسیم انہوں نے مختلف شعبوں میں کی ہے جس کی تفصیل

نقشہ حسب ذیل ہے۔

۱ "سنگھ مکھ" یعنی "شیر دہن" آلات۔ ذیل کے شیر دہن زنبوروں کو دیکھو کہ کس قدر شیر کے منہ سے مناسبت رکھتے ہیں اور پھر اندازہ کرو کہ ان میں اور قدیم زمانے کے آلات میں کیا فرق رہا ہوگا۔

اس شعبہ میں اس قسم کے آلات بھی داخل تھے جن کے نام یہ ہیں "ویاگھر مکھ" یعنی چیتا دہن "ترکش مکھ" وغیرہ وغیرہ۔ تصویر سے دیکھو کہ ذیل کے آلات ان جانوروں کی شکل سے کس قدر ملتے جلتے ہیں۔
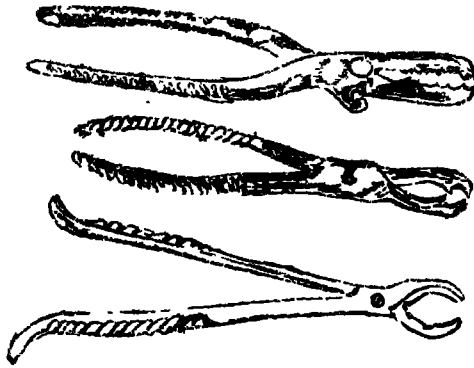
اب "رکش مکھ"۔ اس شعبہ کے اندر تمام وہ آلات داخل ہیں جو ریچھ کی صورت سے ملتے جلتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ریچھ کے منہ کا اگلا حصہ لمبا اور پتلا ہوتا ہے اور اس قسم کے تمام آلات جو آج کل دانت وغیرہ کے نکالنے میں کام آتے ہیں قدیم زمانہ کے زنبوروں سے بالکل مشابہ ہیں۔ ذیل کے نقشہ سے اس کا بہتر اندازہ ہو سکے گا۔
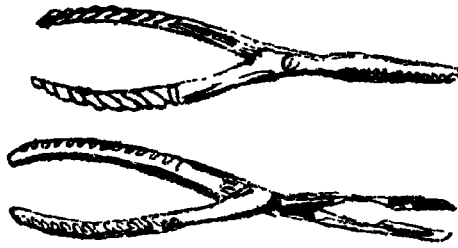
(ج) "کنک مکھ" یہ "کنک" ایک پرند ہے جو بنگال کے اکثر حصوں میں پایا جاتا ہے اسکی چونچ لمبی اور کسیقدر ٹیڑھی ہوتی ہے اور سرے پر آکر چمچہ کی طرح چپٹی ہوجاتی ہے۔ اس آلہ کے متعلق سشرت اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "گہرے زخموں میں سے اجسام خارجی کو پکڑنے اور حسب خواہش کھینچنے کیلئے تمام آلات میں "کنک مکھ" سب سے بہترین آلہ ہے "سشرت سترا ستھان" باب ہفتم"

(د) "شینا مکھ" یہ آلات عقاب کے چونچ سے بالکل ملتے جلتے ہوتے ہیں اور دانتوں کے نکالنے میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ آجکل کے دانت نکالنے کے زنبور بالکل اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ذیل کی تصویر خود بول رہی ہے کہ یہ آلات کسقدر اسم بامسمی ہیں۔
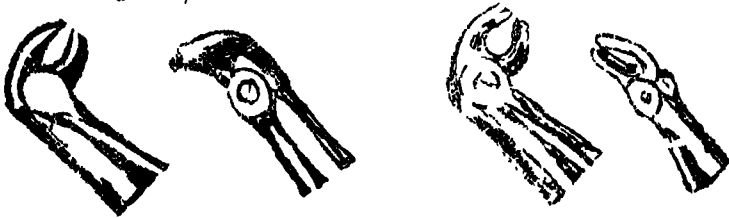
(ه) "کرونچ مکھ"۔ انکی شکل بگلے کے چونچ کی سی ہوتی ہے اور یہ ناک اور کان کی نالیوں سے اجسام خارجی کے نکالنے میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ بھگوت نے اس شعبہ کے اندر بعض ایسے آلات کا ذکر کیا ہے جن میں دانتوں کی قطاریں بنی ہوتی ہیں۔ ان اغراض

کیلئے جو آلات آج کل استعمال کئے جاتے ہیں اور جن کا نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ان سے اندازہ ہوگا کہ قدیم آلات بھی بالکل اسی شکل و صورت کے رہے ہوں گے۔
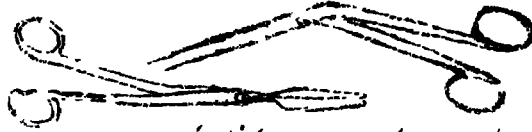
یہ بالکل آج کل کے ان زنبوروں کی شکل کے ہیں جو دانت اور ناک سے اجسام خارجی کے نکالنے میں کام آتے ہیں۔ درمیانی تصویر میں دیکھو کہ سشروت کے بیان کے مطابق کس طرح دانتوں کی قطاریں چلی گئی ہیں۔

۲۔ سندمش یانترا، دوسری قسم "سندمش یانترا" ہے۔ "سندمش" کے لفظی معنی ہیں موچنا یا چمٹا اور "یانترا" ایسے آلات کو کہتے ہیں جن سے اعضاء وغیرہ کے کاٹنے کا کام نہ لیا جائے۔ یہ آلات چونکہ اسی طرز کے بنے ہوتے ہیں اسلئے انکا یہ نام رکھا گیا۔ "سندمش" اور "سوستک" (جسکا ذکر اس سے قبل آچکا ہے) قسم کے آلات میں سب سے بڑا فرق یہ ہو کہ اول الذکر میں دونوں پھل چمٹے کی طرح ایک دوسرے کے تلے اوپر ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ثانی الذکر میں کے دونوں پھل قینچی کی طرح ایک دوسرے کے آر پار ہوتے ہیں۔ سشروت نے اسکی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ جس میں پکڑنے کے لئے جگہ بنی ہوتی ہے اور جسے سینگرہ کہتے ہیں اور دوسری وہ جسمیں کوئی جگہ نہیں ہوتی اور اسے "انیگرہ" کہتے ہیں یہ آلات ریشوں کے یا اینٹ اگر کوئی چیز چبھ جائے تو اسکے پکڑ کر کھینچنے کے کام آتے ہیں۔ ذیل کی شکلوں میں دیکھو کہ آج کل کے اس قسم کے آلات سے اُس زمانہ کے آلات کسقدر مناسبت و مشابہت رکھتے تھے۔
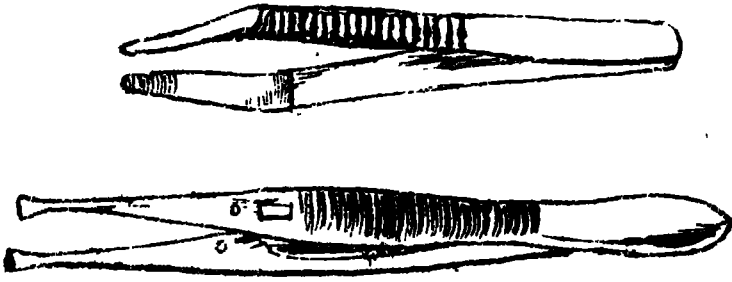
"سینگرہ" کی تعریف بعض قدیم کتابوں میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ "یہ ایک نہایت مختصر نازک سا آلہ ہوتا ہے جسمیں ننھے ننھے دانت بنے ہوتے ہیں اور جسمیں کپڑنے کیلئے بیچ میں جگہ بنی ہوتی ہے۔ یہ آلہ آنکھ کے نہایت نازک اعمال جراحیہ میں کام آتا ہے۔" دوسری قسم کا آلہ سشرت کے بیان کے مطابق ناخونہ اور موتیا بند کے آپریشنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دونو قسم کے آلات بھی آج کل کے اسی قسم کے آلات سے بالکل ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

۳۔ "تال یانترا" ان آلات کا یہ نام اس وجہ سے رکھا گیا کہ ان کے منہ تال یا جھیل کی مچھلیوں کے گلپھڑوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہ آلات کان، ناک اور بعض دوسرے اعضا کی نالیوں سے اجسام خارجی کے نکالنے میں کام آتے ہیں یہ لنبائی میں تقریباً ۹ انچ ہوتے ہیں۔ (سشرت: "ستر اشٹھم" باب ہفتم)

قدیم کتابوں میں ان آلات کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں، ایک وہ جنمیں ایک چمچہ ہوتا ہے، دوسرے وہ جنمیں دو چمچے ہوتے ہیں۔ ذیل میں اس قسم کے مروجہ آلات کی تصویریں دیجاتی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ مذکورہ صدر آلات ان سے کسقدر مشابہ ہوں گے۔

سشرت اور بھگوت دونوں نے بہت سے ایسے آلات کا ذکر کیا ہے

۴۔ "نڑیی یانترا" جنیں نلکیاں یا جوف ہوتی ہیں۔ اس قسم میں تمام نلکیدار سلائیاں پچکاریاں وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے نلکیدار آلات کا بھی جو اس قسم میں آتے ہیں بھگوت نے نہایت وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ذیل کی گیند نما پچکاری (بال اسپرنج) جو چرک اور سشرت کے زمانہ میں استعمال ہوتی تھی آج بھی کو بعینہٖ چین اور ہندوستان میں استعمال کی جاتی ہے۔ پچکاری زیادہ تر عمل (حقنہ) وغیرہ کے کام آتی ہے۔ ذیل کی شکل ملاحظہ ہو۔
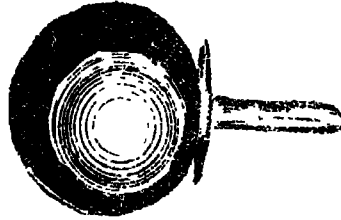
سشرت نے اس قسم میں جس وسعت سے کام لیا ہے اس کے لحاظ سے اس قسم کے آلات بھی "نڑیی یانترا" (نلکیدار آلات) میں داخل ہو جاتے ہیں جو زخم وغیرہ کے چوڑا کرنے میں کام آتے ہیں۔ ان آلات کے نقشے ذیل میں ملاحظہ ہوں۔
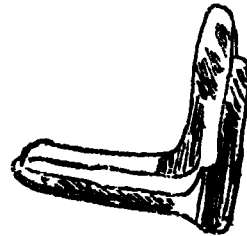
سشرت لکھتا ہے کہ اس قسم کے اندر سیدھے یا ٹیڑھے سب قسم کے آلات

۵۔ "شلاک یانترا" داخل ہیں۔ یہ متعدد قسم کے ہوتے ہیں اور مختلف کام آتے ہیں۔ کام

اور غرض کے اعتبار سے انکی لنبائی اور شکل میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ بعض کے منہ کیچوے کے منہ کی طرح کند ہوتے ہیں، بعض کے چپٹے اور تیر کے سرے کی طرح پھٹے ہوئے ہوتے ہیں، بعض کا منہ سانپ کے پھن کی طرح جھکے ہوتے ہیں، بعض کے مچھلی کے کانٹے کی مانند ہوتے ہیں غرض یہ تمام قسم کے آلات زخم کی گہرائی دیکھنے، اشیاء کے پکڑنے، کھینچنے اور نکالنے کے کام آتے ہیں۔ انہیں سے دو طرح کے آلات جنکا سرا موٹا اور ٹیڑھا ہوتا ہے کان اور ناک کی نالیوں سے اجسام خارجی کے نکالنے میں کام آتے ہیں۔ اور تقریباً چھ قسم کے جو بالکل سیدھے ہوتے ہیں اور جن کے سرے پر روئی کی پھریریاں لگی ہوتی ہیں، زخم کے پونچھنے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں تین آلے جو کسی قدر چمچے کی شکل کے ہوتے ہیں، دوائیں اور کاسٹک لگانے کے کام آتے ہیں تین آور ہوتے ہیں جن کے سرے کند ہوتے ہیں اور تین ایسے ہوتے ہیں جنکے منہ مڑے ہوتے ہیں اور یہ سب داغ دینے کے کام آتے ہیں۔ ایک آلہ ہوتا ہے جسکا منہ تیز پتے کیطرح ہوتا ہے اور جو ناک کے اندر رسولی کے کام آتا ہے۔ ایک دوسرا آلہ ہوتا ہے جس کے سرے پتلے اور باریک ہوتے ہیں اور جو آنکھ میں سرمہ لگانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک اور قسم کا آلہ ہوتا ہے جس سے پیشاب کی نالی صاف کیجاتی ہے یہ تمام آلے عمودی شکل کے اسقدر معروف اور عام ہوتے ہیں کہ یہاں انکی تصویریں دینے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ "آپ یا نتر" اس قسم میں کھپچیاں، پٹیاں، باریک کپڑے اور سینے پرونے کے تمام سامان داخل ہیں۔ اس زمانہ میں یہ کھپچیاں درخت کی چھال یا بانس وغیرہ کی بنتی تھیں، جو بہت ارزاں اور بآسانی دستیاب ہوسکتی تھیں۔

۵۔ شاستر، یا کاٹنے کے آلات ان آلات کی جیسا کہ سشرت اور بھگوت نے بیان کیا ہے، کئی قسمیں ہیں اور جن میں چاقو قینچیاں

تیز سلائیاں اور سوئیاں وغیرہ ہونا تو ضروری ہیں لیکن انکی بڑی کئی قسمیں ہوگئی ہیں اور آج کل کے مختلف قسم کے نشتروں، چاقوؤں اور سوئیوں سے بالکل مشابہ ہوتے ہیں۔ قدیم کتابوں میں ان آلات کا جس طرح سے ذکر ہے وہ آج کل کے ماہرین فن کی قوت تخیل کو حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ ذیل کے نقشوں سے اس زمانہ کے بعض آلات کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔

ان کے علاوہ جنین کے متعلق بھی بعض قدیم کتابوں میں بہت کافی معلومات ملتے ہیں۔ رحم کے اندر بعض وقت بچہ کی جو مختلف حالت ہوجاتی ہے اور اسکے درست کرنے کے لئے جو جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، وہ سب ان کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں علاوہ اس کے مختلف قسم کے آلات جو جنین کو کاٹ کر نکالنے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں، انکا بھی بیان موجود ہے۔ نیز زچہ خانہ کی صفائی اور دایاؤں کے متعلق بھی بہت سی ہدایات درج ہیں جنکا لحاظ آج کل نہیں رکھا جاتا ہے۔

انحطاط کے اسباب

۳۲۶ء ق۔م میں جب سے ہندوستانیوں پر یونانیوں کا حملہ ہوا ہے، اسوقت سے ہندوستان کی قسمت نے اتنی بار پلٹا کھایا ہے کہ ایک شخص جو ان واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے، اسے مشکل سے اس بات پر تعجب ہوگا کہ ہندوستان کے عروج و ترقی کا وہ آفتاب جو کبھی نصف النہار پر تھا، کیونکر ڈھل گیا۔ بلکہ فی الحقیقت جو امر موجب حیرت

سے وہ یہ کہ اس عروج و ترقی کے جو آثار اب تک باقی ہیں، وہ کیسے رہے۔ سب سے پہلے "ہندوستان پر سکندر اعظم نے حملہ کیا، اس کے بعد سیتھینوں کی تاخت و تاراج شروع ہوئی، جسکا اثر ابھی مٹنے بھی نہ پایا تھا کہ ٹڈی دل ہن آگئے اور انہیں سے بعض قوموں نے تو صدیوں تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ وحشت و جہالت کے اس دور میں ہندوستان کے قدیم علوم و فنون کا جو خزانہ تھا وہ سب تباہ و برباد کر دیا گیا۔ پانچویں صدی عیسوی میں جو وکرماجیت کا زمانہ تھا، ترقی و تمدن کی ایک ہلکی سی شعاع پیدا ہوئی لیکن وہ آفتاب علم و فن پھر دوبارہ نہ چمکا۔

لیکن سب سے برا زمانہ دیکھنے میں وہ آیا جب ہندوستان کے سب سے بڑے دشمن محمود[1] غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اس کے بعد جتنی سارسنوں نے ہندوستان کے بالائی نصف حصہ کو ہزاروں بار تاخت و تاراج کیا، قصبات و دیہات لوٹ کر جلا دیے گئے، سلطنتیں پارہ پارہ کر دی گئیں۔ یہاں تک کہ دکن اور بنگال بھی ان حملوں کی دستبرد سے کلیتاً محفوظ نہ رہ سکے۔ اس کے بعد جب اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے کر بتدریج امن زمانے آئے تو ترقی و زندگی کے کچھ آثار پھر نمودار ہوئے۔ لیکن اورنگزیب کے بعد سے پھر خوف و ہراس اور ہندوؤں سے نفرت اور علیحدگی کا دور شروع ہوا اور پھر اس کے بعد قتل و

---

[1] دو ڈھائی ہزار برس کے طویل زمانہ پر چند سطروں میں ایک سرسری اور عام نظر ڈالنے کی جو خرابیاں ہو سکتی ہیں، وہ یہی ہیں جو مصنف کے بعض بیانات سے آشکارا ہیں۔ محمود غزنوی ہو یا اسکندر اعظم، اورنگزیب ہو یا شیواجی اگر ان کے حالات زندگی اور کارناموں کو نظر غور دیکھا جائے تو ایسے بیانات کی ساری حقیقت کھل جائیگی اور یہ معلوم ہو جائیگا کہ ان غریبوں کا ہاتھ اسوقت کے تہذیب اور تمدن اور علم و فن کے مٹانے میں کہانتک تھا؟ باقی جہانتک تعداد بیرونی حملوں کا تعلق ہے وہ بیشتر حالات میں رحمت و برکت کا باعث ہوئے ہیں اور بعض صورتوں میں لعنت و مذمت کا باعث بھی بنتی ہیں جن کو کوئی ملک قوم اور تہذیب تمدن مستثنیٰ نہیں۔
سعید

غارت، بدامنی و بے چینی، بدنظمی و بے ترتیبی کا دور دورہ رہا جس میں علم و فن کی ترقی تقریباً نا ممکن تھی۔ اورنگزیب اور اس کے بعد خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار، آپس کی خانہ جنگیاں اور ہندو مسلمانوں میں باہم لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ ان حالات میں آیورویدکا دوبارہ احیاء قطعاً دشوار تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے برطانوی عہد حکومت میں بھی ہندوستان کے اس قدیم فن طب و جراحت اور اس کے طریقۂ علاج کی طرف حکومت کی کوئی توجہ نہ رہی اور نہ اس نے اس کی ترقی و احیاء کیلئے کوئی امداد و اعانت کی بلکہ مغربی تعلیم کے رواج پانے اور مشرقی علوم کے ترک کر دینے سے آیوروید کی تعلیم اور اس کے طریقہ علاج پر سب سے زیادہ ناگوار اثر پڑا۔ ان حالات و اسباب کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک مناسب ہوگا کہ ہندوستان کے قدیم فن طب و جراحت میں ترقی کی گنجائش نہیں ہے اور نہ اس میں زندہ رہنے اور بڑھنے کی کوئی صلاحیت ہے!۔

اس کے بعد مصنف نے آیوروید کی موجودہ حالت کو بیان کیا ہے اور آئندہ اسکی ترقی و عروج کی تدابیر بتائی ہیں، جن سے تاریخی حیثیت سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔

شذرات

ہندوستان کے طول وعرض میں جس کثرت سے اخبار و رسائل خاصکر مسلمانوں کے نکل رہے ہیں اور نئے نئے نکلتے آرہے ہیں انکی تعداد کو دیکھکر بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ ہملا ملک نہایت متمدن۔ خوش حال اور تعلیم یافتہ ہے۔ لیکن جب ان اخباروں لعد رسالوں کی اصلی کیفیت کو بنظر امعان دیکھئے تو اس بدقسمت ملک یا قوم پر رونا آتا ہے۔ نہ انکا کوئی اصول ہے۔ نہ کوئی غرض وغایت۔ نہ کوئی نظام ہے نہ کوئی ترتیب بلکہ اکثر حالتوں میں انکا وجود انکے عدم سے زیادہ بہتر نہیں بلکہ زیادہ مضر ہوتا ہے۔ کیونکہ انکے مدیر بالعموم اس علمی کام کے اہل نہیں ہوتے اور محض شکم پروری یا ایک پیشہ اور ذریعہ آمدنی سمجھکر اخبار یا رسائل نکالتے ہیں۔ الا ماشاءاللہ اخبار یا رسائل خرید کر پڑھنے والے ملک میں تھوڑے ہیں اور اہل قلم ان سے بھی کم۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر "مدیران" ایک طرف خریداروں کی جستجو میں گھومتے ہیں تو دوسری اہل قلم کو مضامین کی فرمایش سے تنگ بلکہ دق کرنا شروع کردیتے ہیں۔

چند ڈھلے ہوئے فقرے اور گھڑے جملے کبھی اس بہانے سے کہ ہم ایک جدید رسالہ نکالنے والے ہیں خصوصیت کیساتھ آپ کا ایک مضمون اسمیں ہونا چاہئے۔ کبھی عید نمبر یا رسول نمبر کے نام سے ان مخصوص لوگوں کو جن کے مضامین سے لوگ آشنا ہیں لکھتے رہتے ہیں آخر یہ علمی جزیہ یا دماغی خراج آدمی کہاں تک ادا کرے کیونکہ کوئی ہفتہ اس قسم کی فرمائشوں سے خالی نہیں جاتا۔ بعض حضرات تو "ستیاگرہ" کر لیتے ہیں۔ جواب نہ دو لیکن وہ ہفتہ یا مہینہ میں کوئی نہ کوئی خط مع اپنے اخبار یا رسالہ کے نمونہ کے بھیجا کرتے ہیں۔ بعض دورہ کرکے خود

پہنچتے ہیں اور مضمون کا تقاضہ شروع کر دیتے ہیں۔ پھر یہ فرمائشی مضامین یا جبریہ تحریریں بھی جیسی ہوتی ہیں ظاہر ہے۔

اس لئے ہم تمام جریدہ نگاروں سے التماس کرتے ہیں وہ اخبار یا رسالہ اپنی غرض و غایت متعین کر کے نکالیں۔ ضرورت ہو تو نکالیں۔ قومی و علمی خدمت کی صلاحیت ہو تو نکالیں اور اپنے یا اپنے خاص اعوان و انصار کے بھروسہ پر نکالیں۔ قلمی گداگری اور وہ بھی اس ابرام کے ساتھ ہرگز غیرتمند انسانوں کیلئے روا نہیں ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ حج میں جو ایک اہم رکن اسلام ہے امسال اطراف و اکناف عالم سے مسلمان کثرت سے جا رہے ہیں اور وہاں موتمر اسلامی کے انعقاد کیلئے ہر جگہ سے وفود بھی طلب کئے گئے ہیں جن سے ایک عام دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج کا بڑا مقصد اعلائے کلمۂ حق ہے جس میں تمام اقوام مسلمہ کے نمائندے شریک ہوں۔ باہم تعارف و تبادلۂ خیالات کریں ایک دوسرے کے تعاون اور تناصر کے ذرائع سوچیں۔

مدتہائے دراز سے یہ عظیم الشان فریضہ اس وجہ سے بالکل حقیر ہو گیا تھا کہ مسلمانوں نے اس کے اصلی مقصد کو فوت کر دیا تھا اب ہم کو توقع ہے کہ اسکی اصلی شان قائم ہو جائیگی اور اسلام نے جس فائدے کیلئے یہ فریضہ مقرر کیا ہے وہ فائدہ مسلمانوں کو اس سے پہونچیگا۔

حج کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر ملک سے جسقدر مسلمان جانیوالے ہوں وہ خود اپنے قافلہ کا ایک امیر حاج مقرر کریں جو نہ صرف اپنے اعوان و انصار کی مدد سے انکے سفر میں سہولتیں پیدا کرے بلکہ ان کو ساتھ لیکر جائے اور اس اسلامی مجمع میں انکی ترجمانی اور انکی

قائم مقامی بھی کرے۔

امسال چونکہ سلطان نے خود وفود طلب کئے تھے اس لئے یہ ایک ہنگامی اور عارضی امر ہے جس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ہر مسلمان جو حج میں جاتا ہے وہ بجائے خود نمائندہ ہے اور یہ جملہ اقوام مسلمہ کی موتمر ہے جس کیلئے کسی سلطان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ متعین کرسکے کہ فلاں ملک سے دو یا تین وفود آئیں۔

موتمر حجاز کا اصلی مسئلہ دراصل محض حکومت حجاز کا نہیں ہے۔ حکومت حجاز خود عربوں کی ہے اور انہوں نے اسکا فیصلہ کرکے سلطان نجد کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اسمیں کسی غیر عرب کو ایک لفظ بھی بولنے کا حق حاصل نہیں ہے اور نہ یہ مقامی مسئلہ اقوام اسلامیہ کے پیش کرنیکا ہے۔ سوال صرف وحدۃ امتہ عربیہ کا ہے اور اس کے لئے بھی دراصل امراء عرب کی رائے اہمیت رکھتی ہے۔

ہندوستان کے بعض مسلمان خلافت اور وہ بھی جمہوری خلافت کا سوال حل کرنے لگے ہیں۔ لیکن پہلا سوال یہ ہے کہ جمہور کون لوگ ہیں؟ ترک۔ ایرانی۔ مصری اور افغانی یہ تمام لوگ اپنی اپنی سلطنتیں اور قوانین رکھتے ہیں جن سے ایک انچ ہٹنا نہیں چاہتے کیا ایسے لوگ جو خلافت کے احکام کی پابندی نہ کرنا چاہیں یا نہ کرسکیں جمہور کہلائے جا سکتے ہیں؟ کیا خلافت کے فیصلہ میں انکی رائے کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے؟ رہے ہندوستانی یہ غریب بے دست وپا غلام ہیں۔ اسلامی خلافت کی اطاعت انکی طاقت سے باہر ہے۔

اسلئے موتمر کے سامنے جو مسئلہ ہے وہ صرف عرب کے متعلق ہے جہاں اسوقت سوائے سلطان عبدالعزیز کے اور کوئی طاقتور امیر نہیں ہے جو عرب کا محافظ اور حرمین کا خادم ہو سکے۔

اس لئے ہم کو قوی امید ہے کہ عرب کی وحدۃ کا مسئلہ اگر طے ہوگیا تو آئندہ عرب اسلام کے لئے زیادہ مفید ہو جائینگے۔
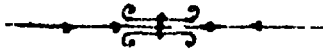
رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا رسالہ اپنی اپریل کی اشاعت میں ایک خبر بیان کرتا ہے جو اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والے علمی حلقوں میں بہت خوشی سے سُنی جائیگی۔ دان برشم ایک مشہور علم دوست اور مستشرق کی بیوی نے اپنے شوہر کی وصیت کے مطابق سوئزرلینڈ کے شہر جنیوا کی میونسپلٹی کو اون کا بیش قیمت کتبخانہ جس میں قلمی کتابوں کے نادر نسخے اور بہت سے علمی اور تاریخی مکاتیب وغیرہ ہیں عطا فرمایا ہے۔ یہ کتابیں سب کی سب اسلامی تمدن سے متعلق ہیں اور تمام اسلامی ممالک سے جمع کی گئی ہیں۔ اِنہیں بعض خود برشم صاحب نے اپنے سفر ایشیا کے دوران میں وہاں کے کتب خانوں آزاد اور بعض یورپ کے عام عجائب خانوں یا نجی کتبخانوں سے نقل کی تھیں اور بعض اُن عکسی تصاویر سے جو اُن کے پاس بیس برس سے دنیا کے ہر گوشہ سے آرہی تھیں خوردبین کے ذریعہ سے تیار کرائی تھیں اُنہیں سے بعض کتابیں چھپ بھی گئی ہیں لیکن تین چوتھائی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کتابوں پر دان برشم نے اپنے ہاتھ سے حواشی اور حوالے لکھے ہیں۔

علاوہ ان کتابوں کے خود وان برشم کی ایک تالیف ہے جن ملکوں میں یہ گئے تھے وہاں کے آثار قدیمہ کے بابتہ مفصل نوٹ ہیں جو بتیس فردوں اور چند اوراق پر ہیں۔ ان کے ساتھ انڈیکس بھی ہے مگر ناقص اور نامکمل۔ یہ کاغذات جنیوا کے فنون لطیفہ اور تاریخ کے عجائب خانہ میں داخل کردئے گئے ہیں اور کتابیں شہر کے عام کتب خانہ میں۔

یہ ہیں علم دوستی کی مثالیں جو ہمیں یورپ کے لوگوں میں اکثر ملتی ہیں۔ بعض صورتوں میں ان باتوں کی کوئی سیاسی یا اقتصادی غرض ہوتی ہے۔ لیکن عموماً خالص علمی ذوق ارباب ہمت کو ان کاموں پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ مسلمان اہل علم جن کا پیشہ یورپ پر سب وشتم کرنا۔ وہاں کے فضلاء کے مساعی کی تنقیص کرنا۔ اور خود کچھ نہ کرنا ہے۔ اگر انصاف کریں تو انہیں کہنا پڑے گا کہ خود علوم اسلامی کے بارے میں جہاں تک محنت اور تحقیق کا تعلق ہے یورپ والے تحسین وآفرین کے مستحق ہیں۔

اگر یہ سچ ہو کہ دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز جس کا انسان مطالعہ کر سکتا ہو خود انسان ہے تو ادبی تصانیف میں سوانح عمریوں کو خاص اہمیت حاصل ہونا چاہئے۔ خصوصاً انکو جن میں مشاہیر عالم اپنے قلم سے اپنے حالات لکھتے ہیں۔ کیونکہ کسی فرد کی نفسی اور ذہنی زندگی کی باریکیاں اور اُس کی شہرت کا تدریجی نشو ونما دوسروں کے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہتا ہے اور صرف وہ فرد خود اس معمہ کو کسی حد تک حل کر سکتا ہے۔

لیکن اس طرح کی کتابوں میں اکثر یہ خرابی ہوتی ہے کہ لکھنے والے اپنے حالات سچائی کے ساتھ بلاکم وکاست نہیں لکھتے بلکہ عجیب عجیب ترکیبوں سے اپنے عیوب کو چھپانے اور خوبیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر اُن میں اس طرح کی بدنیتی نہ بھی ہو تب بھی جھوٹی شرم اُنہیں اپنی اخلاقی خرابیوں کے بیان کرنے سے روکتی ہے۔

بہت کم کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں لکھنے والا اپنے نفس کا پورا احتساب

کرتا ہے اور صاف صاف اپنی ساری کمزوریوں کو بیان کرکے یہ دکھاتا ہے کہ اُس نے کس طرح اُنہیں دور کرنے کی کوشش کی اور اُسے کس حد تک کامیابی ہوئی۔ یہ کتابیں قدر وقیمت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

اسی قسم کی ایک کتاب مہاتما گاندھی کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے جو اُن کے گجراتی رسالے "نوجیون" میں ہفتہ وار چھپ رہی ہے اور جس کا انگریزی ترجمہ ینگ انڈیا اور متعدد ہندوستانی اخبارات و رسائل میں چھپتا ہے۔ اُردو اخبارات میں سے ہمدرد ہر ہفتے اس کا ترجمہ شائع کرتا ہے۔ ہم قارئین کرام کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ضرور اس سلسلہ کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کس طرح ایک شخص جو ایک "قطرہ" کی حیثیت سے ہستی کے بحر ذخار میں آیا تھا "دام ہر موج" کو توڑتا ہوا اور "حلقۂ صد کام نہنگ" سے بچتا ہوا "گوہر" بے بہا بن جاتا ہے۔

الحمدللہ۔ جامعہ کے خریداروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے لیکن ابھی تعداد مطلوبہ میں بہت کمی ہے۔ قارئین کرام کو پھر تکلیف دیجاتی ہے۔ ہر پرچہ میں ایک آرڈر فارم جامعہ کا اور دو پیام تعلیم کے رکھے جاتے ہیں۔ جو صاحب اپنے احباب سے انکی خانہ پری کراکے بھیجیں گے وہ نہ صرف ہمارے رسالہ پر بلکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ پر احسان کریں گے۔

رفتار تعلیم

رہنمایان ملک آج کل سیاست کی سرد بازاری کے سبب سے تعلیم کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ تمام سیاسی جلسوں میں تعلیم کی اہمیت پر تقریریں ہوتی ہیں اور کبھی کبھی عملی کارروائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے چنانچہ صوبہ بمبئی کی کانگریس کمیٹی نے حال میں طبقہ غربا کے مدرسہ دنیا مندر کو پچاس روپیہ مہینہ اور گجراتی راشٹریہ کیلادانی منڈل کو پانسو روپیہ بطور امداد کے دینا منظور کیا ہے۔

خدا کرے یہ دلچسپی جو تعلیم سے ظاہر کیجا رہی ہے محض عارضی نہ ہو ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ ارباب سیاست اپنا کام چھوڑ کر تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیں نعوذ باللہ من ذالک۔ البتہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ تعلیم کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر کے ان لوگوں کی امکانی امداد کریں جو اس کام کے اہل ہیں۔ تعلیم کا جو تعلق کسی قوم کی ذہنی اور روحانی ترقی سے ہے اس سے قطع نظر کر کے ظاہری حیثیت سے بھی آزادی اور سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے پہلی شرط تعلیم ہی ہے اس لئے اسکی امداد کرنا اصل میں سیاسی رہنماؤں کو اپنے کام کا جزو، اور اپنا فرض سمجھنا چاہیئے اور سچ پوچھئے تو بغیر انکی مدد کے قومی تعلیم کی گاڑی چل بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ قوم کی قوت عمل کو بیدار کرنا اور اُسے صحیح راستے پر لگانا انہیں لوگوں کا کام اور انہیں کے بس کی بات ہے۔

س۔ ۵۔ جھبوالا ۲۱ مئی کے بمبئی کرانکل میں اس بات کی شکایت کرتی ہیں کہ صوبہ کے مدارس کا نصاب تعلیم بنانیوالا بورڈ قومی حمیت اور تعلیمی مہارت سے بے بہرہ ہے چنانچہ اُس نے صوبہ کے مدارس میں انگریزی کا نصاب تعلیم ایسا بنایا ہے جو سراسر انگلستان کی زندگی کے حالات اور تمدن مغربی کے خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ہندوستانی بچے کو "انگریزی سپاہی"، "انگریزی جہازراں" جیسی نظمیں پڑھانے سے کیا فائدہ ہے اور اُسے رومیش چندردت

تو رودت، سرجنی نائڈو، دستو مسیل کی انگریزی نظمیں یا موزمدار کی کتاب "ہند کا ارتقائی قومی"
گوکھلے کی تقریریں اور ٹگور کی تصانیف کیوں نہیں پڑہائی جاتیں۔

ہمارے خیال میں لائق مضمون نگار نے ملک کے تعلیمی مرض کے سبب کی تشخیص، اور نسخہ
کی تجویز دونوں میں غلطی کی ہے۔ انکا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ہمارے طالبعلموں میں جو بیگانگی اپنے
قومی یا ملی تمدن سے پیدا ہوتی ہے اُسکا سبب انگریزی کے سبق میں انگلستان کی زندگی
کے حالات اور انگریزی خیالات پڑھنا ہے۔ کسی غیر قوم کی زبان یا ادب کے پڑہنے میں جو تعلیمی
فائدہ مدنظر ہے وہ یہی ہے کہ طالب علم میں وسعت نظر پیدا ہو۔ اپنے تمدن کا مقابلہ غیروں کے
تمدن سے کرکے تنگ نظری اور تعصب کی قید سے آزاد ہو اور قومی تمدن سے گذر کر اسکی پہنچ
"انسانی تمدن" کی بلند سطح تک ہو جائے۔ یہ مقصد ظاہر ہے کہ صرف اُسی صورت میں حاصل
ہو سکتا ہے جب دوسری قوم کی زبان اور ادب کا پیمانہ خود اُس کے حالات اور خیالات
کی شراب سے لبریز ہو۔

شکایت کی بات انگریزی زبان پڑہانا یا انگریزی خیالات سے آگاہ کرنا نہیں بلکہ ہندستانی
زبانیں نہ پڑہانا اور ہندستانی خیالات سے آگاہ نہ کرنا ہے۔ اگر لائق مضمون نگار یہ
کہتے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کے مدارس میں خود وہاں کی زبانیں انگریزی کے مقابلہ
میں وہ حیثیت رکھتی ہیں جو "صاحب کے مقابلہ میں بیرا" کی ہوتی ہے، اگر یہ کہتے کہ
ان زبانوں میں جو نصاب کی کتابیں ہیں اُنکی شان وہی ہے جو گوروں کے رسالوں کے مقابلہ
میں "کالوں کے رسالوں" کی ہوتی ہے۔ اور اگر وہ اسکی اصلاح کا مطالبہ کرتے تو ہم اُنکی

ساتھ حرف بہ حرف اتفاق کرتے۔ موجودہ صورت میں تو انکی تحریر ہیں مذموم "قومیت" اور بیجا تعصب کا نمونہ نظر آتی ہے

ہائی کمشنر ہند کی نئی رپورٹ کے بموجب ہندوستانی طلبہ کی تعداد برطانوی یونیورسٹیوں میں حسب ذیل ہے۔

لندن	۳۶۰
کیمبرج	۱۱۷
آکسفورڈ	۸۹
اڈنبرا	۱۹۶
گلاسگو	۶۲
مانچسٹر	۵۱
برسٹل	۲۴
شیفیلڈ	۲۱
لیڈس	۱۷
بیلفاسٹ	۱۴
ابرسٹ وتھ	۴

علاوہ ان کے ۵۸۲ طالب علم بیرسٹری کے امید وار ہیں۔

لندن میں حال میں ایک کانفرنس مدارس ثانوی کے معلمین اور معلمات اور خردہ فروش تاجروں

کی منعقد ہوئی تھی جس میں ہر قسم کے تاجر موجود تھے۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں کے مشورہ سے طلبہ کا نصاب تعلیم اس طرح کا بنایا جائے کہ وہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ان تاجروں کے کارخانوں میں اپنا کام اچھی طرح انجام دے سکیں۔

ہم اس اصول کے تو خلاف ہیں کہ تعلیم بالکل ملازمت یا کاروبار کے اغراض کی پابند ہو لیکن ہمارے خیال میں اس طرح کی کانفرنسیں ہندوستان میں بہت ضروری ہیں تاکہ معلمین اور طبقہ تجار ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوں، معلمین حتی الامکان لڑکوں کو کاروباری زندگی کے لائق بنانے کا خیال رکھیں اور تجار تعلیم یافتہ لوگوں کے جذبات اور احساسات کا اندازہ کر سکیں اور ان کے ساتھ مناسب برتاؤ کر سکیں۔ خصوصیت کے ساتھ قومی مدارس کو اس قسم کی کانفرنسوں کا انتظام کرنا چاہئے۔

کلکتہ کارپوریشن نے دس ہزار کی رقم اس لئے منظور کی ہے کہ کلکتہ کی پڑتال تعلیمی ضرورت کیلئے کی جائے۔ اس پڑتال میں معلوم کیا جائیگا کہ مختلف محلوں میں کس حد تک اور کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے اور کتنے لڑکے لڑکیاں اسکول جانے کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر ولیم میٹن پرنسپل مدراس کرسچین کالج نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں ہندوستان کی تعلیمی حالات پر کئی لکچر دئے۔ انہوں نے کہا کہ تمام ہندوستان میں ۲ کروڑ روپیہ ابتدائی اور انتہائی تعلیم پر خرچ ہوتا ہے حالانکہ اسکاٹ لینڈ کے سے چھوٹے ملک میں جس کی آبادی صرف پچاس لاکھ ہے ۹ کروڑ روپیہ سے زیادہ تعلیم میں خرچ ہوتا ہے انکے خیال میں اگر مدارس

پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے تو علیحدہ اسکولوں پر بہت کم خرچ کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اگر ہم مصارف کی کمی سے قطع نظر کرلیں تو جو روپیہ خرچ ہوتا ہے اسکا مصرف بھی قابل اطمینان نہیں چنانچہ ابتدائی تعلیم پر صرف ایک کروڑ کا خرچ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں تعلیم کی کامیابی کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے (۱) اچھے معائنہ کرنے والے (۲) معلمین کی تعلیم کا معقول انتظام (۳) خرچ کی مناسب تقسیم۔ ہندوستان میں ان تینوں چیزوں کا انتظام ناکافی ہے چنانچہ مدراس پریسیڈنسی میں ۴۴ ہزار ابتدائی مدرسے ہیں جن کی نگرانی کرنے والے انسپکٹر صرف ۲۰۰ ہیں معلمین کی تعداد ۶۰ ہزار ہے لیکن آدھے سے زیادہ فن تعلیم سے ناواقف ہیں۔ آپکی رائے میں قانون تعلیمی میں تبدیلی کی ضرورت ہے

اس مہینہ میں الہ آباد میں ڈاکٹر تاراچند صاحب پرنسپل کائستھ پاٹ شالا کی زیر صدارت ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جسمیں الہ آباد کے تمام مدارس کے معلمین اور طلبہ کے والدین (غالباً زیادہ تر صرف والد اور شاذ و نادر والدہ) نے باہم جمع ہوکر مشورہ کیا کہ بچوں کی تعلیم کے کیا بہتر تدابیر اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ جو تجاویز یہاں پیش ہوئیں انپر ہم بحث نہیں کرسکتے لیکن اس کانفرنس کے خیال اور اس کے انعقاد پر ہم ڈاکٹر تاراچند صاحب اور انکے رفیقوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ اس قسم کے مشورے ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے از حد ضروری ہیں۔

بائیسکوپ ہمارے ملک میں ابتک محض تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور یوروپ کے ملکوں میں بھی کچھ دن پہلے تک یہی حال تھا لیکن نئی تعلیمی تحریک جو ہر کھیل اور ہر ذریعہ تفریح سے تعلیم کا کام لینا چاہتی ہے بائیسکوپ کو کب چھوڑنے والی تھی۔ یوں تو یوروپ کے تمام

ملکوں میں بمقید عام تقریروں کے ساتھ متحرک تصویریں دکھائی جاتی ہیں لیکن بعض جگہ تو یہ ابتدائی تعلیم کا جزو اعظم ہیں۔ مثلاً روس جہاں محکمہ تعلیم کے لوگ متحرک تصاویر کا سامان لیکر گاؤں گاؤں پھرتے ہیں اور لوگوں کو نوشت و خواند حساب اور حفظان صحت کے اصول سکھاتے ہیں۔ امریکہ کا ایک علمی رسالہ لکھتا ہے کہ وہاں اُن مزدوروں کے لئے جو کانوں میں کام کرتے ہیں خاص تصاویر تیار کی گئی ہیں۔ جن میں کان کنی کے خطرات سے بچنے کے طریقے دکھائے جاتے ہیں۔ یہ تصاویر کانوں میں سطح زمین سے ڈہائی سو فٹ نیچے لئی گھنٹے مسلسل دکھائی جاتی ہیں اور مزدور باری باری سے آکر تھوڑی دیر انہیں دیکھتے ہیں جو وقت اس میں صرف ہوتا ہے وہ اُنکے دوپہر کے کھانے کے وقفہ میں سے کم کرلیا جاتا ہے۔

مطبوعات شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

وجہ دین حکیم ناصر خسرو کی مشہور تصنیف مسائل اسلامی پر فلسفیانہ تنقید اور مفصل بحث مع سوانح حکیم ناصر خسرو و حالات تصانیف .. للعہ

زاد المسافرین حکیم ناصر خسرو کی عدیم المثال اور نادر الوجود تصنیف فلسفہ و حکمت اسلامی پر پہلی بار بکمال اہتمام شان سے چھپی ہے۔ حجم .. ۴۰ صفحات سے زائد ... ۶ر

سفرنامہ ناصر خسرو حکیم مرحوم کے چشم دید حالات اور چوتھی صدی ہجری کے مفید معلومات مع مثنوی روشنائی نامہ و سعادت نامہ طباعت و کاغذ اعلیٰ ترین۔ سرنامہ مطلا و رنگین۔ قیمت ... ۱۲ر

تذکرہ شاہ طہماسپ شاہ موصوف کا خود نوشتہ تذکرہ نہایت دلچسپ قیمت ... عہ

طہران مخوف فارسی کا نہایت دلچسپ ناول مصنفہ مرتضیٰ مشفق کاظمی قیمت ... ۶ر

دستور تار علم موسیقی میں ستار کا درجہ سب سے بلند ہو اس کتاب میں ایرانی و یورپی طرز پر ساز علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے ہیں اور ہر سر کے متعلق نقشے دئے گئے ہیں۔ قیمت ... لعہ

حمائل چھوٹا سائز اصل نسخہ حافظ عثمان کا فوٹو لیکر جست کی پلیٹوں پر چھاپی گئی ہے۔ کاغذ سنہری اُن نہایت خوبصورت جلد مطلا قیمت ... للعہ

بدائع سعدی سر لیوکس وائٹ کنگ سی ایس آئی ایل۔ ایل ڈی پروفیسر فارسی لندن یونیورسٹی نے بدائع سعدی کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت ... صہ

دیوان غالب مکتبہ جامعہ نے دیوان غالب جرمنی سے چھپوایا تھا جو بہت مقبول ہوا اور تھوڑے عرصہ میں ختم ہوگیا دوسرا ایڈیشن نہایت اہتمام سے چھپوایا گیا ہے مگر جرمنی کی گرانی کی وجہ سے اخراجات سوا ڈیوڑھے آئے ہیں۔ اسلئے اسکی قیمت تین روپیہ کی بجائے للعہ کر دی گئی ہے ...

تیاتر مرزا ملکم خاں کے تخیل قلمی و ملی جد و جہد سے ایران دوبارہ زندہ ہوا تین ڈراموں کا دلکش مجموعہ قیمت ... ۶ر

موش و گربہ عبید زاکانی مشہور ہجو گو کی تصنیف چوہے بلی کی کہانی ہے ابنائے عصر کی ہجو ہے اور عہد حاضر سے تطبیق۔ ہر صفحہ رنگین و لطیف مضحک تصاویر سے مزین نہایت دلچسپ قیمت ... ۵۰

رہنمائے ایران فارسی جدید کے نمونے اور بچوں کو خط و کتابت کے پیرایہ میں مفید نصائح از مرزا محمود خاں قیمت ... عہ

تلگراف بی سیم بے تار کی تار برقی کے متعلق کارآمد معلومات مع چند نقشوں اور اشکال کے ... عہ

لغات آلمانی بفارسی فارسی و جرمنی زبان کی لغت کا جرمنی ایڈیشن قیمت ۶ر

دوستداران بشر بعض مرد صفت خواتین کی ملی و ملکی خدمات بطور سوانح نہایت مفید مستند معلومات قیمت ... ۱۲ر

ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ۔ دہلی

مطبع جامعہ ملیہ دہلی

سے

باہتمام محمد مجیب بی اے (آکسن)، پرنٹر و پبلشر شائع ہوا

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

نمبر ۶	جون سنہ ۱۹۲۶ء	جلد ۶

فہرست مضامین

جلد ۶ | ماہ ذالحجہ ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۲۶ء | نمبر ۶

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ

(۲)

مدرسہ (اسکول) کی تعلیم کا نصب العین اور اس نصب العین کے حاصل کرنیکی عملی تدابیر بتانے کے بعد ہم جامعہ (یونیورسٹی) کی تعلیم کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ مدرسہ کی تعلیم کا مقصد ہم بچے کے سارے قوائے ذہنی کی تربیت قرار دے چکے ہیں۔ بچوں میں علمی شوق کا پیدا کرنا اور اس سے مفید معلومات کی فراہمی کا کام لینا منجملہ ان مقاصد کے ایک مقصد ہے لیکن نہ سب سے اہم اور نہ ہمیشہ مقصود بالذات بچوں کی تربیت میں اس کی اہمیت کا درجہ مذہبی عقیدت کے پیدا کرنے اور صحیح راستہ پر لگانے۔ معاشرتی احساس کے اکسانے اور سنوارنے او جمالی ذوق کے ابھارنے اور اُسے پاکیزہ اور ستھرا بنانے کے بعد ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی تحصیل علم ابتدائی منازل میں بہت کم اپنی غرض آپ ہو سکتی ہے اور اکثر مندرجہ بالا مقاصد یا دوسرے تمدنی مقاصد کیلئے ذریعہ کا کام دیتی ہے بالفاظ دیگر مدرسہ کی تعلیم بچوں کو تمدنی زندگی کے سب شعبوں کے لئے تیار کرتی ہے لیکن علم و فضل

پر بعض اور چیزوں کے مقابلے میں کم زور دیتی ہے۔

جامعہ یا یونیورسٹی کی تعلیم میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے یہاں ساری تعلیم کی جان، ساری جدوجہد کا مرکز تحصیل علم اور تحقیق حق ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں جیسا بدقسمتی سے ہمارے ملک میں لوگ سمجھتے ہیں کہ جامعہ کے طالب علم کو سوائے علم کے زندگی کے کسی شعبہ سے بالکل تعلق نہیں رکھنا چاہئے ہمارے نصب العین کی یہ تنگی ہمارے نوجوانوں کی ذہنی زندگی کیلئے سخت مضرثابت ہوئی ہے اور اگر خود فطرت انسانی اس یکرنگی کی روک تھام نہ کرتی تو ہمارے فاضل طالب علم زندگی کیلئے بالکل بیکار ثابت ہوتے اور انکا ٹھکانا سوائے کتب خانوں (یا انتہائی حالت میں پاگلخانوں کے) اور کہیں نہ ہوتا البتہ یہ ضرور ہے کہ جامعہ کی تعلیم میں علم کی حیثیت اصولی اور دوسری چیزوں کی فروعی ہونا چاہئے علم کو یہاں ایک شمع سمجھنا چاہئے جسکی روشنی میں طالبعلم انسانی زندگی بلکہ ساری کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے پیچ در پیچ راستوں میں جو بظاہر بھول بھلیاں کا ساں پیش کرتے ہیں اپنی راہ ڈھونڈتا ہے

یہاں پھر یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ باوجودیکہ جامعہ کی تعلیم ایک حد تک سارے شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہے لیکن انکا اصل منشا طلبہ کو محض علمی زندگی مثلاً مصنف یا معلم کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔ یہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ تعلیم کا نصب العین یہاں بھی وہی ہے جو مدرسہ میں تھا یعنی طالبعلم کے سارے قوائے ذہنی کی تربیت اور اسے تمدنی زندگی کے کل شعبوں کیلئے تیار کرنا لیکن چونکہ ایک طرف قوائے ذہنی کی عام تربیت اور تمدنی زندگی کیلئے عام تیاری کی عمر مدرسہ میں ختم ہوجاتی ہے اور دوسری طرف جامعہ پہنچتے پہنچتے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ طالب علم زندگی کے کس شعبے کیلئے موزوں ہے اس لئے یہاں کسی خاص ذہنی قوت کی تربیت اور کسی خاص تمدنی شعبہ کیلئے تیاری پر زور دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ علمی صلاحیت ہر فرد بشر کی نمایاں ذہنی قوت نہیں ہوتی مثلاً ہر شخص معلم اور مصنف کی زندگی گذارنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے جامعہ کی تعلیم میں اس قسم کی کوئی قید نہیں لگائی جاسکتی۔ طالب علم میں جس قسم کی زندگی

کی صلاحیت ہو اُسی قسم کی تعلیم اُسے جامعہ میں ملنا چاہئے ۔

سب سے بڑا فرق مدرسہ اور جامعہ کی تعلیم میں یہ ہے کہ مدرسہ کی تعلیم میں طلبہ تمدنی زندگی سے اصلاً صرف سطحی اور انفعالی تعلق پیدا کرتے ہیں وہ اپنی قوم وملت کے تمدن کو سرسری طور سے سمجھتے ہیں لیکن اُسکی گہرائیوں سے واقف نہیں ہوتے وہ اس تمدن کے حامل کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکتے ہیں اُسکی برکات کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اُسے قائم رکھنے میں مدد دے سکتے ہیں لیکن اُسمیں تجدید یا اصلاح کرنیکی قابلیت نہیں رکھتے ۔ اس سے آگے بڑھنے اور جامعہ کی تعلیم حاصل کرنیکی اجازت صرف ان طلبہ کو ملنا چاہئے جو ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے صرف انفعالی صلاحیت نہیں بلکہ فاعلی قوت بھی رکھتے ہیں جامعہ میں انہیں اسطرح کی تعلیم ملنا چاہئے کہ یہ اپنی شخصی آزادی کو قائم رکھتے ہوئے اپنے قومی تمدن کے علاوہ انسانی تمدن کے عموماً اور اُسکے ایک شعبے کے خصوصاً محرم ہو سکیں یعنی سطحی واقفیت پر اکتفا نہ کرکے اس کی تہ تک پہنچ سکیں ۔اسی صورت میں ان سے امید ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے تمدن کا خصوصاً اُس شعبہ کا جس پر یہ عبور رکھتے ہیں نقادانہ نظر سے مشاہدہ کریں گے اُسکے سارے روایات بلا امتیاز نیک وبد آنکھ بند کرکے قبول نہ کرلیں گے بلکہ جہاں خرابیاں دیکھینگے انہیں دور کرنیکی کوشش کرینگے اور اگر ضرورت پڑجائیگی تو اصلاح سے آگے بڑھکر انقلاب پیدا کرنے میں بھی تامل نہ کریں گے ۔

مگر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جامعہ کی تعلیم باوجود یہ عملی پہلو رکھنے کے بالذات نظری چیز ہے اور اسکی اصل محض مطالعہ اور تحقیق ہے ۔ تمام تمدنی مسائل میں احقاق حق کیلئے اسکی ضرورت ہے کہ بالفعل ان مسائل کے استعمال سے قطع نظر کرکے انہیں محض علمی اصول پر جانچا جائے تاکہ اہل فکر اُن جذبات اور مصالح کی پابندیوں سے آزاد رہکر جو عمل کے لئے ناگزیر ہیں نزاعی بحثوں میں محض حق کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح نتائج تک پہنچ سکیں اس کے بعد ان نتائج سے عملی زندگی میں فائدے بھی اٹھائے جاسکتے ہیں تاریخ عالم اسکی شاہد ہے کہ تمام تمدنی شعبوں میں اکثر بڑے بڑے انقلابات اسطرح ہوئے ہیں کہ ایک گوشہ نشین محقق نے کسی اہم مسئلہ پر غور کرکے اُس سے کوئی نتیجہ نکالا جسے اہل عمل

لے اڑے اور اسکی مدد سے اُنہوں نے ساری دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا۔ زمانۂ حال کی عظیم الشان ایجادات قطب نما، دوربین دخانی انجن برقی مشینیں جنہوں نے یورپ میں نہ صرف ظاہری زندگی کی کایا پلٹ دی بلکہ وہاں کے ذہنی شعبوں میں بھی معرکۃ الآراتبدیلیاں پیدا کردیں سب کی سب لیسے اہل فکر کی نظری تحقیقات کی ممنون ہے جنہیں کبھی خواب میں بھی ان آلات کے بنانے یا انکے استعمال کا خیال نہ آیا تھا۔ مختصر یہ کہ جامعہ کی تعلیم کا اصل اصول نظری تحقیق ہونا چاہیے اور اگر اسکی بنیاد استوار ہوجائے تو عملی نتائج خود بخود پیدا ہوجائینگے۔

اس بحث کے نتیجہ کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ کی تعلیم کا نصب العین ہے "طلبہ کو اس قابل بنانا کہ علاوہ علوم متداولہ سے ضروری واقفیت رکھنے کے کسی خاص علم کے ماہر ہوں اس علم کی تحصیل میں نقادانہ نظر اور مجتہدانہ فکر سے کام لیں۔ ہر طرح کے اندیشہ اور مصلحت سے قطع نظر کرکے حق کے دریافت کرنے کی کوشش کریں اور ضمنی طور پر اپنی تحقیق کے نتائج سے عملی زندگی میں ترقی اور اصلاح کرسکیں،، یہی مسلمانوں کے یہاں ''عالم باعمل،، کا نصب العین تھا جواب اس قدر تنگ ہوگیا ہے کہ ''علم'' دینیات کی کتابوں کے حفظ کرنے کا ''عمل'' عبادت ظاہری اور اوراد و وظائف کا مرادف ہوگیا ہے۔

اس نصب العین کے معین کرنیکے بعد یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم یعنی جامعہ کی تعلیم کی عمارت صرف صحیح آزادی کی بنیاد پر کھڑی ہوسکتی ہے۔ ''نقادانہ نظر''، ''مجتہدانہ فکر'' ''اندیشہ اور مصلحت سے قطع نظر کرنا'' ان میں سے ہر چیز صرف آزادی کی آب و ہوا میں پنپ سکتی ہے۔ مگر چونکہ آزادی بہت مبہم لفظ ہے اور اس لفظ کا جادو بیجا حد سے زیادہ ہوتا ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم آزادی سے جو چیز مراد لیتے ہیں اُسے واضح کردیں اس کے لئے پہلے تین سوالوں کا جواب ملنا چاہئے۔ کس چیز سے آزادی؟ کس بات میں آزادی؟ اور چونکہ ہر آزادی کی ضامن کوئی دوسری پابندی ہوتی ہے اس لئے یہ سوال بھی اہم ہے کہ کس پابندی کی بنا پر آزادی؟

تینوں سوالوں کے جواب ہم اپنے نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسطرح دے سکتے

ہیں کہ ہمارے خیال میں جامعہ کی تعلیم کو نہ صرف حکومت کے دباؤ سے بلکہ ہر قسم کے سیاسی تعلقات سے آزاد ہونا چاہئے کیونکہ سیاسی جوش طالبعلموں اور اُستادوں دونوں کی قوت حکم پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے جسکی وجہ سے وہ اپنے اصلی مقصد یعنی ہر مسئلہ میں حق کی تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے اسی طرح فکر معاش سے معاشرت کے تکلفات سے فرقہ وارانہ تعصبات سے آزادی بھی تعلیم و تعلم کی زندگی کیلئے ضروری ہے۔ اس منفی آزادی کے علاوہ اہل جامعہ کو اپنے مخصوص کام یعنی تحصیل علم اور احقاق حق میں کامل آزادی ملنا چاہئے استاد آزاد ہوں کہ علمی مسائل میں جو رائے وہ رکھتے ہوں اُسکا ایمانداری کے ساتھ اظہار کریں اور طلبہ آزاد ہوں کہ مختلف آرا میں سے جو بات انکے دل کو لگتی ہو اُسے قبول کریں لیکن ان آزادیوں کے ساتھ دوسری پابندیاں لازمی ہیں ورنہ مطلق العنانی اور بے اصولی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے مثلاً اصول تحقیق کی پابندی کذب وریا سے بچنے کی پابندی استادوں اور شاگردوں دونوں کیلئے ناگزیر ہے۔

ان اصولوں کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ انتہائی مدارس کا طریق درس بڑی تبدیلی کا محتاج ہے۔ انمیں سب سے بڑی اور شرمناک خرابی غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا ہے اس کے علاوہ جماعت بندی کی قید، کتب درسیہ کا تعین اور اُنکا سبقاً سبقاً پڑھانا، سب طلبہ کو ایک سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنا یہ وہ باتیں ہیں جنکی سختی ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں بھی نامناسب ہے اور انتہائی تعلیم میں تو انکا خیال بھی گناہ ہے کیونکہ ان پڑھانے اور پڑھنے والوں میں تنگ نظری اور تقلید کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور فکر کی وسعت اور رائے کی آزادی مفقود ہو جاتی ہے۔ جامعہ کے طلبہ کیلئے بلا قید جماعت عام درس علوم و فنون کی تاریخی نشو و نما اور اُنکے اصول و ضوابط پر ہونا چاہئے انکے لئے تعلیم کا ایک معیار مقرر کرنا ضروری ہے اور اُس معیار تک پہونچنے کیلئے درسی کتابوں کے انتخاب میں بھی انہیں مشورہ اور مدد دینا چاہئے لیکن ہر فرد کی طبعی مناسبت اور انفرادی صلاحیت کا خیال رکھتے ہوئے تاکہ اُن کے شخصی جوہر اُبھریں اور خالق کل کی فیاضی بیکار نہ جانے پائے پھر ان کتابوں کو طلبہ بطور خود پڑھیں اور سمجھیں البتہ مشکل مقامات کے حل کرنے میں استادوں سے مشورہ کرلیں بعض اہم کتابوں کے پڑھانی

کیلئے اگر اُستاد عام مجلس درس کے علاوہ خاص حلقۂ درس مقرر کرے جس میں ان کتابوں کے مطالب پر بحث ہوا کرے تو بہت مناسب ہے بشرطیکہ یہاں طلبہ محض سامع کی حیثیت سے نہ ہوں بلکہ خود آزادی سے بحث میں حصہ لیا کریں عام اور خاص ہر طرح کا درس طلبہ کی مادری زبان میں ہونا چاہئے تاکہ وہ سماعت کے وقت محض زبان کے قواعد اور محاورات کا پوست الگ کرنے میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں بلکہ مغزِ سخن تک پہنچ سکیں۔

اس بات پر سب سے زیادہ زور دینا چاہئے کہ اُستادوں کے درس کے سننے اور بطور خود مطالعہ کا مقصد طلبہ محض کامیابی امتحان نہ سمجھیں اور خُذ ما صَفا اور دَع ما کَدِر کو اپنے من گڑھت معنی پہنا کر صرف "امتحان میں آنیوالی" چیزوں کو قبول اور "نہ آنیوالی" چیزوں کو رد نہ کریں بلکہ علوم و فنون پر عبور حاصل کرنے کو اصل مقصد اور امتحان کو محض اسکی جانچ کا ایک ناممل ذریعہ سمجھیں کہ یہ مقصد کہاں تک حاصل ہوا ہے۔

امتحان تعلیم کا مقصد تو نہیں ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے تعلیم کی پختگی اور استواری میں بہت مدد ملتی ہے۔ اگر امتحان صحیح طریقہ سے ہو تو اس سے تین بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو طالبعلم کو اپنے کام کے طریقہ کے صحیح یا غلط اور اپنی محنت کے کافی یا ناکافی ہونیکا احساس ہوجاتا ہے اور وہ اصلاح کی کوشش کرسکتا ہے دوسرے جانچ اور احتساب کے کھٹکے سے بتقاضائے فطرت وہ زیادہ محنت کرتا ہے تیسرے اُسے خود اور دوسروں کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ کس علم و فن کی کس شاخ سے خاص مناسبت رکھتا ہے اور اپنے ملک کی تہذیب و تمدن کے کس شعبہ میں کس حیثیت سے کام کرنیکا اہل ہے۔

صحیح طریقہ امتحان کا یہ ہے کہ امتحان لینے والے اور امتحان دینے والے کا تعلق گواہ اور وکیل مخالف یا چور اور تھانہ دار کا سا نہ ہو بلکہ مریض او طبیب کا سا ہو جس طرح بیمار اور معالج دونوں کی متحدہ کوشش اس امر میں صرف ہوتی ہے کہ مرض کی صحیح تشخیص ہو اور مفید مشورہ دیا جاسکے اسی طرح امیدوار امتحان اور ممتحن دونوں کو اتحادِ عمل اور باہمی مدد کے ذریعہ سے مقدم الذکر کے قوائے ذہنی کی نبض شناسی میں آسانی پیدا کرنا چاہئے۔

جس طرح تعلیم میں ہم نے مدرسہ اور جامعہ کی تفریق کی تھی اُسی طرح امتحان میں بھی کرنا چاہئے۔ مدرسہ کی تعلیم کے بعد علم وفضل کے امتحان کا موقعہ نہیں ہے بلکہ اسکی جانچ ہونا چاہئے کہ طالب علم کے مختلف قوائے ذہنی کس حد تک تربیت پا چکے ہیں اور انمیں کہاں تک ہم آہنگی پیدا ہو چکی ہے۔ جہانتک علم کا تعلق ہے یہاں وسعت معلومات کی بنا پر فیصلہ نہ کرنا چاہئے بلکہ معلومات حاصل کرنیکی صلاحیت اور انمیں ترتیب پیدا کرنیکے سلیقہ کو معیار بنانا چاہئے۔ ہر طالب علم کی انفرادی خصوصیات کا لحاظ ایک حد تک رکھنا ضروری ہے لیکن اس سے مفر نہیں کہ ہم انہیں ایک مقررہ عام پیمانے سے نا پیں۔

برخلاف اس کے جامعہ کے امتحان کا اصول دوسرا ہے یہاں عام ذہنی تربیت تو طالبعلم میں داخلہ ہی کے وقت موجود ہونا چاہئے۔ تعلیم کے ختم پر جو امتحان ہو اُس میں یہ دیکھنا ہے کہ اُس خاص فن یا اُن خاص فنون پر جن سے طالبعلم کو طبعی مناسبت ہے اُس نے کہاں تک عبور حاصل کیا ہے اس کے ذریعہ سے اسمیں کس درجہ تک وسعت نظر اور اجتہاد فکر پیدا ہوا ہے۔ ان صفات نے اسمیں کتنی صلاحیت عالم امکان کی حقیقت کو پہچاننے اور انسانی اور قومی تمدن کے مسائل کو سمجھنے کی پیدا کی ہے اور اس صلاحیت کو وہ زندگی کے کس شعبہ میں اپنی اور اپنی قوم کی بقا اور ترقی کیلئے استعمال کر سکتا ہے۔ اس امتحان کیلئے اس طرح کا کوئی عام معیار مقرر نہیں ہو سکتا جیسا مدرسہ میں تھا اسمیں حتی الامکان ہر فرد کی مخصوص سیرت اور صلاحیت ذہنی کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

ان اصول کے مطابق جیسا امتحان ہونا چاہئے اُسکا دستور العمل بنانے کا یہاں موقعہ نہیں ہے البتہ دو ایک عام اور اہم باتیں بتائی جاسکتی ہیں ممتحن کو امیدوار امتحان سے سوالات اس طرح کرنا چاہئے کہ وہ خود جواب کی طرف اشارہ کرتے ہوں بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ ممتحن کسی مسئلہ کو لیکر اس پر خود تقریر شروع کرے اور اُسے ناتمام چھوڑ کر امیدوار امتحان سے اُسے پورا کرنیکی فرمائش کرے درمیان میں جہاں امیدوار غلط راستے پر جاتا ہو اُسے فوراً ٹوک دے اور دور کے اشارے سے صحیح راستے پر لگا دے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں صرف زبانی امتحان میں ممکن ہیں اس لئے زبانی امتحان کو ہر امتحان کا جزو اعظم بنانا لازم ہے۔ تحریری امتحان کو حتی الامکان کم کرنا چاہئے اور جتنا ہو

اسمیں بھی سوالات کو شرح اور واضح کر کے بعض کا جواب دینے اور بعض کو چھوڑنے کا اختیار دے کر اور انکے جانچنے میں کیف کو کم سے زیادہ سمجھ کر اصلاح کیجائے۔ جامعہ کے امتحان میں علاوہ زبانی اور تحریری امتحان کے طلبہ سے انکی حیثیت کے مطابق ایک مقالہ علمیہ ضرور لکھوانا چاہیئے کیونکہ اس سے بہتر طریقہ انکے اجتہاد فکر اور دقت نظر کے جانچنے کا نہیں ہو سکتا۔

اختصار کیساتھ ہم امتحان کا بنیادی اصول اسے کہہ سکتے ہیں کہ طلبہ کو اپنی قابلیت اور صلاحیت کا اندازہ کرنے میں ہر قسم کی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں لیکن ان آسانیوں کیساتھ ایک اٹل دشواری ہونا چاہیئے جس کے بغیر امتحان کیا خود تعلیم کی بنیاد نہیں قائم رہ سکتی وہ یہ کہ طریقہ امتحان خواہ کتنا سہل ہو لیکن معیار امتحان (خواہ وہ خاص ہو یا عام) حتی الامکان بلند مقرر کیا جائے اور جو امیدوار اُس پر پورا نہ اُترے اُسے کسی مصلحت اور کسی اندیشہ سے کامیابی کی سند نہ دیجائے کیونکہ اس طرح کی رعایتوں سے جہاں معیار ایک بار پست ہوا پھر اسقدر تیزی سے گرتا ہے کہ اُسکا روکنا انسانی طاقت سے باہر ہو جاتا ہے ایسی صورت میں امتحان بجائے بیداری اور محنت کے حکم کے خواب اور کاہلی کا پیغام بنکر آتا ہے۔ طالبعلموں کو انکی واقعی کمزوریوں پر متنبہ کرنے کے بجائے انکی فرضی قوت پر مبارکباد دیتا ہے اور اس طرح انہیں صرف جہل میں نہیں بلکہ جہل مرکب میں مبتلا رکھتا ہے۔

(باقی آئندہ)

روسی انقلابی شاعری

دنیا میں شاید ہی کسی قوم کو شاعری سے اتنا شوق ہوگا جتنا روسیوں کو ہے اور قومی شاعری بھی شاید ہی کہیں اس سے اچھی ہوئی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو حیثیت شاعر کی روس میں ہے وہ اور کہیں نہیں۔ روسی قوم ابھی نوجوان ہے۔ ایک صدی پہلے کسی کو روسیوں میں یا بدیسیوں میں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ روس کیا چیز ہے اور روسی ہونے کے کیا معنی ہیں۔ لیکن اسی زمانہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر پشکن نے فرانسیسی زبان چھوڑ کر اپنی زبان میں نظمیں لکھنا شروع کیا۔ روسی قوم کی ہستی کا خیال سب سے پہلے اُسکے اور اُسکے ہمعصر شاعروں کے دل میں پیدا ہوا اور انہوں نے روسیوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی زمانہ سے روس میں شاعر ہر ادبی اور سیاسی معاملہ میں قومی رہنما بھی بن گئے۔ انکے غیر معمولی اثر کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ روسی عام طور سے دماغ کے کم قائل ہیں اور دل کو زندگی میں اپنا رہبر بنانا چاہتے ہیں۔

روس کی سیاسی حالت ہمیشہ خراب رہی ہے۔ زار کی حکومت اور روس کے روشن خیال لوگوں میں ہمیشہ سے بڑی سخت دشمنی رہی ہے اور یہ انقلاب جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے ایک نیا یا اکیلا واقعہ نہیں بلکہ ایک لمبی زنجیر کی آخری کڑی ہے۔ شاعروں پر اس سیاسی تمدنی خانہ جنگی کا بہت اثر رہا ہے اور انہوں نے اپنے اپنے طریقے پر اس اہم سوال کا جواب دیا ہے۔ کچھ تو پشکن کی طرح تھوڑے دن تک سیاسی شاعری کر کے چپ ہو گئے۔ کچھ روس کو اس کی نیند سے جگانے سے ناامید ہو کر قوم سے خفا ہو گئے۔ مگر اکثر نے لوگوں کے دلوں میں ملک کی محبت بڑھا کر اور پستی کی شرم دلا کر انقلاب کیلئے راستہ صاف کیا۔ مشکل یہ تھی کہ ایک تو روسی بے فکروں کی قوم، دوسرے مغرب نے دل کے امنگ فراموش کر دئے تھے۔ یہاں تک کہ جس زمانے میں پشکن نے روسی میں نظمیں لکھنا شروع کیا اس سے بہت پہلے سے فرانسیسی تعلیم یافتہ لوگوں کی عام زبان تھی اور اُس کے بہت بعد تک تعلیم یافتہ اور عام زبان میں اتنا ہی فرق تھا جتنا روسیوں اور فرانسیسیوں میں، اور روسیوں اور ان

روسیوں میں جو دیسی بن گئے تھے ان چند لوگوں کا جو بیرونی تمدن سے فائدہ اٹھاکر بھی روسی بنے رہنا چاہتے تھے عزت سے رہنا ناممکن کر دیا تھا۔ ان چند لوگوں کی خفگی کا حال شاعر لیرمنتف کی ایک نظم سے ظاہر ہوتا ہے جو اُس نے ایک موقعہ پر روس سے باہر جاتے ہوئے کہی تھی:

"اے ناپاک روس۔ غلاموں اور انکے مالکوں کا ملک۔ میں تجھسے رخصت ہوتا ہوں ۔۔۔!"

بعد کے روسی جن میں اپنے ملک اور تمدن کی محبت کچھ زیادہ تھی اپنی بُرائی کا شکر ان ہی شاعروں کے یہاں ادا کرتے رہے، اور آجکل تمام روسی اپنی دنیا کو اپنے شاعروں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

اگر روس اثر کا جو بولشویک انقلاب کا روسی قوم پر پڑا ہے کوئی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے تو وہ اس زمانے کی شاعری سے ہے۔ بولشویک خود جھوٹ بول سکتے ہیں۔ باہر کے لوگ جو وہاں تماشا دیکھنے جاتے ہیں غلط سمجھ سکتے ہیں لیکن اصلی اور فطرتی شاعری کبھی جھوٹی نہیں ہوتی اور اس زمانے کی شاعری خاص طور سے فطرتی رہی ہے۔

یہ کہنے کی نمائش ضرورت نہیں کہ اس انقلاب سے پہلے روس کی حالت از حد خراب تھی شاعروں اور اُن روشن خیال لوگوں نے جو انکی قدر کرتے تھے۔ ہر چند اصلاح کی کوشش کی لیکن ادب کے سوا اور کسی شعبہ میں روسی قوم ترقی نہ کر سکی ان شاعروں کے لئے روس اور روسی ایک پہیلی بن گئے۔

" ہم دماغ سے روس کو نہیں سمجھ سکتے، معمولی پیمانہ سے اسکو نہیں ناپ سکتے۔ اسکی سیرت ساری دنیا سے نرالی ہے۔ روس پر صرف ایمان لایا جاسکتا ہے (چیوچیف ۱۸۶۶ء) "

یہ لوگ سوائے ملک کی حالت پر نوحہ خوانی کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن اپنے وطن کی محبت اُنکے دلوں میں اُس زمانے میں تھی اور اب بھی ہے۔ زمانۂ حال کا شاعر الیکسانڈر بلوک ایک ایک نظم میں کہتا ہے۔

" گناہ کر، بیکا پاپی بن جا، رات دن کا فرق بھول جا، اور سر کو مستی سے بھاری کر کے خانۂ خدا میں لڑکھڑاتا ہوا جا۔۔۔ گھر واپس آ کر کسی کو ایک کوڑی کیلئے دھوکا دے۔ بھوکے کتے

کو اپنے دروازے سے دُھتکار دیتی ہوئے لات مار کر بھگا دے۔ اور رات کو نرم پلنگوں پر گہری نیند سو جا۔۔۔

ہاں اسی حالت پر بھی اے روس تو مجھکو اور سب ملکوں سے زیادہ عزیز ہے۔" (۱۹۱۴)

اسی سال کی ایک اور نظم ہے جو بلوک نے لڑائی کے شروع ہونیکے بعد لکھی تھی۔

"ہم مردہ زمانے میں پیدا ہوئے ہیں زندگی میں اپنا راستہ نہیں ڈھونڈھ پاتے۔ ہم روس
کے پُرخوف زمانے کے بچے ہیں۔ ہم میں نہ آگے بڑھنے کی جرات ہے اور نہ پیچھے ہٹنے کی قوت
لیکن اگر ہماری لاشوں پر چیل اور کوے بھی منڈلائیں۔ پھر بھی اے خدا، تو اپنا جلوہ انہیں
کو دکھا جو اُسکے مستحق ہوں!"

روس صدیوں کا بھوکا پیاسا، بدیسیوں کے ہاتھ بے قیمت بکا ہوا ملک جہاں پشکن کے لوئی مار دی گئی تھی، دستیفسکی جلاوطن کیا گیا تھا، جہاں ہر سال سو دو سو وطن پرست نوجوانوں کو پھانسی دیجاتی تھی، اب قریب قریب مردہ ہو گیا تھا۔ روشن خیال روسی سب ہمت ہار چکے تھے۔ اُسوقت یکایک اعلان جنگ ہوا۔ کچھ امید بندھی کہ روس جاپان کی جنگ کی بعد کی طرح اس جنگ کے بعد بھی انقلاب کی کوشش ہوگی۔ یہ بالکل طے ہو گیا تھا کہ اگر انقلاب نہ ہوا تو روس بالکل تباہ ہو جائیگا۔

لیکن جب روس میں دراصل انقلاب ہوا تو اُن لوگوں میں سے جو آزادی اور انقلاب کے لئے چلا رہے تھے زیادہ تر ڈر گئے یا خفا ہو گئے۔ وہ صرف بجائے زار کے اپنی، بجائے ایشیا کی ایسی وحشی اور ظالمانہ شخصی حکومت کے اساسی حکومت چاہتے تھے۔ لیکن اتنے ادل بدل سے ملک کی حالت پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ روس کو مرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ پھر زندہ ہو سکے۔ شاعروں کو اسکا الہامی علم تھا۔ کیونکہ یہ قابل غور بات ہے کہ نہ صرف روسی انقلاب کا بلکہ بولشیویکوں کا مخالف بھی کوئی شاعر نہیں ہوا۔

انقلاب کے ذریعہ سے اور اُس جنگ کے جو بولشیویکوں کی حکومت کو تباہ کرنیکے لئے انگلستان اور فرانس نے لڑی تھی وہ چیز حاصل ہو گئی جسکی تمام روشن خیال روسی کوشش کر رہے تھے: "روس" ایک تصور بنگیا جسمیں دل اور درد یاس اور امید، دین اور جلوہ الٰہی

سب نے مل کر ایک نئی دنیا بنا دی۔ جسکو انقلابی روس کہتے ہیں۔

روسی انقلاب بحیثیت ایک موضوع کے دو قسم کی شاعری ہوئی ہے ایک تو وہ جس کا اس زمانے کے واقعات سے، دوسری وہ جسکا انقلاب بذات خود سے تعلق ہے پہلی قسم کی صرف دو نظمیں قابل ذکر ہیں، یہ مضمون ایسا ہے جس پر معمولی شاعروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ زار اور تمام سرمایہ داروں کو گالیاں دی ہیں، سرخ سپاہیوں کیلئے گیت لکھے ہیں یا بولشیویک حکومت کی تعریف کی ہے۔ وہ دو نظمیں جو قابل ذکر ہیں۔ شاعر بلوک کے دو مشہور کارنامے ہیں۔

اُس آفت کے زمانہ میں جب ماسکو اور پیٹرو گراد کی سڑکوں پر خون کے دریا بہ رہے تھے اور لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ شاید بلوک ہی ایسا شخص تھا جس پر خوف طاری نہیں ہوا اور جس کے اوسان بجا رہے۔ یہ تو ناممکن تھا کہ اسکا جیسا آدمی خونریزی میں حصہ لیتا یا اُسکو پسند کرتا۔ بولشیویکوں سے وہ اسکی وجہ سے ناراض ضرور تھا لیکن اُسکو یقین تھا کہ یہ چاہے جیسی غلطیاں کریں روس کو نہیں سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ وہ خود تمام پارٹیوں سے الگ تھا، بولشیویکوں کو اُسکے مرتے دم تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ اُسکا سیاسی معاملات میں کیا رخ ہے۔ لیکن یہ سب کو یقین تھا کہ وہ روس کا عاشق ہے اور روسی انقلاب کا دوست۔

بلوک کی پہلی نظم اُس زمانے میں لکھی گئی تھی جب ماسکو کو دشمنوں نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ بولشیویک راج خون میں بہ جائیگا۔ ونسٹن چرچل نے جو بولشیویکوں کا جانی دشمن اور اس جنگ کا بانی تھا، لندن میں ایک تقریر کی اور بہت دعوے کیساتھ اعلان کیا کہ وہ روسی وحشیوں کو تباہ کر کے چھوڑیگا۔ اُس کے جواب میں بلوک نے ایک نظم لکھی جو یوں شروع ہوتی ہے،

" ہاں ہم بیہوش ہیں، وحشی ہیں، ایشیائی ہیں، تم مہذب لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا ہیں لیکن ہمارے دلوں میں وہ آگ جل رہی ہے جو تمہارے بجھائے نہ بجھے گی . . . . "

جو اثر اس مختصر سی نظم کا روسیوں پر ہوا ہے اُسکا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ دوسری نظم کا

مطلب اور تھا اور وہ دوسرے مسئلہ کے حل کرنیکے لئے لکھی گئی تھی۔

بولشویک جب لڑائی سے کسی قدر فارغ ہوئے اور لوگوں کے دلوں میں موت کا ڈر بھی ایک حد تک کم ہو گیا تب یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ آخر اس انقلاب سے کوئی فائدہ بھی ہو سکتا ہے اور اگر ہو سکتا ہے تو کیسا؟ کہیں یہ سب تکلیفیں جو ملک کو دشمنوں سے بچانیکے لئے اٹھائی گئی ہیں بیکار تو نہیں گئیں؟ بلوک کی نظم "بارہ سوار"، جس کے بہت سی زبانوں میں کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ اس سوال کا جواب دیتی ہے۔

ماسکو کی سڑکوں پر بارہ سوار رات کو پہرہ دے رہے ہیں۔ سب مست ہیں سب پر ایک عجیب نیند غالب ہے جس کو وہ گا گا کر اور شور مچا کر ایک دوسرے کو بچانا چاہتے ہیں راستوں پر لوگوں کو گالیاں دیتے اور گولیاں چلاتے ہوئے جا رہے ہیں کہ انکو دور سے ایک شخص جاتا ہوا نظر آتا ہے اُسکو للکارتے ہیں وہ کوئی جواب نہیں دیتا، پھر بندوق چلاتے ہیں اسکا بھی اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ گھوڑے تیز کر کے اُس کے پاس پہنچکر دیکھتے ہیں۔۔۔ حضرت عیسیٰ سر جھکائے چلے جا رہے ہیں۔

حضرت عیسیٰ صرف اُن پیغمبر کا نام نہیں ہے جن کی موت کے بارے میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں اختلاف ہے۔ روسی قوم کیلئے وہ ایک روحانی قوت ہیں جس کے بل پر وہ زندہ ہے۔ ایک محبت جو اُسکی زندگی میں تنہا امید اور تسکین ہے۔ "ہمارے دادا عیسیٰ"، "ہمارے بھائی مسیح"، اس نام کی اور اس نام والے کی محبت نے روسی دلوں میں بہت مضبوطی سے گھر کر لیا ہے لیکن بلوک کیلئے حضرت عیسیٰ ایک اور معنی بھی رکھتے ہیں جیسا کہ ایک روسی "بڑے میاں" ایک جگہ کہتے ہیں "کاریگر اسی امید پر جیتے ہیں کہ کسی دن ایک ایسا کاریگر پیدا ہو گا جو اُنکے فن کو ترقی دیگا اور کسی بڑی ایجاد سے اُس میں انقلاب پیدا کریگا، ویسے ہی ہم سب بھی اسی امید میں زندہ ہیں کہ کسی دن ایک ایسا شخص آئیگا جو ہم کو زندگی کے معنی سمجھائیگا اور زندہ رہنے کی قوت دے گا"۔ "بلوک کیلئے"، حضرت عیسیٰ وہی ہیں جو ہندوؤں کے لئے اوتار اور خاص طور سے وشنو کے اوتار

شری کرشن وغیرہ ہیں اسکا حضرت عیسیٰ کو ماسکو میں دیکھنا یہی معنی رکھتا ہے جو اوتاروں کا دنیا میں آنا یعنی روسی انقلاب کو اُس نے اتنا بڑا واقعہ قرار دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ خود اسکی طرف توجہ کر رہے ہیں اور اپنی برگزیدہ قوم کے لئے ایک نئی زندگی، ایک نئی دنیا پیدا کرنے آئے ہیں۔

" دنیا کے اندھیارے میں جو ہمیشہ سے دشمنی اور ہوا و ہوس سے بھرا ہوا تھا جنگی نعروں کے جواب میں آسمان پر ایک نئی قوت کا جلوہ نظر آرہا ہے۔ بہت جلد کالے بادلوں سے اسکی شعائیں پار ہونگی ... ہم جو اندھیری راتوں اور آندھیوں کے عادی ہیں۔ ہماری آنکھیں اُس جلوہ کو نہ دیکھ سکیں گی اور کیا عجب ہے اگر ساری زمین اُسکے فروغ سے جل کر خاک ہو جائے " (بلوک ۱۹۲۰ء)

زیادہ تر نظمیں بلوک کی اُس دوسری قسم کی ہیں جنکا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یعنی اُنکا موضوع انقلاب بذات خود ہے یا وہ اثر جو انقلاب کا اُسکے دل پر ہوا ہے میں نے جو تین نظمیں مثال کے طور پر دی ہیں وہ بلوک کے خیالات روسی انقلاب کے بارے میں ظاہر کرتی ہیں اُس پر خود جو اثر پڑا ہے وہ ایک حد تک اس نظم سے معلوم ہو سکتا ہے۔

" نادان لوگ مجھ پر ہنستے تھے۔ (کہ) نوجوان شاعر اپنی طبیعت کی بلند پروازی دکھا رہا ہے۔ (اس نے) ناامیدی میں امید ڈھونڈھ نکالی، (اور) انت میں انت پیدا کیا۔ ہاں مجھے خود اس روشنی کو دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ میری روشن کی ہوئی ہے میں اپنے تیر کا زخمی ہوں خود نئی دنیا میں نہ رہ سکا ... لیکن مجھے معلوم ہے کہ میری دنیا اُسوقت بھی قائم رہے گی جب نہ میں ہوں گا نہ مجھ پر ہنسنے والے "

اس نظم میں کچھ تو ان لوگوں کیطرف اشارہ ہے جو انقلاب کی کامیابی ناممکن سمجھتے تھے اور انقلابیوں پر ہنستے تھے کچھ ان لوگوں پر جن میں شاعر خود شامل ہے اجرا افسوس ہے کہ انقلاب کے دوست ہونے کے باوجود پرانی زندگی کے اسقدر عادی تھے کہ دوستی پوری طرح سے نبھ سکے بلوک نے جو ۱۹۱۴ء میں کہدیا تھا وہ ہمیشہ کیلئے تھا۔

ہم روس کے پرخوف زمانے کے بچے ہیں۔ لیکن اگر ہماری لاشوں پر چیل کوے بھی منڈلائیں

تب بھی اے حضرا تو اپنا جلوہ انہیں کو دکھا جو اس کے مستحق ہوں ! "

انقلاب کے معنی سمجھنا اس میں روحانی حصہ لینا روسی شاعروں کیلئے ایک زندگی اور موت کا سوال تھا۔ بلوک نے انقلاب کو اپنی طور پر سمجھ لیا اور جو کچھ اُس سے ہو سکتا تھا انقلاب کی خدمت میں پیش کیا۔ اُسکا ہمعصر شاعر یسینن، اگرچہ بولشیوکوں سے ہمدردی رکھتا تھا اور وہ اُسکی قدر بھی کرتے تھے لیکن وہ انقلاب کے روحانی پہلو کو نہ سمجھ سکا اور اس سے اُسکو اتنی تکلیف ہوئی کہ اُس نے خودکشی کرلی۔ یسینن کی شہرت بہت تھی، وہ پہلا شاعر تھا جس نے روسی گاؤں اور کسانوں کی زندگی کے سمپورن روپ کو سمجھا اور بیان کیا۔ روس کے حسن کا اُس پر بہت اثر تھا اور روس سے اسکو محبت تھی۔ لیکن روسی خود اور اُنکی زندگی کی آرزوئیں اور اصل مقصد اُس کیلئے ایک پہیلی تھے جسکے بوجھنے میں اُس کے شاعرانہ الہام نے اُسکو کوئی مدد نہیں دی۔

شاعر بریوسف کا بھی یہی انجام ہوا اس نے روسی شاعری کی بہت خدمتیں کی ہیں۔ نئے مضامین نئے طرز ادا ایجاد کئے ہیں۔ انقلاب پر بھی اُس نے چند نظمیں لکھی ہیں جنمیں سے ایک میں کہتا ہے

"اے بادِ خزاں تو سمندر سے گھاٹیوں تک، گھاٹیوں سے پہاڑوں کی چوٹیوں تک گھومتی پھرتی ہے کیا تجھے نہیں معلوم کہ ان وسیع میدانوں کے لوگ سب ایک جھنڈے کے نیچے متحد ہوگئے ہیں۔ ہمارے ملک پر ایک سورج چمک رہا ہے جس کی روشنی تمام ملکوں پر پھیل جائیگی۔ اگرچہ ہم خود غریب اور بھوکے پیاسے ہیں۔ ہاں اے ہوا یاد رکھ۔ باوجود ان جھگڑوں تکلیفوں اور غربت کے روس کو فتح پر فتح ہو رہی ہے، وہ اپنی آرزوؤں میں استوار ہے اُس کی قوت اور جرأت دم بدم بڑھ رہی ہے اور وہ دنیا کی ساری قوموں کی رہنمائی کر رہی ہے ! "

لیکن پھر بھی بریوسف کو نئی زندگی میں کوئی آشیانہ نہ ملا۔ انقلاب کے سمجھنے کے لئے بلوک کے جیسے دل اور دماغ کی ضرورت تھی۔

اس مضمون میں صرف بہترین شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ یوں تو میں کہہ چکا ہوں

خدا جانے کتنے شاعروں نے انقلاب پر رائے زنی کی ہے۔ منجملہ اُنکے ایک خاتون آننا آخماتوا ہیں جن کی انوکھی نظموں کے عجیب مضمون میں ابھی تک سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ ایک نظم میں فرماتی ہیں۔

"یہ زمانہ اوروں سے کس لحاظ سے بُرا ہے ؟ کیا اس وجہ سے کہ ایک ہزار بیماریوں کے بیچ (یعنی روس) کی سب سے مہلک بیماری کو اُس نے اچھا کرنیکی کوشش کی اور اس میں ناکامیاب ہوا ؟"

ہم ہندوستانی روسی انقلابی شاعری سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے شاعروں میں سے کسی کو آج تک اتنی توفیق نہیں ہوئی ہے کہ وہ اُس پیغام کو جو ہندوستان دنیا کیلئے لایا ہے سمجھنے کی کوشش کرے۔ ہم ابھی تک یا تو ایران کے انگوروں کو ترستے ہیں یا اقبال کی طرح صرف حجاز کی کھجوروں میں ذائقہ پانے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ اس بیچارے ملک کو جس میں ہم رہتے ہیں جس کیطرف بے توجہی کرنے سے ہمارا یہ انجام ہوا ہے کوئی نہیں پوچھتا اور جب ایک شخص نے ہمارا سارا غصہ اور ملامت اور دنیا کی تمام آفتیں اپنے سر لیکر ہمکو ہماری ہستی کے معنے سمجھانا چاہا تو ہم نے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا۔ ترک موالات کی تحریک نے ہم کو ایک نظم بھی نہ دی جس کو ہم یاد کرکے خوش ہوتے۔ بھارت ماتا نے جس کی گود میں ہم صدیوں سے بسے ہوئے ہیں ایک دیدار کا موقعہ دیا تھا۔ لیکن تب بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں اور ہم نے دل سے اس کی محبت کا کوئی اظہار نہ کیا۔

شادی

(۱)

قدرت نے لاکھوں قسم کی مخلوق پیدا کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر ایک کا جفت بھی سوائے قفنس یا موسیقار کے جسکی اصلیت کا بھی یقین نہیں۔ ہر مخلوق کا جفت دیکھنے سے شادی النظر میں غائت جو سمجھ میں آتی ہے وہ صرف تناسل یا دوام نسل ہے لیکن نظر تعمق سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شادی خصوصاً حضرت انسان کیلئے ایک بڑی نعمت ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے۔ اتفاق۔ ایثار۔ ہمدردی۔ رحم کی تعلیم ہوتی ہے۔ درحقیقت عمر کا زیادہ حصہ عیش و آرام امن و سکون سے بسر کرنیکے لئے ضروری ہے کہ جفت اچھا ہو جبتک خانگی سکون و اطمینان میسر نہو کوئی شخص کسی مہتم بالشان کام کے سرانجام کا اہتمام نہیں کرسکتا۔ اس حکیم مطلق نے ہر چیز میں نفع و ضرر رکھا ہے آدمی عقل کی مدد سے نفع سے مستفید ہوتا ہے اور ضرر سے بچتا ہے شادی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں میرے خیال میں شادی صرف ان چند افراد عالم کیلئے مضر ہو سکتی ہے جو دنیا میں کوئی خاص انقلاب پیدا کرنیکی کوشش یا کسی علم یا فن کی تحقیق و تکمیل میں مصروف ہوں کہ شادی کرنے سے انکو پورا وقت اپنے مشاغل کے لئے نملیگا باقی سب کیلئے شادی باستثنائے چند خاص حالات (جنکا میں آگے ذکر کرونگا) ہمیشہ مفید ہے۔ بہت سے لوگ (جنمیں عورتیں بھی شامل ہیں) جنکی شادیاں ہو چکی ہیں اکی سیکڑوں برائیاں بتائیں گے لیکن ذرا سے غور کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ نفس شادی میں کوئی برائی نہیں۔ برائی جو کچھ ہے ان رسوم و قواعد کی وجہ سے جو کہ رائج اور ان شرائط کو نظرانداز کرنے سے جو شادی کیلئے ضروری ہیں۔ اب میں نہایت مختصر طور پر شادی کے فوائد بیان کرتا ہوں۔

وھوھذا

شادی سے کتاب زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا ہے اور نئی نئی ذمہ داریاں

پیدا ہو جاتی ہیں لیکن جفت ایک ایسی ہمدرد اور ہاتھ بٹانے والی ہستی ہے کہ شادی کے بعد بہت بڑے بڑے کام کئے جا سکتے ہیں۔ انسان بہت سے گناہوں اور بیماریوں سے بچتا ہے۔ اتفاق کی قوت اور فوائد اور نا اتفاقی کی برائیاں شادی کے بعد زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اولاد کا لطف بغیر اس کے حاصل نہیں۔ تعلیم کی خوبیاں ایک خاص صورت میں محسوس ہوتی ہیں صحت کی حفاظت اور عمدہ تربیت کا خیال راسخ ہو جاتا ہے۔ شادی کے خوب ہونیکی سب سے عمدہ دلیل یہ ہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے اسے ناجائز نہیں قرار دیا جو لوگ شادی کے خلاف ہیں انکو چاہئے کہ یورپ کے ازمنۂ مظلمہ کی تاریخ دیکھیں تو نہ صرف پادریوں اور ننوں کے بلکہ عام یورپ کے حالات سے یقیناً آنکھیں کھل جائیں گی۔

(۲)

شادی کے بعد فکریں اور تکلیفیں پیدا ہو جانیکے تین سبب ہیں (۱) ناقص تعلیم (۲) عدم مناسبت زوجین (۳) عدم مناسبت خاندان زوجین۔ اب ہر سبب کی تفصیل و تشریح ملاحظہ ہو۔

(۱) ناقص تعلیم و تربیت | اسوقت تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ مرد عورت دونوں کیلئے یکساں ہے لیکن اب میں دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ گزارش کرونگا (i) مردوں کا استحقاق تعلیم مسلمہ ہے اور ہر شخص لڑکوں کو عمدہ تعلیم دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن نہایت افسوس ہے کہ عمدہ سے عمدہ تعلیم کے معنی بی۔ اے یا ایل ایل بی کے لئے جاتے ہیں ہر شخص دیکھتا ہے کہ بی اے اور ایل ایل بی ضرورت سے زیادہ ہیں۔ پھر بھی وہ عمدہ اور اعلیٰ تعلیم کو انہیں سندوں میں محدود سمجھتا ہے میرے خیال میں تعلیم بالکل فضول ہوگی۔ اگر حسب ذیل فوائد نہ حاصل ہو سکے۔

(i) حفاظت نفس (ii) ایماندارانہ اور مفید زندگی بسر کرنا (iii) خالی اوقات میں دلچسپی۔

(i) حفاظت نفس ...... اسپر طویل بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ بچپن میں کسی شخص کو عام اور ضروری قواعد حفظان صحت کی تعلیم نہیں دیجاتی اسکی خاص وجہ یہ ہے کہ والدین خود ناواقف ہوتے ہیں مگر زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حکیموں اور ڈاکٹروں

کی اولاد بھی اس ضروری بات سے ناواقف ہوتی ہے۔ بعض لوگ بڑے ہو کر حکیم یا ڈاکٹر بنتے ہیں
لیکن اسوقت جبکہ اس ناواقفیت کی وجہ سے ایسا نقصان اٹھا چکتے ہیں جس کی تلافی ممکن نہیں علم الحیات
و علم النفس سے ناواقف والدین یہ نہیں سمجھ سکتے کہ بچے کی صحیح تربیت کسطرح کیجائے کہ ہر عضو و قوت
کافی نشو و نما حاصل کر سکے۔ کس قسم کی اور کسقدر تعلیم دیجائے۔ جو مفید ہو۔ جس سے صحت نہ خراب ہو
اور جسمیں خرچ کم ہو۔ جو زیادہ مفید اور جلد مفید ہو۔ والدین غیر ضروری اور زائد از ضرورت اور
بے قاعدہ تعلیم سے بچے کے ذہن۔ حافظہ۔ دل و دماغ۔ صحت کو خراب کر دیتے ہیں۔ قواعد حفظان صحت
کی ناواقفیت کیوجہ سے یہ نہیں جانتے کہ بچے کو کیسی اور کتنی غذا۔ کیسا اور کتنا لباس کتنی ہوا۔ کیسی
ورزش چاہیئے جس سے صحت اور تعلیم دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایسی ناقص پرورش و تعلیم کے
نوجوان نہ اپنے لئے مفید ہو سکتے ہیں نہ خاندان۔ قوم۔ ملک مذہب کیلئے اور اسی وجہ سے شادی
کے بعد مصائب و افکار میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

(۱۱) ایماندارانہ اور مفید زندگی بسر کرنا۔

زندگی بسر کرنے سے محض اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنا مقصود نہیں انسان متمدن ہے وہ
جبتک متعلقین۔ خاندان۔ اہل قوم۔ اہل وطن۔ اہل مذہب۔ ابنائے ملک کی تھوڑی سی مدد نہ
کر سکے میرے خیال میں اسکی زندگی مفید زندگی کہلانیکی مستحق نہیں ہے۔ ہماری ناقص تعلیم و پرورش
کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم اپنے خاندان و متعلقین کو ضروری امداد نہیں دے سکتے اور چونکہ ہم دوسروں
کی امداد نہیں کر سکتے لہذا انکی امداد سے محروم ہیں اسوقت نہ صرف ہر چیز گراں ہے بلکہ بہت سی
ایسی چیزیں ضروریات زندگی میں داخل ہو گئی ہیں۔ جنکا پہلے کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ہمارے
آبا و اجداد جو حیثیت قائم کر گئے ہیں اس پر اگر ہم کچھ ایزاد نہیں کر سکتے تو اس کا قائم رکھنا ضروری
خیال کرتے ہیں۔ لیکن ناقص تعلیم و پرورش کی بدولت ہمارے قوا تنازع للبقا اور جدوجہد
معیشت میں پورا کام نہیں دیتے اسپر اشیاء کی گرانی اور ضروریات زندگی کا اضافہ مزید ہے لہذا
ہم ہر جائز و ناجائز طریقے سے روپیہ پیدا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ اگر ہم آبائی حیثیت کو نہیں قائم

کر سکتے تو ہم اس میں خواہ کتنا ہی عاقلانہ اور مفید تغیر کیوں نہ کریں بدنامی کا ٹوکرا ہمارے سر پر ہوتا ہے۔ اور ہم سوسائٹی میں نکو بنتے ہیں۔ اگر تعلیم عمدہ ہو تو یقیناً کچھ دنوں میں سوسائٹی کا معیار بھی درست ہو جائیگا۔ اور جائز طریقہ پر روپیہ پیدا کرنیکی ضرورت بھی کم ہو جائیگی۔

(iii) خالی اوقات میں دلچسپی ــــ ہر شخص جانتا ہے کہ مسلسل محنت خواہ دماغی ہو یا جسمانی مضر صحت ہی لہذا جس طرح ہوتا ہے فرصت کے اوقات نکالے جاتے ہیں اب ان اوقات فرصت کو اس صرف کرنا چاہئے کہ پیدا شدہ کسل دور ہو جائے اس کے لئے بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً شاعری مصوری۔ موسیقی۔ مضمون نگاری۔ ورزش کھیل وغیرہ اور انکی طرف رجحان بھی ہے۔ لیکن ضرورت ایسی تعلیم کی ہے جو ان مشاغل کو باقاعدہ اور مفید بنا دے۔ یہ نہیں کہ شطرنج یا تاش کھیلنے بیٹھ گئے تو صبح کر دی گانے کا شوق ہوا تو یا تو کسی ڈہاڑی یا رنڈی کے گھر پڑے ہوئے ہیں یا بیوی کا زیور تک بیچکر گراموفون کے ریکارڈ منگوا رہے ہیں۔ شاعر ہیں تو جبتک عمدہ مطلع موزوں نہو پنسل ہاتھ میں ہے اور کاغذ پر نگاہ جمی ہوئی ہے اس طرح کا بیجا انہماک کاروبار میں ابتری پیدا کر دیتا ہے جس سے مالی نقصان ہوتا ہے۔ اخراجات بڑھتے ہیں متعلقین کیطرف کم التفات رہتا ہے جس سے خانگی امن و انتظام میں خلل پڑتا ہے کسی مفید کام کے لئے وقت نہیں بچتا۔ پھر اصل غایت فوت ہو جاتی ہے۔

(۳)

یہانتک جو کچھ میں نے لکھا گو اسمیں بہت سی باتیں لڑکیوں کے متعلق بھی ہیں پھر بھی کچھ تفصیل کی ضرورت ہے۔ وہو ہذا۔ باوجود اس قدر تعلیمی ترقی کے مسئلہ تعلیم نسوان ابھی تک پورے طور سے حل نہیں ہوا اور دو فرقے موجود ہیں۔ ایک موافق۔ دوسرا مخالف۔ مخالفین یہ کہتے ہیں کہ تعلیم سے آزادی خودرائی۔ بیدینی۔ بیحیائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور لڑکیاں فیشن میں مبتلا ہو کر مذہب کو پس پشت ڈالدیتی ہیں اور خاندانی اعزاز و وقار کو کھو بیٹھتی ہیں۔ تعلیم یافتہ لڑکیاں خصوصاً وہ جنہوں نے اسکول میں تعلیم پائی ہے ہیون کیطرح شبتہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان اعتراضات کے

باوجود مخالفین بھی لڑکیوں کو خانگی طور پر تھوڑی بہت تعلیم ضرور دیتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ تعلیم کی مخالفت نہیں بلکہ طریقہ و نصاب تعلیم کی مخالفت ہے جب طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ ارشاد ہو چکا ہے تو مسلمانوں کو مخالف نہ ہونا چاہئے۔ جو خرابیاں تعلیم نسواں کے متعلق بیان کیجاتی ہیں انکے رد کرنے کا سب سے آسان اور عمدہ نسخہ یہ ہے کہ سب سے پہلے مذہبی اور اخلاقی تعلیم ہونی چاہئے۔ اس کے بعد جس طرف پڑھنے والی کی رغبت ہو۔ علاوہ بریں بارہ تیرہ سال کی عمر تک غیر مستند مصنفین کے مطالعہ سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ یہ طریقہ لڑکوں کے لئے بھی یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

آج کل لڑکیوں کو عموماً دو قسم کی تعلیم دیجاتی ہے (۱) سراسر رواج زمانہ کے مطابق (۲) بالکل پرانے طریقہ سے۔ پہلا گروہ اردو۔ فارسی۔ انگریزی حساب مضمون نگاری کی تعلیم دیتا ہے۔ دوسرا قرآن شریف۔ میلاد شریف۔ راہ نجات۔ قابلیت تحریر سے آگے نہیں بڑھتا۔ پہلے گروہ کے نزدیک مذہبی اور اخلاقی تعلیم بالکل غیر ضروری ہے صرف آداب ملاقات و مجلس سکھا دئے جاتے ہیں تعلیم عموماً ناکمل ہونیکی وجہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ ہاں فیشن پرستی اور میموں کی ریس کرنی آجاتی ہے اور اخبار و ناول بینی کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے مرض کا لفظ اسواسطے استعمال کیا ہے کہ اس قسم کی تعلیم پائی ہوئی لڑکیاں انہیں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرتی ہیں اور اسکو شوہر پر رعب جمانے کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ دوسرے گروہ میں نہ مذہبی و اخلاقی تعلیم ہے نہ محض دنیاوی کیونکہ قرآن شریف بے معنی پڑھایا جاتا ہے اور راہ نجات یا ایسی ہی دوسری کتابوں میں سوائے چند معمولی مسائل کے اور کچھ نہیں ہوتا جس سے نہ خصوصیات و ضروریات مذہب کی واقفیت ہوتی ہے نہ اوہام لاطائل و عقائد باطلہ کی بیخکنی۔ میرے خیال میں تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ ضروریات و خصوصیات مذہب سے واقفیت ہو۔ اخلاق کی درستی ہو۔ عقائد و اوہام باطلہ کی بیخکنی ہو۔ دنیا میں کارآمد اور کم از کم زندگی بسر کرنیکا طریقہ معلوم ہو۔ شوہر کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکیں۔ میں نے مفید زندگی بسر کرنیکے لئے علم الحیوۃ۔ علم التنفس۔ علم حفظان صحت کی ضرورت ثابت کی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر ایک کو ان علوم میں انتہائی تعلیم دیجائے۔ ہاں مبادیات کی تعلیم ضروری

ہے۔ سینا پرونا۔ کھانا پکانا۔ امور خانہ داری یہ بعد کی چیزیں ہیں جب ہر شخص اپنی اولاد کے متعلق یہ خیال رکھتا ہے کہ وہ جوان ہوگی اور صاحب اولاد تو پہلے ایسی چیزوں کی تعلیم دینی چاہئے جو اسکو تندرست رکھنے اور اسکی اپنی اولاد کی تربیت نشو و نما تعلیم میں معین ہوں یہ امر مسلمہ ہے کہ صحت جسمانی کو برقرار رکھنے اور جسمانی نشو و نما کی امداد کے لئے کسی نہ کسی قسم کی ورزش کی ضرورت ہے۔ اب یہ امر کس قدر باعث حیرت و افسوس ہے کہ وہی والدین اور بزرگ جو لڑکوں کو کھیل کود اور دوڑ دھوپ کی ترغیب دیتے ہیں لڑکیوں کو ایسی فرحت بخش اور ممد صحت اشغال سے روکتے ہیں اور عذر یہ ہے کہ لڑکیاں شوخ۔ بیباک۔ بے شرم ہو جاتی ہیں۔ انکے نزدیک بیمار۔ دبلا۔ پتلا کمزور ہونا مقتضائے شرافت ہے۔ اور نڈھال و مضمحل رہنا لازمۂ شرم و حیا۔ انکو اسکا بالکل خیال نہیں کہ کمزور والدین سے کمزور اولاد اور کمزور قوم پیدا ہوگی۔ اور یہ کمزوری بڑھتے بڑھتے آئندہ نسلوں کیلئے مہلک و فانی ثابت ہوگی۔ انکو خیال نہیں آتا کہ شرعاً و قانوناً جان کی حفاظت ضروری ہے جو بغیر حفاظت صحت نہیں ہوسکتی وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بیمار دنیا کی کسی لذت سے پورے طور پر بہرہ اندوز نہیں ہوسکتا جسکی صحت اچھی نہو وہ کوئی کام پورے طور پر اور اچھی طرح نہیں کرسکتا۔ متعلقین اسکی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ وہ روپیہ جو دوسرے مفید اور آرام بخش کاموں میں صرف ہونا چاہئے تھا اس کے اوپر صرف ہو جاتا ہے۔ جب بی بی کی صحت ایسی ہو تو گھر میں اطمینان کی کیا صورت ہوسکتی ہے اور چونکہ ایک کی بیماری کی وجہ سے تمام کام اور فکریں دوسرے کے سر پڑ جاتی ہیں۔ اس لئے دوسرا شخص بیمار سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ بے شرمی و بیباکی کا خوف بھی فضول ہے کیونکہ جس طرح لڑکے جوان ہوکر وہ کھیل کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جو بچپن ہی کیلئے مناسب ہیں۔ لڑکیاں بھی بڑے ہونے پر یقیناً چھوڑ دینگی اور انکے نہ چھوڑنیکی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

(۴)

عدم مناسبت زوجین | کتنے افسوس کی بات ہے کہ باوجود اس بات کی اہمیت تسلیم کرنے کے کہ زن و شوہر کا مزاجی اختلاف زندگی کو ناگوار بنا دیتا ہے والدین اس معاملہ میں کافی غور و خوض نہیں کرتے

گو والدین میرے اس دعوے پر ناک بھوں چڑھائینگے۔ لیکن واقعات کا وجود مجبور کر رہا ہے کہ میں
ان کی خفگی کیطرف سے بے پروا ہو جاؤں۔ نسبت کرتے وقت والدین دیکھتے ہیں کہ گھر کھاتا پیتا ہے
لڑکا برسر روزگار ہے یا اس بات کی امید ہے کہ کمائیگا۔ کوئی خاص متعدی یا مہلک مرض یا چال چلن
برا نہیں (عموماً جوانی کی خفیف لغزشیں بامید اصلاح آئندہ نظرانداز کر دیجاتی ہیں) لڑکی کے متعلق یہ
دیکھا جاتا ہے کہ صورت شکل بری نہو۔ اور خط وکتابت کر سکتی ہو۔ پرانے خیال کے والدین حسب نسب
کو دیکھتے ہیں اور روزی کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ تدبیر کو کچھ بھی وقعت نہیں دیتے محض تقدیر
پر شاکر ہیں۔ اس زمانہ کے والدین بی اے کی ڈگری چاہتے ہیں یا روپیہ یہ لوگ جب مجبور ہوتے ہیں تب
تقدیر کے قائل ہوتے ہیں ورنہ تدبیر ان کا سب سے زیادہ واجب التعظیم دیوتا ہے۔ بس یہاں پہنچکر
والدین کی دریافت ختم ہو جاتی ہے۔ اور نسبت پختہ۔ لڑکوں سے استمزاج بھی کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں ان
بیچاری اس سے بھی محروم ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ان سے پوچھا بھی جائے تو بھی وہ جواب نہ دینگی۔ کیونکہ
رواج مانع ہے اور تعلیم اس قسم کی ہے نہیں جو بعنوان شایستہ انکار کرنیکی ہمت دلائے۔ میرے علم
میں دو ایک جگہ جہاں لڑکیوں نے بہت ہمت کر کے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے وہاں والدین کے
غلط مصالح نے اس ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ نہیں کی گو بعد میں نادم و پشیمان ہوئے۔

اب والدین مجھے بتائیں کہ کونسی بات انہوں نے ایسی دریافت کی جس سے یہ معلوم ہو گیا
کہ لڑکے اور لڑکی کے خیالات اور عادات مماثل ہیں ایسی شادیوں کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہئے
یعنی تمام عمر کی مصیبت گو ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ میاں بیوی کے خیالات وعادات میں مماثلت ہو
لیکن یہ الشاذ کالمعدوم میں داخل ہے دوسرے اس میں والدین کی حسن سعی کو بھی دخل نہیں۔ ایسی
حالت میں زیادہ تکلیف ونقصان ہمیشہ بی بی کے حصہ میں آتا ہے۔ کیونکہ وہ فریق کمزور ہے اور مطیع
ہم نے مانا کہ ایک لڑکا اچھی صورت کا ہے تعلیمیافتہ ہے۔ برسر روزگار ہے صحتور ہے۔ نیک چلن ہے عمدہ
حسب نسب رکھتا ہے اور ایک لڑکی حسین ہے۔ کمسن ہے تعلیمیافتہ ہے۔ سینا پرونا۔ کھانا پکانا۔ امور خانہداری
تربیت اطفال سے اچھی طرح واقف ہے نیک سیرت ہے لیکن یقینی ہے کہ ان دونوں کی زندگی

تلخ ہو جائیگی اگر دونوں محرور المزاج ہیں یا ضدی۔ یا ایک پرلے سرے کا جھوٹا ہے دوسرا سچا۔ یا ایک پر مذہب کا رنگ غالب ہے اور دوسرے پر فیشن کا یا ایک با انتظام ہے دوسرا فضول خرچ یا ایک لاابالی مزاج کا ہے اور دوسرا سنجیدہ اور گھر بنانیوالا۔ ہمیشہ بڑے بڑے واقعات سے نتائج اخذ کرنا غلط ہے۔ عموماً چھوٹے چھوٹے واقعات سے دلیں کبیدگی پیدا ہوتی ہے جو آگے چلکر اپنی زیادتی کی وجہ سے زندگی کو ناقابل برداشت کردیتی ہے۔

میں اوپر تحریر کرچکا ہوں کہ لڑکیوں سے شادی کے بارے میں اگر کچھ پوچھا بھی جائے تو بھی وہ جواب نہ دینگی۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسطرح لڑکیوں کو اظہار رائے پر آمادہ کیا جائے میرے خیال میں اگر والدین خود فضول رسموں سے احتراز شروع کریں۔ اخلاقی تعلیم کو ترقی دیجائے زن و شو کی ناموافقت کے حالات میں بلا اس خیال کے کہ ہمارے بزرگوں یا خاندان والوں نے ایسا کیا ہے یا نہیں اس مجرب نسخہ سے کام لیا جائے جسے اصطلاح شرع میں طلاق کہتے ہیں تو آئندہ نسل کی لڑکیاں یقیناً ناموافقت و طلاق سے بچنے اور اپنی زندگی اچھی طرح گذارنے اور اپنا شرعی حق حاصل کرنیکے لئے اپنی رائے کا مناسب طور پر اظہار کرینگی۔

(۵)

عدم مناسبت خاندان زوجین | عنوان بالا اکثر و بیشتر ناظرین کیلئے حیرت خیز و تعجب انگیز ثابت ہوگا لیکن اگر وہ تھوڑے صبر و سکون کیساتھ میرے دلائل پر غور فرمائینگے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اسکی اہمیت کے ضرور مقر ہو جائینگے۔ یہ خیال عام ہے کہ جفت اچھا ہونا چاہئے سسرال والے چاہے جیسے ہوں۔ لڑکے کے لئے یہ خیال نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ داماد پر سسرال والوں کی اطاعت ضرور نہیں اور نہ انکی ناخوشی کا داماد پر کوئی خاص اثر ہوتا ہے اور جبتک داماد کو غیر معمولی فائدہ اور آرام کی امید نہیں ہوتی وہ سسرال سے متمتع ہونا باعث ننگ سمجھتا ہے۔ عموماً وہی لوگ سسرال سے زیادہ متمتع ہوتے ہیں جو کسی اکلوتی بیٹی کے شوہر ہوتے ہیں اور سسرال میں جا رہنے پر بھی انکی کافی نازبرداری ہوتی ہے لیکن لڑکی کے لئے اس معاملہ میں سوچ بچار کی ضرورت ہے کیونکہ شوہر

کے برسر روزگار یا مختار ہونے تک وہ کلیتہً ساس سسر کی دست نگر رہتی ہے اور بعد میں بھی اُن پر کافی دباؤ رہتا ہے شرع اور قانون نے جو وسیع اختیارات والدین کو اولاد کے بارے میں عطا کئے ہیں وہ گو معقول وجوہ پر مبنی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ خصوصاً لڑکے کی شادی کے بعد انکا استعمال بالکل ناجائز طریقہ پر ہوتا ہے۔ لڑکے کے والدین بہو پر بھی بیٹے کے برابر اپنی اطاعت واجب سمجھتے ہیں یہ پہلی غلطی ہے جس سے اور غلطیاں اور شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ الجنۃ تحت الاقدام امہاتکم بالکل صحیح اور بجا ہے لیکن یہ بیٹے کیلئے ہے نہ کہ بہو کے لئے شرع شریف، قانون، اخلاق، رواج کسی کی مدد سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ والدین کے ہر جائز و ناجائز حکم کی بنا پر بی بی کا کلا اؤنٹ دینا اور اسکے جائز حقوق کا پامال کرنا مباح ہے۔

حکومت خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو اسکا نشہ اسقدر تیز ہوتا ہے کہ بڑے بڑے عالی ظرف بہک جاتے ہیں یہی نشہ حکومت و فرمانروائی بہو پر ساس کے مظالم کا اصلی سبب ہے۔ بہو شروع شروع میں کچھ شرم کچھ ادب کچھ اس بزرگانہ نصیحت کے خیال سے خاموش رہتی ہے جو اس کے والدین اسے ساس کی اطاعت کے متعلق کر چکے ہیں علاوہ بریں سسرال والوں اور خصوصاً شوہر کی مزاج شناسی کا زمانہ بھی خاموشی میں گذرتا ہے لیکن اس مدت کے بعد وہ شوہر کے سامنے اپنی رنج و تکلیف اور ساس نندوں کی بدسلوکی کا اظہار کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر مجبور ہو کر بیٹے کے سامنے ماں اور بھائی کی موجودگی میں بہنوں کی برائی بیان کرتی ہے اگر شوہر بار اٹھا سکتا ہے تو وہ والدین سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور بی بی کا تابعدار کہلاتا ہے اور بی بی اس علیحدگی کا موجب قرار دی جاتی ہے ورنہ بی بی کی تکالیف اور ماں بہنوں کی بدسلوکیوں پر کڑھتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔ اگر ماں بہنوں کے پاس جاتا ہے تو وہاں بی بی کی برائیاں سنتا ہے اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شوہر بیچارہ دو طرفہ زد میں آکر تقریباً بیکار ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ زمانہ شباب جو بہترین حصہ عمر کا ہے جب اس حالت میں گذرے تو کون شادی کو اچھا کہیگا۔

قابل غور یہ بات ہے کہ وہی ماں جو نو مہینے پیٹ میں رکھتی ہے زمانہ حمل اور شیر خواری میں

سخت سے سخت تکلیف اٹھاتی ہے تکلیف ولادت و پرورش برداشت کرتی ہے آپ گیلے میں سوتی ہے لیکن بچے کو سوکھے میں سلاتی ہے بچے کیلئے بڑی سے بڑی تکلیف اٹھاتی ہے حتی کہ ارتکاب گناہ میں پس وپیش نہیں کرتی۔ بڑے ارمان کے ساتھ شادی بیاہ کرتی ہے آخر بیاہ کے بعد ہی کیوں بیٹے اور اس بہو کی جسے وہ خود پسند اور منتخب کرکے لائی ہے مخالفت کرنے لگتی ہے ؟ اسکی پہلی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے اور فطرتی ہے یعنی رقابت۔ بیٹے کے دل میں اب ماں کے علاوہ دوسرے کی محبت بھی جاگزیں ہوگئی جو ماں کو ناگوار گذرتی ہے اور اسی وجہ سے ماں کے دل میں مخالفت کی تحریک ہوتی ہے اگر بیٹا اکلوتا ہے تو مخالفت بھی زیادہ شدید ہوتی ہے اور اگر دو چار بیٹے ہیں تو صرف کنواروں سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے جب سب کی شادی ہوجاتی ہے تو سبھی سے کچھ نہ کچھ مخالفت ہوجاتی ہے۔ اور صرف وہی بہو مقبول رہتی ہے جو ساس کی بدمزاجی کو زیادہ برداشت کرسکے۔

دوسری وجہ ساس بہو کی مخالفت کی تفاوت عمر ہے۔ ساس کو عموماً اپنے تجربہ اور کبر سنی پر ایک قسم کا ناز ہوتا ہے مزید براں وہ بہو کو کم از کم اولاد ہونے تک بالکل بچہ اور ناداں سمجھتی ہے حالانکہ جانتی ہے کہ سوپ کے جائے سوپ ہی میں نہیں رہتے یہ بالکل ممکن ہے اور اسکی بہت سی مثالیں ہیں کہ ایک ہی واقعہ سے دو آدمی مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر دونوں صحیح ہوتے ہیں۔ ساس کے زمانہ جوانی کو مدت گذر چکی ہے اور اس مدت میں بہت سے تغیرات رونما ہوتے جنکی وجہ سے بہت سی رایوں اور ضرورتوں میں تبدیلی کرنی پڑی ہیں یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی معاملہ میں بہو کی رائے ساس کی رائے سے زیادہ صائب اور بہتر ہو لیکن غرور کبر سنی تجربہ کاری تسلیم کرنا کجا بہو سے رائے لینے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ تفاوت عمر ہی کی وجہ سے۔ خیال۔ رجحان۔ شوق وغیرہ میں بھی کافی اختلاف ہوتا ہے۔ ساس کے پاس اپنے خاندانی و ذاتی تجربات کا ذخیرہ ہوتا ہے اور بہو کے پاس اپنے اور دونوں خاندانوں کے طرز معاشرت اور دینی و دنیوی حالت میں جتنا اختلاف ہوگا اتنا ہی دونوں کی رایوں میں۔

تیسری وجہ نندوں کا دخل بیجا ہے۔ فی الحقیقت بہو کی موجودگی میں کاروبار خانہ داری میں نند کا دخل غضب کا حکم رکھتا ہے۔ اگر نند کنواری ہے تو بھی اسے بھاوج کے زیر دست امور خانہ داری کا تجربہ حاصل کرنا چاہیئے اگر منکوحہ ہے تو مہمان سے زیادہ اسکی حیثیت نہیں۔ اور مہمان ایا فضولی چہ کار۔ لیکن ماں ہر معاملہ میں بیٹیوں سے صلاح لیتی ہے اور بہو کو پوچھتی بھی نہیں اس سے بہو کو رنج ہوتا ہے اور مخالفت پیدا ہوتی ہے اگر بہو سے کبھی رائے لیگی تو اسکو کوئی وقعت نہیں دیجاتی بلکہ اسمیں عیب نکالکر بیٹیوں کی رائے پر عمل ہوتا ہے۔ بیٹیاں اپنا اقتدار ظاہر کرنے اور یہ جتانے کیلئے کہ ماں کی زندگی میں ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ بہو کی رائے کو نہ صرف غلط ثابت کرتی ہیں بلکہ اسکو ذلیل و بدنام کرنیکی کوشش کرتی ہیں وجوہ مذکورہ بالا سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) یہ کہ بیٹیاں ماں کی ساختہ و پرداختہ ہوتی ہیں لہذا انکے اتفاق سے ایک سے زیادہ رایوں کی قوت ہمیں پیدا ہوتی (۲) بیٹیاں پرائے گھر کی ہوتی ہیں انکو اپنی سسرال کا بہت خیال ہوتا ہے۔ لڑکی کبھی میکے کیلئے اتنی تکالیف برداشت نہیں کرتی نہ اتنی قربانیاں کرتی ہے جتنی سسرال کیلئے۔ محض اسوجہ سے کہ سسرال اسکا آئندہ گھر ہے اور سسرال کی ظاہری و باطنی حالت کا درست کرنا اس کے آرام و نام آوری کا باعث ہے اسیوجہ سے میں نے نندوں کو غاصب قرار دیا ہے وہ یہ سمجھکر ایسی حرکتیں کرتی ہیں کہ ماں کے بعد ہمیں کون پوچھے گا۔ حالانکہ اگر وہ ماں کے برتے پر بھاوج کو نہ ستائیں تو یقیناً ماں کے بعد بھی انکی آؤ بھگت میں کمی نہ ہوگی۔

چوتھی وجہ سرکہ دمہ سے بہو کا دُکھڑا رونا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام باتیں دوسروں تک پہنچتی ہیں اور چونکہ اچھی بات بھی بُرے پیرایہ میں بیان کیجاتی ہے۔ لہذا نہ صرف بہو بلکہ سارے گھر کی جانب سے دوسروں کے خیالات خراب ہو جاتے ہیں جسکا اثر دیگر معاملات اور اعتبار پر پڑتا ہے۔ دوسرے لوگ ان باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور معمولی غلطیاں سخت عیوب کی صورت اختیار کر لیتی ہیں بعض ساس کی باتیں بہو سے اور بہو کی ساس سے کہہ کر دونوں

میں کدورت بڑھا دیتی ہیں خصوصاً اگر نوکرانیوں کو دخل کی اجازت دیگئی تو اپنی قدیم وابستگی کی وجہ سے اپنے آپکو ساس کیطرح محترم سمجھتی ہیں تو اسطرح معاملات بے انتہا ناگوار و ناموزوں صورت اختیار کرلیتی ہیں ساس شکایت کرتے وقت یہ ہوکو نہ صرف اپنے سے بلکہ بیٹے سے بھی علیحدہ چیز سمجھتی ہے اسکی بدنامی اسی کی ذات تک محدود خیال کرتی ہے حالانکہ بدنامی کا اثر ساس بہو بیٹے تینوں پر ہوتا ہے۔ ساس اپنے بیٹے کو یکندریجا ئیگی کوشش کرتی ہے کہ وہ بی بی کے کہنے میں ہے اسکو بہو نے تعویذوں کے ذریعے سے قابو میں کرلیا ہے اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیٹا ماں اور بی بی دونوں کی زد میں آجاتا ہے اور اس کی زندگی موت سے بدتر ہوجاتی ہے۔

(۶)

اب میں پھر ناظرین کے سامنے اپنی سابقہ رائے پیش کرتا ہوں جسے وہ اس ساس بہو کے جھگڑے میں بھول گئے ہونگے یعنی زوجین کے خاندانوں کی طرز معاشرت اور خیالات وغیرہ میں جتنی زیادہ مماثلت ہوگی اتنا ہی ساس بہو نند بھاوج میاں بیوی میں کم اختلاف ہوگا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عموماً لڑکیاں چچا۔ پھوپی۔ ماموں۔ خالہ کے گھر بیاہی جاتی ہیں لہذا عدم مناسبت خاندان زوجین کا بہت کم اندیشہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چچا۔ پھوپی۔ ماموں۔ خالہ کے یہاں مناسبت خاندانی کیوجہ سے شادی نہیں ہوتی بلکہ حسب و نسب کے خیال سے۔ حسب و نسب کا خیال گو اچھا ہے مگر اسمیں اچھائی کم ہے اور برائی زیادہ۔ ہمارے آبا و اجداد نے حسب و نسب کو اسوجہ سے شرط اولین قرار دیا تھا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ اور اجتماع قوت و اتحاد کے لئے یہ چیز ضروری اور بہتر تھی۔ اسی طرح کا ایک اور دستور بھی بعض خاندانوں میں رائج ہے یعنی لڑکیوں کو حصۂ شرعی نہ دینا۔ اس حصہ نہ دینے کی غائت صرف یہ تھی کہ مسلمان ایک ایسے ملک میں جہاں کے اصل باشندوں کے نزدیک سود لینا مذہبًا ناجائز نہیں تقسیم جائداد کے بعد پنپ نہیں سکتے۔ اور افلاس و فلاکت میں گرفتار ہو جائینگے۔ لہذا بعض اجل علما نے یہ طریقہ رائج فرمایا۔

حسب نسب کی اصل وجہ میں بیان کر چکا ہوں بفضلہ اسوقت مسلمانوں کی تعداد کافی ہے اور وجہ سابقہ باقی نہیں۔ اب لوگ اسکی پیروی صرف اسوجہ سے کرتے ہیں کہ پشتہا پشت سے یہ خیال متوارث وراسخ ہو چکا ہے۔ دنیا میں سوائے حضرت حسنین علیہ السلام کے کسی کا حسب ونسب ماں سے نہیں لیا گیا جسوقت مسلمانوں نے عرب سے باہر قدم نکالا اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا وہ غیر ممالک میں طیب خاطر یا بالضرورت یا بحکم حاکم قیام پذیر ہوئے۔ تاریخ نے مسلمانوں سے زیادہ رواداری قوم آجتک پیش نہیں کی۔ نہ تو ہر مسلمان صاحب اہل وعیال تھا نہ ہر ایک کی بیوی ساتھ تھی۔ علاوہ بریں اس زمانہ میں مسلمان عموماً ایک سے زیادہ نکاح کرتے تھے اور غیر اقوام میں۔ پھر بھی کل اولاد باپ کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ کیونکہ ؎

حسن نبات الارض من کرم اللہ۔ اب ثابت ہوگیا کہ ماں حسب ونسب کو بگاڑنے والی چیز نہیں ہے۔ مختلف اقوام میں شادی کرنے سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ تھا کہ مختلف خونوں کی آمیزش ہوتی تھی۔ اور ایک خون دوسرے کی برائیاں کرتا تھا آج کل ہندوستان میں دماغی اور عقلی انحطاط کی ایک خاص وجہ خاندان میں شادی کرنا ہے جس کی وجہ سے ایک ہی قسم کا خون ملتا ہے جو روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اور اسمیں خوبیاں گھٹتی اور برائیاں بڑھتی جاتی ہیں۔

سرِراہ

اشخاص ڈراما

ٹیہوں نفیٹک نیف (ایک سرِراہ سرائے کا مالک)
سیمیوں سرجائی پچ بارساف (ایک برباد شدہ زمیندار)
میریا گیوروفنا (اُسکی بیوی)
سادا (ایک ضعیف زائر)
نزاروفنا } (زائر عورتیں)
یفی موفنا }
فیدڑیا (ایک کارخانے کا مزدور)
یگوریسرک (ایک آوارہ گرد)
کوزما (ایک راہ چلتا مسافر)
ڈاکیہ۔
ڈینس (میڈم بارساف کا سائیس)
زائرین، گلّے بان، راہ گیر وغیرہ۔
(جائے وقوع۔ روس کا ایک جنوبی صوبہ)

ٹیہوں کی سرائے میں ایک کمرہ۔ دائیں طرف ایک میز اور بوتلوں سے بھری ہوئی الماری پیچھے کے رُخ ایک سڑک کیطرف کھلتا ہوا دروازہ، جس پر باہر ایک مکدر و سُرخ لالٹین لٹکی ہوئی ہے۔ فرش اور دیواروں سے لگے ہوئے بنچ زائرین اور راہ گیروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگ جنہیں لیٹنے کی جگہ نہیں ملی۔ بیٹھے بیٹھے سو رہے ہیں۔ آدھی رات

ہے۔ پردہ اُٹھتے وقت بادل کی گرج سنائی دیتی ہے اور بجلی کی چمک کھلے ہوئے دروازے میں سے نظر آتی ہے۔

تھیوں میز سے لگا کھڑا ہے۔ ایک بنچ پر فیڈیا دیوار کے سہارے بیٹھا ہے اور آہستہ آہستہ کنیٹرا بجا رہا ہے۔ اس کے قریب بارساف میلے کچیلے ٹھنڈے کپڑے پہنے بیٹھا ہے۔ ساوا، نزاروفنا اور یفی موفنا بنچوں کے قریب فرش پر لیٹے ہوئے ہیں۔

یفی موفنا (نزاروفنا سے) مائی بچارے بڑے میاں کو ہلاؤ جلاؤ! مجھے معلوم ہوتا ہے کہ انکی جان لبوں پر ہے!

نزاروفنا۔ (ساوا کے منہ پر سے اُس کے کوٹ کا کونا اٹھاتے ہوئے) نیک عیسائی! اے نیک عیسائی! زندہ ہو یا مرگئے؟

ساوا۔ مرنے کیوں لگا تھا؟ مائی، زندہ ہوں! (کہنی کے سہارے اٹھتا ہے) کمبخت میری ٹانگیں ڈھانک دو! بس ٹھیک ہے۔ سیدھی ٹانگ پر ذرا زیادہ بس ٹھیک ہے۔ خدا تمہارا بھلا کرے!

نزاروفنا۔ (ساوا کی ٹانگیں ڈھانکتے ہوئے) بھلے آدمی آرام کرو۔

ساوا۔ آرام کی کوئی صورت نہیں! یہ عذاب صبر کے ساتھ برداشت ہو جائے تو آرام کی کوئی پروا نہ ہو۔ گنہ گار کو آرام کا کیا حق ہے۔ اچھی زارہ، یہ شور کیسا ہے۔

نزاروفنا۔ خدا ہمیں طوفان بھیج رہا ہے۔ ہوا غرا رہی ہے اور مینہ کڑکڑاتے سے برسے جاتا ہے کھڑکیوں پر اور چھت پر ٹپ ٹپ گر رہا ہے سنتے ہو؟ آسمان کے طوفانی دروازے کھل گئے ... (گرج) یا الٰہی خیر......

فیڈیا۔ گرجتا ہے اور کڑکتا ہے اور غراتا ہے، اور برس نہیں چکتا۔ جنگل کی سی سرسراہٹ ہے... ہوا کتے کی طرح چیخ رہی ہے۔ اکپکپاتا ہے) کیسی سردی ہے۔ کپڑے بھیگ گئے، چاہو تو نچوڑ لو...... دروازہ کھلا ہوا ہے۔ (نرمی سے باجا بجاتا ہے) بھلے عیسائیو میرا باجا بھیگ گیا اسکی موسیقی جاتی رہی، ورنہ اسمیں سے ایسا راگ نکالتا کہ تمہارے ہوش اڑجاتے

ایسا زوردار! مثلاً کا ڈریل یا یالکا ... یا روسی ناچ گانا۔ ہمیں یہ سب آتے ہیں جب
میں گرانڈ ہوٹل میں ملازم تھا، تو میں نے بجایا! تو خاک نہیں، مگر کنسرٹینا بجانا خوب سیکھا اور
میں اب بھی بجا سکتا ہوں ... آواز (کونے میں سے) بے وقوف اور بیوقوف کی باتیں!
فیڈیا۔ اور یہ ایک بے وقوف کے منہ سے! (وقفہ)
نزاروفنا (ساوا سے) بڑے میاں، تمہیں چاہئے کہ گرمائی میں لیٹو اور اپنی ٹانگ کو گرماؤ (وقفہ)
بڑے میاں نیک عیسائی! (ساوا کو ٹہوکا دیتی ہے) تم جاں بلب ہو؟
فیڈیا۔ داوا تمہیں چاہئے کہ واڈکا کی ایک بوند پی لو۔ بس پی جاؤ، کچھ دیر پیٹ میں جلن ہوگی،
مگر تمہارے دل پر سے ہٹ جائیگی! پی ڈالو!
نزاروفنا۔ لڑکے فضول باتیں نہ بنا۔ بڑے میاں شاید اپنی روح خدا کے سپرد کر رہے ہیں اور
توبہ استغفار میں مشغول ہیں۔ اور تو ایسی باتیں کر رہا ہے، در یا جا بجا رہا ہے ...
بدتمیز گانا بجانا چھوڑ!
فیڈیا۔ کیوں بچارے کا ناک میں دم کرتی ہو؟ وہ اچھے نہیں ہیں، اور تم ... عورتوں کی
ناسمجھی! ... وہ بزرگ آدمی ہیں اور تم سے سخت کلامی نہیں کر سکتے اور تم خوش ہو کہ وہ
تمہاری بے وقوفی کی باتیں سن رہے ہیں، اور اس سے فائدہ اٹھاتی ہو .... داوا،
سو جاؤ۔ مت سنو! انہیں بکنے دو، توجہ نہ کرو .... عورت کی زبان شیطان کی جھاڑو
ہے۔ دانا اور بینا دونوں کو گھر سے نکال ڈالتی ہے۔ انکی ایک نہ سنو .... (اسکے
ہاتھوں کو خوف زدہ ہو کر ہاتھوں میں لیتا ہے) کتنے نحیف ہو گئے ہو! بالکل ہڈیوں کی
مالا! خون کا نام نہیں! کیا واقعی قریب المرگ ہو؟
ساوا۔ قریب المرگ کیوں ہوتا؟ خدا بے وقت موت سے بچائے ... کچھ عرصہ طبیعت خراب
رہے گی، پھر خدا کے فضل سے اچھا ہو جاؤنگا .... مریم مجھے غیر ملک کی موت سے بچائیگی
... میں تم پر جان دونگا ...

فیڈیا۔ دور کے رہنے والے ہو؟

ساوا۔ ولاگڈا کا۔ خاص شہر کا... میں ہاں مزدور ہوں۔۔

فیڈیا۔ اور یہ ولاگڈا کدھر ہے؟

ٹیہوں۔ ماسکو سے پرے... ایک صوبہ...

فیڈیا۔ اُفوہ! بڑے میاں بڑی دور سے آئے ہو! اور بالکل پیدل؟

ساوا۔ ہاں میاں، بالکل پیدل؟ زاڈونسک میں حضرت ٹیہوں کے مزار پر گیا تھا۔ اور اب مقدس پہاڑوں کیطرف جارہا ہوں... مقدس پہاڑوں سے اگر خدا نے چاہا، اڈیسا جاؤں گا.... کہتے ہیں وہاں سے یوروشلم سستا پہنچا دیتے ہیں... سنا ہے اکیس روبل میں....

فیڈیا۔ کبھی ماسکو بھی گئے ہو؟

ساوا۔ ہاں! پانچ مرتبہ....

فیڈیا۔ اچھا شہر ہے؟ (سگریٹ جلاتا ہے) قابل دید؟

ساوا۔ میاں، وہاں بہت سی مقدس زیارت گاہیں ہیں... جہاں بہت سی مقدس زیارت گاہیں ہوں، وہ جگہ ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔

بارساف (ٹیہوں کی طرف ٹیہوں کے پاس جاتا ہے) ایک مرتبہ پھر التجا کرتا ہوں! ضبط کیلئے!

فیڈیا۔ شہر میں بڑی چیز صفائی ہے... اگر خاک ہو، تو سڑکوں پر چھڑکاؤ کرنا چاہئے، کیچڑ ہو تو صفائی کرنی چاہئے۔ اونچے مکان ہونے چاہئیں... ایک تھیٹر... پولیس.... گاڑیاں... میں بھی شہروں میں رہا ہوں ــ میں جانتا ہوں۔

بارساف۔ ایک چھوٹا سا گلاس۔ بس یہ چھوٹا سا گلاس جو یہاں رکھا ہے میرے حساب میں لکھ لو ادا کردوں گا!

ٹیہوں۔ میں یہ چالیں خوب سمجھتا ہوں۔

بارساف۔ مانو، میں درخواست کرتا ہوں! مجھ پر احسان کرو!

ٹیہوں۔ آگے بڑھو!

بارساف۔ تم میری بات نہیں سمجھتے ... جاہل خچر، اگر تیرے کاٹ کے بھیجے میں ذرا سی مغز ہو تو سمجھ کہ میں نہیں مانگتا، میرا سینہ مانگ رہا ہے۔ اور تو اس طرح دہقان کی طرح جواب دیتا ہے! میری بیماری مانگ رہی ہے! ذرا سمجھ تو سہی!

ٹیہوں۔ سمجھنے کی کوئی بات نہیں۔ چلو ہٹو!

بارساف۔ دیکھو، اگر فوراً مجھے پینے کو نہ ملی۔ اچھی طرح سمجھ لو، اگر میری طلب نہ بجھی۔ تو میں کوئی خوف ناک حرکت کر بیٹھوں گا! خدا جانے کیا کر گذروں گا! تم نے اپنی خراباتی زندگی میں کافی شرابیوں کو دیکھا ہوگا! تمہیں یقیناً اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انکی کیا کیفیت ہوتی ہے! وہ بیمار ہوتے ہیں! انہیں زنجیروں میں جکڑو، مارو، انکے چھریاں چبھوو، بس انہیں واڈکا دیدو! میں نہایت عاجزی سے درخواست کرتا ہوں، مری بات سُنو! مجھ پر رحم کھاؤ! میں اپنے تئیں ذلیل کر رہا ہوں۔ یا اللہ میں اپنے تئیں کیسا ذلیل کر رہا ہوں!

ٹیہوں۔ ادھر قیمت ادا کرو، اُدھر واڈکا لو۔

بارساف۔ قیمت کہاں سے لاؤں؟ سب کچھ تو پینے کی نظر ہوا! کچھ بھی نہیں بچا! اب تمہیں کیا دوں؟ بس یہ اورکوٹ رہ گیا ہے اور یہ میں تمہیں دے نہیں سکتا ... اس کے نیچے میرے بدن پر کچھ نہیں ہے ... مری ٹوپی لوگے؟ (ٹوپی اتارتا ہے اور ٹیہون کو دیتا ہے)

ٹیہوں (ٹوپی کا معائنہ کرتے ہوئے)۔ ہوں ... ٹوپیوں ٹوپیوں میں بھی فرق ہے ... یہ تو چھلنی بنی ہوئی ہے۔

فیڈیا (ہنستا ہے) یہ ایک شریف آدمی کی ٹوپی ہے! جسے اُوڑھ کر وہ سڑکوں پر چلتا ہے اور

جسے جوان خاتونوں سے ملتے وقت اُتارتا ہے "تسلیمات، مزاج شریف!"
ٹیہول (ٹوپی بارساف کو واپس دیتا ہے) اسے تو میں تحفے کے طور پر بھی نہ لوں۔ غلیظ کوڑا۔
بارساف۔ اچھا اسے نہیں قبول کرتے ہو تو قرض دیدو۔ شہر سے واپسی پر یہاں آؤں گا، تو
تمہارے پانچ کوپک ادا کر دوں گا۔ پھر چاہے تم انکو نگل کر اپنا دم گھونٹ لینا! چاہے
تمہارا دم گھٹ جائے! خدا کرے تمہارے گلے میں اٹک کے رہ جائیں! (کھانستا ہے) مجھ
تم سے نفرت ہے!
ٹیہول (میز پر مکا مارتے ہوئے) بکے کیوں جاتے ہو؟ تم ہوتے کون ہو؟ اچکے یا کیا؟ یہاں
کیوں آئے ہو؟
بارساف۔ کچھ پینا چاہتا ہوں! میں نہیں چاہتا! میری بیماری چاہتی ہے۔ تم سمجھتے نہیں؟
ٹیہول۔ میرے صبر کا امتحان نہ لو! ذرا سی دیر میں نکال باہر کروں گا۔
بارساف۔ کیا کروں؟ (میز کے پاس سے ہٹ جاتا ہے) کیا کروں؟ (سوچتا ہے)
یغنی موفنا۔ شیطان تمہیں ورغلا رہا ہے۔ اسکی نہ سنو۔ وہ مردود تمہارے کان میں کہے جاتا ہے
"پیو، پیو، تم کہو میں نہیں پیوں گا۔ نہیں پیوں گا!" وہ باز آجائیگا۔
فیدڑیا۔ میرا خیال ہے تمہارے سر میں ہتھوڑا سا چل رہا ہوگا اور پیٹ میں چبھن ہوگی! (ہنستا ہے)
حضور آپکا سر پھر گیا ہے! لیٹ جائیے اور سو رہیئے! ہوا نبے کھڑے رہنے سے کیا حاصل۔ یہ
باورچی خانہ کا تابع تو ہے نہیں!
بارساف۔ (خفگی سے) چپ رہ! تجھسے کس نے رائے لی تھی، گدھے!
فیدڑیا۔ ذرا زبان سنبھال کر بولو! تم جیسوں کو میں خوب جانتا ہوں! سڑکوں پر تم جیسے بہت
سے مارے مارے پھرتے ہیں! رہے گدھے، تو ذرا اٹھو، ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں، پھر
ہوا سے بھی بُری طرح چیختے نظر آوگے۔ گدھے ہوگے تم! بیوقوف (وقفہ) ذلیل کتا!
نزار روفنا۔ بزرگ سادوا عبادت کر رہا ہے اور اپنی روح خدا کو سونپ رہا ہے اور یہ کافر

توتو میں میں کررہے ہیں اور طرح طرح کی باتیں زبان سے نکال رہے ہیں ۔ ۔ بیچارا لوگ!

فیڈیا ۔ بڑھیا مسعود اپنی منافقانہ زبان سنبھال! شراب خانہ میں ہو، تو شراب خانہ کے طور طریقے برداشت کرو۔

بارساف ۔ کیا کیا جائے! کیا کروں ؟ اس سے کیسے کہوں ؟ کن لفظوں کی ضرورت ہے؟ (ٹھہوں سے) میری رگوں میں خون جم گیا! اچھا ٹھہوں! (روتا ہے) اچھا ٹھہوں!

ساوا (کراہتا ہے) میری ٹانگ میں ٹیسوں کے مارے آگ کی گولی چل رہی ہے.... اچھی زائو!

یغی موفنا ۔ نیک مرد، کیا ہے؟

ساوا ۔ یہ کون رو رہا ہے؟

یغی موفنا ۔ بارساف صاحب

ساوا ۔ ان سے کہو میرے لئے بھی آنسو بہائیں، کہ میں ولاڈ گا میں جان دوں ۔ آنسوؤں والی دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے۔

بارساف ۔ دادا، میں دعا نہیں مانگ رہا! آنسو نہیں ہیں! میرا دل نچوڑا جا رہا ہے اسمیں سے خون نکل رہا ہے (ساوا کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہے) خون! مگر تم نہیں سمجھو گے! دادا، یہ بات تمہاری بڑھم عقل میں نہیں آسکتی ۔ تم وہ لوگ ہو جو اندھیرے میں بیٹھے ہو!

ساوا ۔ ایسے لوگ کہاں ہیں جو روشنی میں ہیں؟

بارساف ۔ دادا، کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پاس روشنی ہے ... وہ سمجھ جائیں گے!

ساوا ۔ ہاں ایسے بھی ہیں، بیٹا ایسے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ولیوں کے پاس روشنی تھی ۔ ۔ ۔ وہ ہر ایک صدمے کو سمجھتے تھے ۔ ۔ بغیر کہے سمجھ جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ آنکھوں کو دیکھتے اور سمجھ لیتے ۔ ۔ ۔ اور انکے سمجھ جانے سے ایسی تسکین ہوتی گویا کوئی صدمہ ہی نہیں ہوا ۔ یہ سب باتیں جاتی رہیں!

فیڈیا ۔ تو تم نے ولی دیکھے ہیں!

ساوا ۔ ہاں میاں دیکھے ہیں ۔ ۔ ۔ دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہیں ۔ گنہ گار بھی اور خدا کے طاعت

گزار بھی ہیں۔

بارساف۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا . . . (جلدی سے اٹھتا ہے) آدمی میں عقل ہونی چاہیے کہ دوسرے کی باتیں سمجھے اور میرے پاس اسوقت ہو نہیں۔ میرے پاس اسوقت بجز ایک حس کے، بجز ایک پیاس کے کچھ نہیں ہے (تیزی سے ٹیہوں کیطرف جاتا ہے) ٹیہوں میرا اورکوٹ لیلو! سمجھتے ہو؟ (اپنا اورکوٹ اتارنے والا ہے) یہ اورکوٹ . . . .

ٹیہوں:۔ اس کے نیچے کیا پہنے ہوئے ہو؟ (بارساف کوٹ کے نیچے دیکھتا ہے ننگا بدن!) مت اتارو، میں نہیں دونگا۔ میں اپنی روح پر گناہ نہیں لوں گا۔

(میرک داخل ہوتا ہے)

بارساف۔ بہت اچھا، گناہ میں اپنے اوپر لیتا ہوں۔ اس پر رضامند ہو۔

میرک (خاموشی کیساتھ اپنا بالائی کوٹ اتارتا ہے اور جاکٹ پہنے رہتا ہے۔ اسکی پیٹی میں ایک کلہاڑی لگی ہوئی ہے) بعض لوگوں کو سردی لگتی ہے، مگر دیکھو اور وہ آدمی جس کی تلاش کی جارہی ہو ہمیشہ گرم رہتے ہیں میں پسینے میں ڈوبا ہوا ہوں! (کلہاڑی زمین پر رکھتا ہے اور جاکٹ بھی اتار دیتا ہے) کیچڑ میں سے ٹانگ نکالتے نکالتے آدمی پسینے میں تر ہو جاتا ہے۔ ایک پاؤں نکلنے نہیں پاتا دوسرا پھنس جاتا ہے۔

یفی موفنا۔ سچ کہتے ہو . . . یہ تو بتاؤ مینہ تھمنے والا ہے؟

میرک۔ (یفی موفنا کو دیکھنے کے بعد) میں عورتوں پر لفظ ضائع نہیں کرتا (وقفہ)

بارساف:۔ (ٹیہوں سے) گناہ میں اپنے ذمہ لیتا ہوں! سنتے ہو؟

ٹیہوں۔ میں نہیں سننا چاہتا۔ بس ختم کرو!

میرک۔ اتنا اندھیرا ہے گویا کسی نے آسمان پر سیاہی مل دی۔ خود اپنی ناک دکھائی نہیں دیتی مینہ چہرے کو برف کی طرح کاٹتا ہے (اپنے کپڑے اور کلہاڑی اٹھاتا ہے)

فیڈیا۔ تم جیسے بدمعاشوں کے تو مزے ہیں شکاری جانور پناہ لیتے پھرتے ہیں مگر تم شیطانوں

کے عیش ہیں۔

میرک۔ یہ کون بولا ؟

فیڈیا۔ آنکھ کھول کے دیکھو۔ ۔ ۔ ۔ اندھے تو نہیں ہو۔

میرک۔ یہ بات یاد رہیگی۔ (ٹیہوں کے پاس جاتا ہے) کہو موٹے بڑے میاں ! مجھے نہیں جانتے ؟

ٹیہوں۔ اگر مجھے تم سب شرابیوں کو جاننا پڑے جو سڑکوں پر آوارہ پھرتے ہو، تو کم از کم ایک درجن آنکھیں درکار ہیں۔

میرک۔ خوب غور سے دیکھو۔ ۔ ۔ (وقفہ)

ٹیہوں۔ ارے تم ہو ! تمہاری آنکھوں سے پہچان گیا ! (اپنا ہاتھ پیش کرتا ہے) انڈری پالی کاریو !

میرک۔ میں پہلے انڈری پالی کاریوف تھا۔ مگر اب یگور میرک ہوں۔

ٹیہوں۔ یہ کون ؟

میرک۔ خدا مجھے جو پروانۂ راہداری بھیجتا ہے، بس وہی میرا نام ہے۔ دو مہینے ہوئے آئے کہ میں میرک ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ (گرج) گرجے جائیں نہیں ڈرتا (ادھر ادھر نظر ڈالتا ہے) تازی کتے تو یہاں نہیں ہیں ؟

ٹیہوں۔ تازی کتوں کی خوب کہی ! یہاں تو زیادہ تر پتنگے اور مچھر ہیں ۔ ۔ ۔ بیچارے معصوم مخلوق ۔ ۔ ۔ تازی کتے اسوقت اپنے پروں کے بچھونوں پر خرخر کرتے ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ (بلند آواز سے) اچھے عیسائیو، اپنی جیبوں اور اپنے کپڑوں سے ہوشیار رہو۔ یہ آدمی چالاک ہے تمہیں لوٹ لے گا۔

میرک۔ یوں کہو کہ تمہارے پاس روپیہ پیسہ ہے، تو اس پر نظر رکھو۔ کپڑوں پر میں ہاتھ نہیں ڈالتا کپڑے میرے کس کام کے۔

ٹیہوں۔ شیطان تمہیں کدھر لئے جا رہا ہے ؟

میرک۔ کوبان کو۔

ٹیهول- سچ!
فیڈ یا- کوبان کو؟ واقعی؟ (اُٹھ بیٹھتا ہے) خوب جگہ ہے۔ تین سال تک سوئے جاؤ پھر بھی ایسی نفیس جگہ خواب میں نظر نہ آئے۔ ایسی وسیع اور ایسی آزاد! کہتے ہیں وہاں پرندوں اور شکار اور کسی قسم کے جنگلی جانوروں کی کمی نہیں! گھاس تمام سال اُگتی ہے۔ لوگ دوستوں کی طرح رہتے ہیں، زمین اتنی ہے کہ انکی سمجھ میں نہیں آتا اسکا کیا کریں.... ایک سپاہی نے پچھلے دنوں سنایا.... گورنمنٹ تین سو ایکڑ فی نفر دیتی ہے۔ اپنی جان کی قسم یہ جگہ ہے جہاں آدمی خوش رہ سکتا ہے

میرک- خوش.... خوشی تو آدمی کے پیچھے رہتی ہے... دیکھنے میں نہیں آتی خوشی کو دیکھنا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا اپنی کہنی ... یہ سب حماقت ہے (ٹیہول پر نظر ڈالتا ہے) مجرموں کی بستی معلوم ہوتی ہے!

یفی موفنا- (میرک سے) تمہاری آنکھیں کیسی شرارت بھری ہیں! لڑکے، تم میں شیطان سمایا ہوا ہے.... ہماری طرف نہ دیکھو۔

میرک- خدا تمہارا بھلا کرے۔

یفی موفنا- منہ پھیر لو! (ساوا کو ٹھوکا دیتی ہے) ساوا پیارے، یہ شریر ہماری طرف دیکھ رہا ہے میرے پیارے نقصان پہنچیگا! (میرک سے) میں کہتی ہوں منہ پھیرلے!

ساوا- ائی یہ ہمیں نہیں چھوڑیگا! ہمیں نہیں چھوڑیگا.... خدا ہمارا محافظ ہے

میرک- خدا تمہارا بھلا کرے! (اپنے شانے ہلاتا ہے) کوئی نہیں بولتا۔ بد ہیئت بھک منگو سو رہے ہو کیوں؟ بولتے کیوں نہیں؟

یفی موفنا- اپنی شرارت بھری آنکھیں ہٹالے! اپنا شیطانی غرور دور کر!

میرک- زبان سنبھال، بڑھیا کھوسٹ! یہ شیطانی غرور نہیں تھا۔ میں تمہاری آشفتہ حال قسمت کی نرم لفظوں اور دوستی سے آؤ بھگت کرتا تھا! تم لوگ سردی کے مارے مکھیوں کی

طرح سکڑے جاتے ہو مجھے تمہارے حال زار پر رحم آیا اور میں نے چاہا کہ تمہیں تکیں دوں، اد۔
نم ہو کر اپنے مکروہ چہرے پھیرے لیتے ہو! بہت اچھا، مجھے کیا پروا ہے! (فیڈیا کے پاس جاتا ہے)
تم کہاں کے رہنے والے ہو؟
فیڈیا۔ اسی علاقے کا۔ ہونیوسکی کے بھٹوں میں کام کرتا ہوں۔
میرک۔ اُٹھ بیٹھو
فیڈیا۔ (بیٹھے ہوئے) کہو؟
میرک۔ کھڑے ہو جاؤ! بالکل اُٹھ جاؤ! میں یہاں لیٹوں گا۔ . . .
فیڈیا۔ لو اور سنو. . . یہ جگہ تمہاری ہے؟
میرک۔ ہاں جاؤ فرش پر لیٹ رہو . .
فیڈیا۔ آگے بڑھو. . . میں تم سے نہیں ڈرتا . . .
میرک۔ ہو تو بڑے تیز . . چل اُٹھ کھڑا ہو، باتیں نہ بنا بے وقوف نہیں تو پچھتائیگا۔
ٹیہوں۔ (فیڈیا سے) میاں لڑکے اسکی مزاحمت نہ کرو۔ بس جانے دو۔
فیڈیا۔ نہیں کیا حق ہے؟ مگر کی طرح آنکھیں مٹکاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میں ڈر گیا! (اپنا سامان اکٹھا کرتا ہے، اور فرش پر لیٹ جاتا ہے) شیطان! (لیٹ جاتا ہے اور اپنا سر ڈھانک لیتا ہے)
میرک۔ (بنچ پر اپنا بچھونا بچھاتے ہوئے) شیطان کبھی دیکھا نہیں ابھی مجھے شیطان کہتے ہو شیطان میری طرح نہیں ہوتے (لیٹ جاتا ہے اور کلہاڑی اپنے پاس رکھ لیتا ہے) کلہاڑی میری بچی، یہاں لیٹ جا! لا تیرے دستے کو ڈھانک دوں۔ میں نے اسے چرایا . . . . اور اب میں اسطرح اسکے لئے پریشان ہوتا ہوں جیسے کوئی بے وقوف کھلونے کے لئے۔ اسے پھینکتے افسوس آتا ہے اور رکھنے کو جگہ نہیں۔ بیوی کیطرح جس سے آدمی بے زار ہو گیا ہو . . .
ہاں . . . (اپنے تئیں ڈھانک لیتا ہے) صاحب زادے، شیطان میری طرح نہیں تھے . . .
فیڈیا۔ (کوٹ کے نیچے سے سر نکالتے ہوئے) اور کیسے ہوتے ہیں؟

میرک۔ ہوے کی طرح، بھوت کیطرح ... پھونک مارو (پھونک مارتا ہی) ایسے ہوتے ہیں وہ نظر نہیں آتے۔

ایک آواز۔ (کونے میں سے) پھانسی کے تختہ پر بیٹھو تو نظر آتا ہے۔

میرک۔ میں اس کے نیچے بھی بیٹھا ہوں، مجھے تو دکھائی نہیں دیے ... عورتیں یونہی باتیں بناتی ہیں ... اور بے وقوف کسان بھی ... نہ شیطان دکھائی دیتا ہی، نہ بھوت نہ پریت ... ہماری آنکھیں ہر چیز کے لئے نہیں بنیں ... جب میں چھوٹا تھا، تو قصداً رات کے وقت جنگلوں میں غول بیابانی دیکھنے جاتا تھا ... جتنا چیخ سکتا تھا، چیختا تھا۔ اسکو آوازیں دیتا تھا اور پلک تک نہیں جھپکاتا تھا۔ مجھے ہر طرح کی لغویتیں نظر آئیں مگر وہ کبھی نہیں دکھائی دیا، بھوت دیکھنے گرجا کے صحن میں جاتا تھا۔ یہ سب بڑی بوڑھیوں کی حکایتیں ہیں۔ میں نے ہر قسم کے جنگلی درندے دیکھے ہیں۔ رہی کوئی دہشت ناک چیز۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ ہماری آنکھ اس لئے نہیں بنی۔

ایک آواز (کونے میں سے) یہ مت کہو بعض اوقات ایسا اتفاق ہوتا ہی کہ واقعی کچھ نظر آنے لگتا ہی ... ہمارے گاؤں میں ایک کسان سور ذبح کر رہا تھا ... اُس نے سور کا پیٹ چاک کیا اور اسمیں سے کوئی چیز نکل پڑی!

ساوا (بیٹھتے ہوئے) لڑکو اس ملعون کا ذکر نہ کرو۔ گناہ ہے!

میرک۔ آہا بڑے میاں! ہڈیوں کی مالا! (ہنستا ہی) گرجا کے صحن تک جانیکی کیا ضرورت ہے! بھوت فرش میں سے ہمیں وعظ دینے کو اُبھرنے لگے ... گناہ! آپ تو اپنے وہموں سمیت وعظ نہ فرمائیں! تم لوگ جاہل ہو، اندھیرے میں رہتے ہو ... (پائپ جلاتا ہے) میرا باپ کسان تھا، اُسے بھی کبھی کبھی وعظ کہنے کا شوق چراتا تھا۔ ایک رات اُس نے پادری کے ہاں سے سیبوں کی ایک بوری چرائی۔ ہمارے پاس لایا، اور کہنے لگا، "خبردار بچو، جبتک گرجا میں سیبوں پر نیاز دے لی جائے۔ اُسوقت تک ان کو ہاتھ نہ لگانا۔ گناہ ہی،"

یہ بالکل تمہاری سی بات ہوئی شیطان کا ذکر نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن شیطنت کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ . . مثلاً اسی بڑھیا کھوسٹ کو لو (یفی موفنا کی طرف اشارہ کرتا ہے) اسے مجھ میں شیطان نظر آیا۔ مگر میں شرط لگاتا ہوں کہ اس نے اپنے زمانے میں اپنی زنانہ حماقتوں سے آدھی درجن دفعہ اپنی روح شیطان کے حوالے کی ہوگی . . . . .

یفی موفنا۔ اُف، اُف، اُف . . . صلیب کا سایہ ہمارے سروں پر! (اپنا سر ہاتھوں میں چھپالیتی ہے) ساوا، پیارے!

ٹیہوں۔ کیوں بیماروں کو ڈراتے ہو؟ جی جلانے کا کیا خوب طریقہ نکالا ہے! (دروازہ ہوا سے بند ہوجاتا ہے) خدا ہمارے حال پر رحم کرے! کیسی ہوا ہے!

میرک۔ (پاؤں پھیلاتا ہے) میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی طاقت دکھاؤں! (دروازہ ہوا سے کھڑکھڑا کے بند ہوجاتا ہے) زور آزمائی کروں . . . . یہ ہوا! یہ دروازہ کو کھڑکھڑا سکتی ہے۔ مگر میں سرائے کو ڈھا سکتا ہوں، اگر چاہوں! (اٹھتا ہے اور پھر لیٹ جاتا ہے) میرا دل کیسا اچاٹ ہے!

نزاروفنا۔ اے کافر دعا مانگ! ادھر اُدھر لوٹنے سے کیا حاصل؟

یفی موفنا۔ اسے مت چھیڑو، دفع کرو! پھر ہماری طرف دیکھ رہا ہے! (میرک سے) شریر ہماری طرف نہ دیکھ! آنکھیں تو دیکھو! ایسی ہیں جیسی شیطان کی صبح کی نماز سے پہلے۔

ساوا۔ زائر عورتو، اسے دیکھنے دو! وظیفہ پڑھو، پھر بری نظر کا اثر تم پر نہیں ہوگا . . . .

بارساف۔ بس اب مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتا۔ یہ سراسر زیادتی ہے! (میز کی طرف جاتا ہے) ٹیہوں دیکھو، آخری مرتبہ التجا کرتا ہوں . . . . آدھا گلاس!

ٹیہوں۔ (اپنا سر ہلاتا ہے) نقد!

بارساف۔ میرے اللہ، تمہیں بتا تو چکا سب کچھ پینے کی نذر ہوا! تمہارے لئے کہاں سے لاؤں؟ اگر کچھ واڈکا قرض دیدو گے تو دیوالہ تو نکلنے سے رہا؟ واڈکا ایک گلاس تمہیں ایک پیسے میں پڑتا ہے، لیکن مجھے عذاب سے بچالے گا۔ میں عذاب میں ہوں! یہ کوئی وہم نہیں ہے،

عذاب ہے ذرا سمجھو تو سہی !

ٹیہوں - جاؤ - یہ باتیں کسی اور کے سامنے بناؤ، میرے سامنے نہیں ... جاؤ ان نیک لوگوں سے بھیک مانگو، اگر انکا جی چاہے تو خدا کے واسطے تمہاری مدد کریں - میں تو خیرات میں روٹی دیتا ہوں۔

بارساف - ان غریبوں کا خون تم ہی کو مبارک ہو میرا کام نہیں ہے کہ انہیں لوٹوں! میرا کام نہیں ہے! سمجھتے ہو؟ (میز پر مکا مارتا ہے) اچھا! ... منٹ بھر ٹھیرو ... (زائرین کا رُخ کر کے) یہ خوب سوجھی! بھلے مانسو مجھے کچھ دو گے؟ میرا سینہ طلب کرتا ہے - میں بیمار ہوں!

فیڈیا - یہ نئی سوجھی - بدمعاش؟ ... پانی کی تو تجھے کیا طلب ہو گی؟

بارساف - کیا اپنے تئیں ذلیل کر رہا ہوں! کیسا ذلیل ہو رہا ہوں! مجھے ضرورت نہیں! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ... میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا!

میرک - آقا اس سے تمہیں کچھ نہیں ملیگا ... ہم سب اسکی خست سے واقف ہیں ... ذرا ٹھیرو! میرے پاس ایک پیسہ ہے ... ہم دونوں ایک گلاس میں شریک ہو جائینگے ... (اپنی جیبیں ٹٹولتا ہے) لعنت ہو ... کہیں کھو تو نہیں دیا؟ ... دوست میرے پاس کچھ نہیں ملا! تمہاری قسمت! (وقفہ)

بارساف - مجھے کچھ پینے کو ملنا چاہئے، ورنہ میں کوئی سنگین حرکت کر بیٹھوں گا، یا خودکشی کر لونگا! ... میرے اللہ! کیا کروں؟ (دروازے کی طرف دیکھتا ہے) چلا جاؤں؟ اندھیرے میں جدھر قدم اُٹھے اسی طرف چل کھڑا ہوں؟ ...

میرک - زائر بی بی، اسے وعظ کیوں نہیں سناتیں؟ اور ٹیہوں، تم اسے نکال نہیں دیتے؟ اس نے تمہیں رات کے ٹہرنے کی اُجرت کہاں دی ہے؟ نکال باہر کرو، دھکا دیدو! آہ آج کل لوگ کیسے بے رحم ہیں! نرمی اور رحم دلی نام کو نہیں ... لوگ سنگدل ہیں ... کوئی ڈوب رہا ہے، اور وہ چیخ کر کہتے ہیں "جلدی سے ڈوب چکو ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہاری طرف دیکھیں، ہمارا کام کا دن ہے" رہا اسکی طرف رسی پھینکنا! - اسکی کوئی توقع نہیں

...اس پر دام خرچ ہوتے ہیں۔...

ساوا۔ بھلے آدمی فیصلہ خدا کا کام ہے

میرک۔ بڈھے بھیڑیے چپ رہ! تم لوگ بے رحم ہو۔ (ٹیہوں سے) ادھر آؤ! میرے جوتے اتارو! جلدی کرو!

ٹیہوں۔ دیکھتے ہو اکی شان؟ (ہنستا ہے) تم سے ڈر لگتا ہے!

میرک۔ ادھر آؤ میں کہتا ہوں! جلدی کرو! (وقفہ) سنتے ہو؟ دیواروں سے کہہ رہا ہوں؟ (اُٹھتا ہے)

ٹیہوں۔ اچھا، اچھا... بگڑو مت! آؤ ایک گلاس پی لو... چلو کچھ پی لو!

میرک۔ بھلے لوگو، میں کیا چاہتا ہوں؟ یہ کہ یہ مجھے واڈکا پلائے۔ یا یہ کہ میرے جوتے اتارے؟ کیا میں نے صاف صاف نہیں کہا؟ ٹھیک طرح نہیں کہا؟ (ٹیہوں سے) شاید تم نے سنا نہیں؟ ایک منٹ ٹھہرتا ہوں، اسی عرصہ میں شاید سن لو!

(زائرین اور راہ گیروں میں کچھ گھبراہٹ ہوتی ہے وہ اُٹھتے ہیں اور ٹیہون اور میرک کیطرف چپ چاپ انتظار میں دیکھتے ہیں۔)

ٹیہوں۔ بُری ہوا تمہیں یہاں لائی ہے! (میرک کے پیچھے سے آگے آتا ہے) کیا نوابی انداز ہیں! لاؤ کدھر ہیں؟ (میرک کے جوتے اُتارتا ہے)

میرک۔ اچھا اب انہیں پاس رکھدو... بس جاؤ!

ٹیہوں۔ (میرک کے جوتے اتارنے کے بعد میز کے پاس جاتا ہے) بڑی لاف زنی کرنے لگا ہے۔ ابکے تو بول دیکھ جو دروازے کے باہر نظر آئے! ہاں! (بارساف سے جو اسکی طرف بڑھ رہا ہے) پھر تم نے وہی راگنی چھیڑی؟

بارساف۔ اچھا دیکھو شاید میں تمہارے پاس کوئی قیمتی چیز رکھوا دوں.... اگر تم چاہو تو میں...

ٹیہوں۔ کانپتے کیوں ہو؟ صاف صاف کہو!

بارساف۔ یہ میری بڑی کمینی اور ذلیل حرکت ہے۔ مگر میں مجبور ہوں، میں اسکا ذمہ دار نہیں ہوں ... اگر اسکی بنا پر مجھ پر مقدمہ چلایا جائے، تو میں بری کر دیا جاؤں ... یہ لو یہ شرط یہ ہے کہ شہر سے واپسی پر چھڑا لوں گا۔ گواہوں کے سامنے نہیں دیتا ہوں (اپنی اندر کی جیب سے لاکٹ نکالتا ہے) یہ رہا ... مجھے چاہئے کہ اسمیں سے تصویر نکال لوں مگر پھر رکھوں گا کہاں میں تو سر سے پاؤں تک تر بتر ہوں ... خیر تصویر سمیت لے لو ... خیال رکھنا ... تصویر پر انگلیاں نہ رکھنا۔ براہ مہربانی ... میں نے تمہارے ساتھ بد تمیزی کی ... مجھسے حماقت ہوئی، معاف کرو اور ... اسے ہاتھ نہ لگانا ... مجھے گوارا نہیں کہ تمہاری آنکھیں اسے دیکھیں ... (ٹیہوں کو لاکٹ دیتا ہے)

ٹیہوں (لاکٹ کو غور سے دیکھتا ہے) چرائی ہوئی گھڑی! خیر اچھا! یہ لو شراب (واڈکا انڈیلتا ہے) ... چڑھا جاؤ ...

بارساف۔ دیکھو اسے ہاتھ نہ لگانا .... (آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کے پیتا ہے)

ٹیہوں ۔(لاکٹ کھولتا ہے) اچھا! ... بیگم صاحبہ ہیں! تمہارے کہاں سے ہاتھ لگیں؟

میرک۔ مجھے دکھاؤ! (اٹھتا ہے اور ٹینر کے پاس جاتا ہے) مجھے دیکھنے دو!

ٹیہوں۔ (اسکا ہاتھ ہٹا دیتا ہے) کہاں گھسے آتے ہو؟ میرے ہاتھ میں دیکھو!

فیڈیا۔ (اٹھتا ہے اور ٹیہون کے پاس جاتا ہے) مجھے بھی دیکھنے دو!

(زائرین اور راہ گیر ٹینر کے گرد آ کر حلقہ بناتے ہیں)

میرک۔ (ٹیہوں کے جس ہاتھ میں لاکٹ ہے اُسے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑتا ہے اور چپ چاپ تصویر کو دیکھتا ہے۔ وقفہ) حسین ڈائن! ... خاتون! ...

فیڈیا۔ خاتون! ... رخساروں اور آنکھوں سے پتہ چلتا ہے ... ہاتھ ہٹاؤ مجھے دکھائی نہیں دیتا ... بال کمر تک آئے ہوئے ... بالکل ایسی جیسے زندہ ہے! ابھی بولا چاہتی ہے (وقفہ) ...

میرک۔ کمزور آدمی کی بربادی کا اس سے بہتر ذریعہ نہیں۔ ایک دفعہ ایسی عورت سے سابقہ ہوا ...

(ہاتھ ہلاتا ہے) اور بس خاتمہ ہے!

(کوزما کی آواز: او-و-و! ٹھہرو! چپ رہو!" کوزما داخل ہوتا ہے)

کوزما۔ (اندر آتے ہوئے) راستے میں سرائے پڑے، تو ناممکن ہے وہاں ٹھہرے بغیر گزر ہو جائے دن کی روشنی میں اپنے باپ کے سامنے سے اسے دیکھے بغیر گذر جاؤ، مگر سرائے اندھیرے میں دور سے نظر آتی ہے۔ اگر بھلے مانس ہو، تو رستہ چھوڑو! اے، ادھر دیکھو! پیسے سے میز کو کھٹکھٹاتا ہے) تمہاری مدیرا کا ایک گلاس! جلدی کرو!

فیڈیا۔ چلتا ہوا شیطان ہے!

ٹیھون۔ بازو نہ پھڑکاؤ! کوئی چیز گر پڑے گی۔

کوزما۔ اسی لئے تو دئے گئے ہیں کہ پھڑکائے جائیں۔ بزدلو بارش سے سہمے ہوئے ہو! شاید تو ان کے بنے ہو (پیتا ہے)

یفی موفنا۔ راہ چلتے جب ایسی رات کا سامنا ہو، تو انسان کیسے نہ ڈرے۔ خدا کا شکر ہے ہم سب اچھی حالت میں ہیں۔ سڑک کے کنارے بہت سے گاؤں اور گھر ہیں؛ اس موسم سے پناہ مل سکتی ہے۔ پہلے زمانے کا خیال کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سو میل چلنے پر بھی، مکان اور گاؤں تو درکنار لکڑی کی پچر تک نظر نہیں آتی تھی۔ زمین پر سونا پڑتا تھا۔ . . .

کوزما۔ بڑی بی کب سے دنیا میں ماری ماری پھر رہی ہو

یفی موفنا۔ اسی سال ہونے آئے

کوزما۔ اسی سال! عنقریب کالے کوّے کی ہم عمر ہو جاؤ گی! (بارساف کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ کون صاحب ہیں۔؟ (غور سے بارساف کو دیکھتا ہے) حضور!

(بارساف کوزما کو پہچان لیتا ہے اور گھبرا کے ایک کونے میں چلا جاتا ہے اور ایک بنچ پر بیٹھ جاتا ہے)

کوزما۔ سیمیون سرجائیوچ! آپ ہیں؟ اس شراب خانے میں آپ کا کیسے آنا ہوا؟ یہ جگہ آپ کیلئے موزوں نہیں!

بارساف ۔ کومت !

میرک ۔ (کوزما سے) یہ کون صاحب ہیں ؟

کوزما ۔ ایک بدنصیب مصیبت کا مارا ! (گھبراہٹ میں میز کے ادھر ادھر ٹہلتا ہے) شراب خانے میں ؟ آنکھوں کو یقین نہیں آتا ! چیتھڑوں میں ! نشے میں چور ! دوستو اس واقعہ نے مجھے سراسیمہ کر دیا ۔ ۔ ۔ بدحواس کر دیا (میرک سے دبی ہوئی آواز سے) یہ ہمارے آقا ہیں، ہمارے زمیندار سیمیون سرجا بی وچ، مسٹر بارساف ۔ ۔ ۔ دیکھتے ہو کس حال میں ہیں ؟ اس وقت کیا معلوم ہوتے ہیں ؟ شراب خواری انسان کا کیا درجہ کر تی ہے ! ۔ ۔ ۔ گلاس بھر دو (پیتا ہے) میں انکے گاؤں کا ہوں ۔ بورساف کا ۔ شاید تم نے نام سنا ہو یہاں سے سو میل کے فاصلہ پر پر گو فکی کے ضلع میں ہم انکے والد کے خانہ زاد تھے ۔ ۔ ۔ تاسف کا مقام ہے !

میرک ۔ یہ بہت مالدار تھے ؟

کوزما ۔ بڑے آدمی ۔ ۔ ۔ ۔

میرک ۔ باپ کا روپیہ لٹا دیا ؟

کوزما ۔ انکی قسمت ہی ایسی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ پہلے بڑے شاندار رئیس تھے ۔ متمول اور ذی ہوش ۔ ۔ ۔ ۔ (ٹیہوں سے) خود تم نے اسطرف سے شہر جاتے دیکھا ہوگا ۔ خوبصورت، قوی گھوڑے، چکدار گاڑی ۔ سب چیز اول درجے کی! صاحب زادے ۔ انکے پاس پانچ گاڑیاں تھیں ۔ ۔ ۔ مجھے یاد ہے، پانچ سال ہوئے یہ میکی شکنکی کے گھاٹ سے گذر رہے تھے، تو پیسہ کی بجائے انہوں نے روبل پھینکا ۔ ۔ ۔ بولے "میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ریزگاری کے لئے ٹہروں" ۔ ۔ ۔ سمجھے !

میرک ۔ میرا خیال ہے انکا سر پھر گیا ؟

کوزما ۔ مجھے تو سب ہوش و حواس بجا معلوم ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب بے ہمتی کا نتیجہ ہے ۔ زیادہ تر شروع تو ایک عورت سے ہوا ۔ ۔ ۔ بچارے شہر کی ایک خاتون پر عاشق ہو گئے اور سمجھنے لگے

کہ دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی پر عاشق ہو جاؤ، وہ کبوتری سے
بھی زیادہ خوبصورت نظر آنے لگے گی ۔ ۔ ۔ وہ ایک اچھی خاندان کی لڑکی تھی ۔ ۔ نیچے کے طبقے
یا اس قسم کی نہیں، انگریس ۔ ۔ ۔ ۔ مدہوش ۔ ۔ ۔ خود نمائی اور دیدہ بازی کرتی پھرتی! اور
ہر وقت ہنسے جاتی ۔ ۔ ۔ نا سمجھ ۔ اس قسم کے لوگ، یہ سمجھتے ہیں گویا اسمیں بھی کوئی بات ہے۔ ہم کسان
ہوتے تو ایسی سر پھری کو گھر سے نکال باہر کرتے ۔ ۔ ۔ خیر یہ اس پر عاشق ہو گئے ۔ ۔ اور بھٹکنے
لگے۔ اس کی دربارداری شروع ہوئی، یہ اور وہ چائے اور شکر ۔ ۔ رات رات بھر کشتی میں
گزار دیتے، یا پیانو بجانے میں ۔ ۔ ۔ ۔

بارساف ۔ کوزما اسکا ذکر مت کرو۔ کیا فائدہ؟ ان لوگوں کو میری زندگی سے کیا سروکار۔

کوزما ۔ حضور معاف فرمائیے، میں نے کہا ہی کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے صرف انہیں سنایا ہے، اور بس ۔ ۔
مجھسے بولے بغیر نہ رہا گیا۔ میں ایسا سراسیمہ ہوا ۔ ۔ سخت بدحواس ہوا! گلاس بھرو (پیتا ہے)

میرک ۔ (چپکے سے) کیا وہ ان سے محبت کرتی تھی؟

کوزما ۔ (پہلے چپکے سے پھر رفتہ رفتہ معمولی آواز سے) خیال تو میرا یہی ہے! یہ کوئی بے حیثیت آدمی
تو تھے نہیں ۔ ۔ ۔ ایسے آدمی سے آپ ہی محبت ہو گی جس کے پاس تین ہزار ایکڑ اور بے شمار روپیہ
ہو ۔ ۔ ۔ اور پھر یہ باوقار، رعب دار، ذی ہوش تھے ۔ ۔ ۔ تمام حکام سے ہاتھ ملاتے
تھے، جیسے اب میں تم سے ۔ ۔ ۔ (میرک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے) ۔ ۔ ایک دن شام
کو میں انکے باغ سے گزر رہا تھا ۔ ۔ ۔ باغ میلوں پھیلا ہوا تھا! میں چپ چاپ چلا جا رہا تھا
دیکھتا کیا ہوں کہ یہ دونوں باغ کی ایک نشست پر بیٹھے ہیں اور بوسہ بازی ہو رہی ہے (بوسے
کی آواز نکالتا ہے) انہوں نے اسے ایک بوسہ دیا، اور اس نے ۔ ناگن! ۔ انہیں دو
دئے ۔ ۔ ۔ انہوں نے اسکا سپید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور تمتما اٹھی اور ان سے چمٹ گئی
لعنت ہو اس پر! بولی "سینیا میں تمہیں چاہتی ہوں!" ۔ ۔ ۔ اور سینیا، پاگلوں کی طرح
اپنی خوشی کی کیفیت ہر ایک سے فخریہ بیان کرتے پھرے، ایک روبل اسے دیا، دو اُسے ۔ ۔ ۔

مجھے اتنا دیا کہ چاہتا تو گھوڑا خرید لیتا... خوشی میں قرض داروں کو معاف کر دیا....

بارساف۔ آہ! کیوں کہے جاتے ہو؟ یہ لوگ بے حس ہیں.. جانتے ہو یہ باتیں دھری ہیں!

کوزما۔ حضور میں نے کہا ہی کیا ہے! یہ لوگ پوچھے جاتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ انہیں کیوں نہ سنایا جائے؟ بہت بہتر، آپ بگڑتے ہیں تو نہیں سناؤں گا... نہیں سناؤں گا۔ انکی طرف سے منہ پھیر لوںگا

(ڈاکئے کی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے)

فیڈیا۔ غل مت مچاؤ! آہستہ بولو!

کوزما۔ میں آپ ہی آہستہ بول رہا ہوں... وہ کہتے ہیں مت سناؤ، لہذا اب کچھ نہیں کہا جا سکتا انکی شادی ہوگئی، بس... قصہ ختم ہوا.. گلاس بھرو (پیتا ہے) مجھے وہ بات ہونا پسند نہیں! شادی کے بعد دعوت تیار تھی کہ اس نے گاڑی لی اور نکل کھڑی ہوئی... (چپکے سے) شہر کو وکیل کے پاس جو اسکا عاشق تھا.. کہو کیسی رہی؟ فوراً، اسی لمحے! .. اصل یہ ہے کہ اُسے ہلاک بھی کر دیا جائے تو کم ہے!

میرک۔ (خواب آلودہ انداز سے) اچھا... پھر کیا ہوا؟

کوزما۔ مخبوط الحواس ہوگئے... تم خود دیکھتے ہو، قطرے سے شروع کیا، اور اب قدحوں کی نوبت پہنچ گئی ہے... پہلے قطرہ، پھر قدحے... اور اب بھی اُسے چاہتے ہیں، یہ عجب مزے کی بات ہے۔ اب بھی اسے چاہتے ہیں! اسوقت شہر جا رہے ہوں گے کہ اُسے ایک نظر دیکھ آئیں... ایک نظر دیکھ لیں اور واپس آجائیں...

(ڈاک کی گاڑی سرائے کے آگے ٹھہرتی ہے ڈاکیہ اندر آتا ہے اور پیتا ہے)

ٹیہوں۔ آج ڈاک کو دیر ہوگئی۔

(ڈاکیہ بغیر بولے دام دیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ڈاک کی گاڑی گھنٹیاں بجاتی ہوئی روانہ ہوتی ہے ایک آواز (کونے میں سے) ڈاک کو لوٹنے کا یہ موسم ہے۔ بالکل معمولی بات ہے۔

میرک۔ مجھے بتیس سال ہونے آئے مگر میں نے ڈاک ایک دفعہ بھی نہیں لوٹی (وقفہ) .. اب تو

گئی . . . وقت نکل گیا . . . وقت نکل گیا . . .

کوزما ۔ جیل کی ہوا کھانی ہے ؟

میرک ۔ بہت لوگ لوٹتے ہیں اور صاف بچ جاتے ہیں ۔ اور اگر جیل ہو بھی جائے ، تو کیا ہے ؟

(یک لخت) پھر کیا ہوا ؟

کوزما ۔ بچارے بارسات کا ؟

میرک ۔ نہیں تو کس کا ؟

کوزما ۔ اب رہا یہ برباد کیسے ہوئے . . . انکا ایک بہنوئی تھا . . . انکی بہن کا خاوند . . . انکو سوجھی کہ ایک بینک میں بہنوئی کے ضامن بن جائیں . . . تیس ہزار یا اتنے کے . . . بہنوئی کو قرض لینے کا چسکا تھا . . . وہ سمجھتا تھا کہ روٹی کس رُخ چُپڑی ہوئی ہے . . . قرض لیا ، اور ادا کرنے کی بھی زحمت نہیں اٹھائی . . . الغرض ہمارے آقا کو پورے تیس ہزار ادا کرنے پڑے (آہ بھرتا ہے) بے وقوف اپنی بے وقوفی سے تکلیف اٹھاتا ہے ۔ انکی بیوی کے اس وکیل سے اولاد ہے اور انکے بہنوئی نے پالٹا والے کے قریب زمین خرید لی ہے ، اور یہ ہیں کہ پگلوں کیطرح شراب خانے میں پڑے رہتے ہیں اور ہم جیسے کسانوں سے شکایت کرتے ہیں "لڑکو ! میرا ایمان جاتا رہا ! اب مجھے کسی چیز میں اعتقاد نہیں رہا !" بزدلی ہے ۔ غم ہر شخص کو ہوتا ہے ، کوئی نہ کوئی سانپ سینے کو ڈستا رہتا ہے ، مگر اس سے شراب خواری لازم نہیں آتی ۔ ہمارے گاؤں کے نمبردار کو لو ۔ اسکی بیوی کے کھلم کھلا اسکول کے ماسٹر سے تعلقات ہیں ۔ اپنے خاوند کا روپیہ شراب میں اڑاتی ہے ۔ اور نمبردار حقارت کا منہ بنائے پھرتا ہے . . . گو اسکا چہرہ ذرا اُتر گیا ہے . . . .

ٹھول ۔ (آہ بھرتا ہے) انسان اپنے مصائب خدا کی دی ہوئی ہمت کے مطابق برداشت کرتا ہے ۔

کوزما ۔ ہر شخص کی ہمت ایک سی نہیں ہوتی ۔ یہ صحیح ہے . . . اچھا کیا حساب ہوا ؟ (ادا کرتا ہے) یہ لو مرے گاڑھے پسینے کی کمائی ! خدا حافظ ! بہت دیر ہو گئی اب بھاگنا چاہئے . . . بیگم کے لئے

ہسپتال سے واپس کولانا ہے . . . وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوگی اور بخراب ہورہی ہوگی
(باہر بھاگتا ہے)

ٹیہوں ۔ (کچھ وقفہ کے بعد) اے! تمہارا کیا نام! آؤ، کچھ پی لو (گلاس بھر دیتا ہے)

بارساف ۔ (میز کے قریب لڑکھڑاتا ہوا آتا ہے اور پیتا ہے) تو اب مجھے دو گلاس کی قیمت دینی ہو

ٹیہوں ۔ کوئی بات نہیں ہیو۔ اپنے غم کو ہلاکت میں ڈبو دو!

فیڈیا ۔ ایک گلاس میری طرف سے بھی! اُف! (میز پر پیسہ پھینکتا ہے) پیو گے تو مر جاؤ گے، نہ پیو گے تو مر جاؤ گے۔ پینا اچھی بات ہو، مگر خدا کی قسم، وہ دل کو ہلکا کرتا ہے! نشے میں تم بھی غم نہیں رہتا . . . چڑھا جاؤ!

بارساف ۔ اُفوہ! کیسی گرمی ہے!

میرک ۔ اسے یہاں لاؤ! (لاکٹ ٹیہوں سے لیتا ہے اور تصویر کو دیکھتا ہے) شادی کے دن ہی بھاگ گئی . کیا عورت ہو!

ایک آواز ۔ (کونے میں سے) ٹیہوں میرے حساب میں بھی ایک گلاس انہیں پلا دو!

(میرک لاکٹ زور سے زمین پر دے مارتا ہے) لعنت ہو اسپر! (جلدی سے اپنی جگہ جاکر اور دیوار کی طرف منہ کرکے لیٹ جاتا ہے)

(سنسنی)

بارساف ۔ یہ کیا ہوا؟ اسکے کیا معنی؟ (لاکٹ اٹھاتا ہے) جانور تو نے یہ جرأت کیسے کی؟ تجھے کیا حق تھا؟ (آنکھوں میں آنسو بھرکر) چاہتا ہے کہ تجھے مار ڈالوں، کیوں جاہل کسان!

ٹیہوں ۔ حضور بگڑئیے مت . . . یہ شیشے کا نہیں ہے ثابت ہو . . . ایک گلاس اور پیجئے اور پھر سو رہئے (ایک گلاس اور بھرتا ہے) میں باتوں میں لگ گیا . سرائے بند کرنے کا وقت ہو گیا (جاتا ہے اور باہر کا دروازہ بھیڑ دیتا ہے)

بارساف ۔ (پیتا ہے) اس نے جرأت کیسے کی؟ کسقدر بے وقوف ہو! (میرک سے) جانتا ہو کہ

تو احمق ہے ، گدہا ہے ؟

ساوا۔ اچھے دوستو اپنی زبانیں قابو میں کرو! لڑنے جھگڑنے سے کیا فائدہ ؟ لوگوں کو سونے دو؟

ٹیہول۔ لیٹ جاؤ لیٹ جاؤ . . بس ہو چکا! (میز کے پیچھے جاتا ہے اور الماری میں قفل لگا دیتا ہے) اب سونے کا وقت ہے۔

فیڈیا۔ ہے تو ! (لیٹ جاتا ہے) خدا حافظ!

میرک۔ (اٹھتا ہے اور اپنا کوٹ بنچ پر بچھا دیتا ہے) آئیے حضور یہاں لیٹ جائیے۔

ٹیہول۔ پھر تم کہاں لیٹو گے ؟

میرک۔ کہیں . . . فرش پر . . . (جاکٹ فرش پر بچھاتا ہے) انکے لئے فرش پر سونا مصیبت ہوگا۔ . . انہیں ریشم اور مخمل کی عادت ہے۔

ٹیہول (بارساف سے) حضور لیٹ جائیے! تصویر کو بہت دیکھ چکے (شمع بجھا دیتا ہے) بس اب رکھ دیجئے!

بارساف (لڑکھڑاتے ہوئے) کہاں لیٹوں ؟

ٹیہول۔ آوارہ گرد کی جگہ! آپنے سنا نہیں ؟ اُس نے اپنی جگہ آپ کو پیش کی ہے۔

بارساف۔ (بنچ کیطرف جاتا ہے) میں . . . میں . . . نشے میں ہوں . . . یہ . . . یہ ہے . . . یہاں لیٹوں ؟

ٹیہول۔ جی ہاں ڈرئیے مت لیٹ جائیے . . . (میز پر دراز ہو جاتا ہے)

بارساف۔ (لیٹ جاتا ہے) میں . . . نشے میں ہوں . . . سب چیزیں گھوم رہی ہیں . . . (لاکٹ کھولتا ہے) تمہارے پاس موم بتی کا ٹکڑا ہے ؟ (وقفہ) ماشا تم بھی عجیب لڑکی ہو . . . فریم میں سے مجھے دیکھتی ہو اور ہنستی ہو . . . (ہنستا ہے) مدہوش! تمہیں مدہوش آدمی پر نہیں ہنسنا چاہئے! ساشا لیونیف ٹھیک کہتا ہے، تمہیں کسی چیز کا دھیان نہیں . . . ایک مدہوش آدمی سے محبت کرو . . .

فیڈیا۔ ہوا کیا غرا رہی ہے! ڈر لگتا ہے۔

بارساف۔ (ہنستا ہے) تم بھی کیا لڑکی ہو... کیونکر اس طرح رقص کرتی پھرتی ہو؟ ہاتھ نہیں آتیں!

میرک۔ بہک رہا ہے۔ تصویر کو دیکھے جاتا ہے (ہنستا ہے) یہ خوب باجرا ہے۔ ان پڑھے لکھے لوگوں نے مشینیں اور طرح طرح کی دوائیں ایجاد کرلیں مگر ابھی تک کسی سے اتنا نہ ہوسکا کہ عورت سے بچنے کی ترکیب نکالتا... ہر قسم کی بیماری کا علاج کرنیکی کوشش ہوتی ہے مگر یہ کسی کو اندازہ نہیں ہوتا کہ بیماری کی بنسبت عورتوں سے لوگ زیادہ برباد ہوتے ہیں بکار، دولت پسند، نہ رحم نہ سمجھ... بوڑھی عورتیں اپنے بیٹوں کی بیویوں کی زندگی حرام کرتی ہیں بیویاں اپنے شوہروں کو دھوکا دینے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتیں... اور یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا!

نیھون۔ عورتوں نے اس مرغے کی کلغی نوچ لی ہے اور اب مرغا اپنے پر پھیلا رہا ہے

میرک۔ ایک میں ہی نہیں... عرصہ دراز سے جب سے دنیا قائم ہوئی ہے مرد روتے چلے آئے ہیں... یہ بے معنی نہیں ہے کہ سب کہانیوں اور گیتوں میں عورت کا شمار شیطان کیساتھ کیا گیا ہے... یہ بے معنی نہیں ہے! بہر حال اسمیں آدھے سے زیادہ سچ ہے (وقفہ)... یہاں یہ صاحب حماقت میں مبتلا ہیں، اُدھر میں نے آوارہ گردی، ماں باپ سے علیحدگی دانائی سے تو اختیار نہیں کی

فیڈیا۔ عورتوں کی وجہ سے؟

میرک۔ بالکل انکی طرح۔ میں بھی اس طرح رہتا تھا جیسے کسی نے جادو کر دیا۔ بالکل مسحور۔ اپنی خوشی پر فخر کرتا تھا... رات دن گویا آگ لگی ہوئی ہے لیکن ایک وقت آیا کہ میری آنکھیں کھل گئیں... وہ محبت نہیں تھی دھوکا تھا...

فیڈیا۔ تم نے اُس عورت کا کیا کیا؟

میرک۔ اس سے تمہیں کیا... (وقفہ) تم سمجھتے ہو میں نے اسے مار ڈالا؟ میرا ہاتھ نہیں اُٹھا...

آدمی انہیں ہلاک نہیں کرتا۔ بلکہ انپر رحم کھاتا ہے۔۔ جی اور خوش رہ گھاس کی ناگن،
بس اگر تو میری آنکھوں کے سامنے نہ آئے اور میں تجھے بھول جاؤں! (دروازہ پر دستک)
ٹیہول۔ کون شیطان ہے؟ کون ہے؟ (دستک) کون کھٹکھٹاتا ہے؟ (اٹھتا ہے اور دروازہ
کی طرف جاتا ہے) کون کھٹکھٹاتا ہے؟ کھٹکھٹائے جاؤ؟ دروازہ اندر سے بند ہے!
آواز۔ (دروازے سے) ٹیہول خدا کیلئے اندر آنے دو! گاڑی کا ایک پہیہ ٹوٹ گیا! میری مدد کرو
باپ کی جگہ لو! اگر ہمارے پاس باندھنے کو ذراسی رسّی ہوتی، تو کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ جاتے۔۔
ٹیہول۔ کون ہے؟
آواز۔ (دروازے سے) بیگم صاحبہ شہر سے وارسونوفیو دجا رہی ہیں۔۔۔ صرف چار میل جانا رہ گیا
ہے! خدا کے لئے میری مدد کرو!
ٹیہول۔ اپنی بیگم صاحبہ سے کہو کہ اگر وہ دس روبل دیں تو رسی بھی مل جائیگی اور پہیئے کی مرمت
بھی ہو جائے گی۔
آواز۔ (دروازے سے) سرپھرا ہے؟ دس روبل! پاگل کتّے دوسروں کی تکلیف سے خوش ہوتا ہے۔۔۔
ٹیہول۔ تمہیں اختیار ہے۔۔۔ نہیں دینا چاہتے، نہ دو۔۔۔
آواز۔ (دروازے سے) اچھا ذرا ٹھہرو (وقفہ) بیگم صاحبہ کہتی ہیں اچھی بات ہے۔
ٹیہول۔ اندر آجاؤ (دروازہ کھولتا ہے۔ ڈینیس داخل ہوتا ہے)
ڈینیس۔ لاؤ رسی! دو جلدی کرو! جو تو جو مدد دیگا اُسے انعام ملیگا!
ٹیہول۔ کسی کی ضرورت نہیں۔۔۔ انہیں سونے دو، ہم دونوں ٹھیک کرلیں گے!
ڈینیس۔ اُف میں تھک کے چور ہو گیا ہوں! سرد، کیچڑ میں لتھڑا ہوا بدن پر ایک سوکھا تا نہیں
۔۔۔ ایک بات اور ہے۔۔۔ تمہارے پاس کوئی جگہ ہے جہاں بیگم صاحبہ ذرا گرم ہو لیں؟
گاڑی بالکل ایک طرف کو جھک گئی ہے اسمیں بیٹھا نہیں جا سکتا۔۔۔۔
ٹیہول۔ کمرہ بھی چاہتی ہیں؟ سردی لگ رہی ہے تو یہاں آکر گرم ہو جائیں۔۔۔ ہم اُنکے لئے کمرہ

ڈھونڈ دیں گے! (بارساف کے پاس جاتا ہے اور جگہ صاف کرتا ہے) اُٹھو! اٹھو! گھنٹہ بھر کیلئے فرش پر جا لیٹو، اتنے بیگم صاحبہ گرم ہو لیں۔ (بارساف سے) اُٹھیے حضور! ذرا کھڑے ہو جائیے! (بارساف اُٹھ جاتا ہے) یہ رہی آپ کے لئے جگہ!

(تو بنیں باہر جاتا ہے)

فیڈیا۔ پھر کوئی نازل ہوا، اسے طاعون غارت کرے! اب صبح تک سونا مل چکا

ٹیہول۔ افسوس میں نے پندرہ روپل نہیں مانگے ... وہ دے دیتی (دروازے کے آگے متوقعانہ انداز میں کھڑا ہوتا ہے) ... تم لوگوں کو چاہئے کہ شرافت سے پیش آؤ ... بس اب گالی گلوج موقوف ....

(میریا گیوروفنا، اور اس کے پیچھے ڈینس داخل ہوتے ہیں ٹیہول مودبانہ جھکتا ہے)

ٹیہول۔ بیگم صاحبہ۔ اندر تشریف لائیے! ہمارا غریب خانہ صرف دہقانوں اور مزدوروں کے قابل ہے ... اسے عزت بخشئے!

میریا گیوروفنا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا ... کدھر جانا ہے؟

ٹیہول۔ بیگم صاحبہ اسطرف (بارساف کے قریب نشست پر لے جاتا ہے) اسطرف تشریف لائیے! (نشست کو پھونک کر صاف کرتا ہے) میں معافی چاہتا ہوں، میرے پاس علیحدہ کمرہ نہیں ہے۔ مگر حضور اطمینان فرمائیں۔ یہ بھلے خاموش لوگ ہیں ...

میریا گیوروفنا۔ (بارساف کے پاس بیٹھتی ہے) کسقدر گھٹن ہے کم از کم دروازہ تو کھول دیا جائے!

ٹیہول۔ بہت بہتر حضور! (دوڑ کر دروازہ کھول دیتا ہے)

میرک۔ لوگ سردی میں اکڑ رہے ہیں اور یہاں دروازے کھل رہے ہیں (اٹھتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے) یہ حکم چلانیوالی کون ہے؟ (لیٹ جاتا ہے)

ٹیہول۔ بیگم صاحبہ، اسے درگزر فرمائیں۔ یہ سادہ لوح ہے ... اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے ... مگر حضور نہ گھبرائیں ... آپ کو کچھ نہیں کہے گا ... ہاں حضور معاف فرمائیں، میں دس

روبل پر رضامند نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ پندرہ میں اگر آپ کی اجازت ہو۔

میریاگیوروفنا ۔ اچھی بات ہے، ذرا جلدی کرو۔

ٹیہون ۔ ابھی لیجئے، پلک جھپکاتے میں سب کام ہو جائیگا ۔ ۔ ۔ (میز کے نیچے سے رسی نکالتا ہے) ابھی لیجئے ۔ ۔ ۔ (وقفہ)

بارساف ۔ (غور سے میریاگیوروفنا کو دیکھتا ہے) میری ۔ ۔ ۔ ماشا ۔ ۔ ۔

میریاگیوروفنا ۔ (بارساف کو دیکھتے ہوئے) کیا خوب!

بارساف ۔ میری ۔ ۔ ۔ تم ہو؟ کہاں سے آ رہی ہو؟

(میریاگیوروفنا، بارساف کو پہچان کر چیخ مارتی ہے اور اس کے پاس سے دوڑ کر کمرے کے بیچ میں پہنچ جاتی ہے)

بارساف ۔ (اسکا تعاقب کرتا ہے) میری ۔ ۔ ۔ میں ہوں ۔ ۔ ۔ میں ہوں ۔ ۔ ۔ (ہنستا ہے)۔ میری بیوی! میری! میں کہاں ہوں؟ کوئی بتی جلائے!

میریاگیوروفنا ۔ دور ہو! جھوٹ کیوں بولتے ہو تم نہیں ہو؟ تم نہیں ہو! یہ کیسے ہو سکتا ہے! (اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے) یہ جھوٹ ہے! ناممکن ہے!

بارساف ۔ اسی کی آواز، اسی کی چال ڈھال! ۔ ۔ ۔ میری میں ہوں! میں ابھی ۔ ۔ ۔ ایک منٹ ۔ ۔ ۔ مدہوش نہیں ہونگا ۔ ۔ میرا سر چکرا رہا ہے ۔ ۔ ۔ میرے اللہ، ذرا ٹھیرو ۔ ۔ ۔ ذرا ٹھیرو ۔ ۔ ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا (زور سے چیختا ہے) بیوی اُس کے قدموں میں گرتا ہے اور ہچکیاں لیتا ہے)

(میاں اور بیوی کے گرد ایک حلقہ قائم ہو جاتا ہے)

میریاگیوروفنا ۔ دفع ہو! ڈینس سے! ڈینس چلنا چاہئے! میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی!

میرک ۔ (کود کر کھڑا ہوتا ہے اور اُس کے چہرے پر نظریں جما دیتا ہے) وہی تصویر! (اس کا ہاتھ کھینچتا ہے) وہی ہے لوگو! بارساف صاحب کی بیوی!

میریا گوروفنا۔ دور ہو دہقان! (اپنا ہاتھ چھڑانیکی کوشش کرتی ہے)
ڈینس۔ کا ہے کا انتظار ہی؟ (ڈینس اور ٹیہوں اسکے پاس دوڑکر پہنچتے ہیں اور میرک کا بازو پکڑ لیتے ہیں) اچھا خاصا قزاقوں کا بھٹ ہی! میرا ہاتھ چھوڑ دو! میں تم سے نہیں ڈرتی!۔۔۔ دفع ہو!
میرک۔ ذرا ٹھیرو، ابھی چھوڑ دونگا۔ ذرا مجھے ایک بات کہنے دو۔۔۔ ایک بات۔ جو تمہاری سمجھ میں آجائے۔۔۔ ذرا ٹھیرو۔ (ٹیہوں اور ڈینس کیطرف رخ کرتا ہے) ہٹو کمبختو مجھے مت پکڑو! جبتک ایک بات نہ کہلوں اسے نہیں جانے دونگا۔ ذرا ٹھہرو۔۔۔ منٹ بھر میں! پیشانی پر مکا مارتا ہے) نہیں خدا نے مجھے سمجھ نہیں دی! میری سمجھ میں نہیں آتا تم سے کیا کہوں!
میریا گوروفنا۔ (اپنا ہاتھ کھینچ لیتی ہی) دور ہو! سب نشے میں ہیں۔۔ ڈینس چلو! (دروازے کیطرف بڑھنا چاہتی ہی)
میرک۔ (راستہ روک لیتا ہی) اچھا اُسے ایک نظر تو دیکھو! ایک میٹھے بول ہی سے تشفی دو! خدا کے واسطے!
میریا گوروفنا۔ لے جاؤ۔۔ اس پاگل کو میرے پاس سے
میرک۔ غارت ہو کمبخت! (کلہاڑی پھراتا ہے)
(سخت گڑبڑ سب کے سب غل مچاتے ہوئے خوف زدہ ہو کر اچھل پڑتے ہیں)
ساوا۔ میریا گوروفنا اور میرک کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے۔ ڈینس زور سے میرک دھکا دیتا ہی اور نئی بیگم کو سرائے سے نکال کے لے جاتا ہی۔ اسکے بعد سب کھڑے کے کھڑے رہجاتے ہیں
پارسا ف۔ (ہوا کو ہاتھ میں پکڑتا ہی) میری۔۔ میری، کہاں ہو؟
نزاروفنا۔ ہائے رے ہائے رے۔۔۔ قاتلو تم نے میرا دل پاش پاش کر دیا کیسی دہشت ناک رات ہے!
میرک۔ (جس ہاتھ میں کلہاڑی ہی اسے گراتے ہوئے) میں نے اسکا خاتمہ کر دیا۔
ٹیہوں۔ خدا کا شکر ہے اسوقت تمہاری جان بچ گئی۔۔۔
میرک۔ تو میں نے اُسے ہلاک نہیں کیا۔۔۔ (لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ جاتا ہی) میری قسمت میں نہ تھا کہ چرائی ہوئی کلہاڑی سے مروں۔۔ (اپنے کوٹ پر گرتا ہے اور ہچکیاں لیتا ہی) آہ مصیبت تندہ مصیبت! نیک عیسائیو! مجھپر رحم کھاؤ! پردہ

خواجہ منظور حسین

چین میں اعلیٰ تعلیم

تاریخی شواہد اگرچہ خال خال ہی موجود ہیں تاہم اسمیں شک نہیں کہ تہذیب وتمدن کے پودے نے سب سے پہلے سرزمین چین میں جڑ پکڑی۔ ظہور مسیح سے دو ہزار سال قبل بھی ہمیں یہاں اعلیٰ تعلیم کے انتظامات کا پتہ چلتا ہے جنہیں "تے - شوہیہ" کہتے تھے۔ کہ یہ تعلیم کی ابتدائی شکل نشو ونما پا کر ایک نظام تعلیم کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جسکا نام تھا "کو دتے چین" اخلاق، سیاست اور ادب کی تعلیم اس کے اجزا تھے۔

یہ ایک لازمی ارتقا، تھا جو ظہور پذیر ہوا اور پھر اسمیں رفتہ رفتہ دوسرے مضامین مثلاً تحریر اور ریاضی کا اضافہ ہوا۔ لیکن ان اضافوں سے قدیم نظام تعلیم پر کوئی بڑا اثر نہ پڑا۔ چند صدیوں تک تعلیم کا مقصد بس یہ تھا کہ لوگوں کو ایسی علمی تعلیم دیجائے جو انہیں مناسب حکومت کے کاروبار کے لائق بنادے اور بحیثیت عمومی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم چین میں تعلیم نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی تھی لیکن اسکی اہمیت کے اندازہ میں غلو سے بچنا چاہئے۔

منچوری حکومت کے آخری زمانہ میں مشرق بعید میں ایک بنیادی تغیر کا آغاز ہوا۔ اور تعلیم کے لئے بھی لازمی ہو گیا کہ دیگر مظاہر حیات کیساتھ اپنے کو تبدیل کرے۔ ہمارے سامنے اب یہ اہم مسئلہ آیا کہ مغربی انداز کے ایسے دارالعلوم قائم کئے جائیں اور انکا دستور اور انتظام ایسا ہو کہ یہ ہماری ذہنی زندگی کیلئے قوت حیات بہم پہنچائیں لیکن ساتھ ہی ہمارے قدیم روایات تعلیم وتدریس فنا نہ ہوں۔ چنانچہ ان جامعوں میں علوم قدیم کا ایک خود مختار شعبہ کھولا گیا جو مغربی جامعوں کے شعبہ دینیات کا مرادف ہے۔ ان جامعوں کے قیام میں بھی جو خیال ہمیشہ پیش نظر رہا وہ یہ تھا کہ خدمت سرکاری کے لئے مفید اور کارآمد آدمی تیار کئے جائیں۔ ۱۹۱۱ء میں قیام جمہوریت نے جب حکومت کی باگ قوم کے ہاتھ میں دیدی تو آزادی اور جمہوریت کی نئی روح نے جامعوں کے اندر بھی ظہور کیا۔ اور سب سے پہلی اصلاح جو کی گئی وہ یہ تھی کہ علوم قدیمہ کا شعبہ توڑ دیا گیا اور قواعد وضوابط کی ترمیم کر کے فنون حکمیات، طب، زراعت، مشین سازی، قانون، تجارت وغیرہ کے شعبے قائم کئے گئے۔

اس جدید نظام کے ماتحت بہت سے جامع قائم ہوئے اور انہیں سے تقریباً سب نے حکومت کے مذکورہ بالا خواہشات کا خیال رکھا۔ آج بھی بہت سے دارالعلوم مرکزی حکومت کے زیر اثر ہیں اور انکے مصارف کا انتظام بھی حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ مثلاً پیکنگ کی قومی یونیورسٹی، تین سین کی، پیانگ یونیورسٹی، تیانگ کی شنانگسی یونیورسٹی جنوبی مغربی چین میں نانکن کی قومی یونیورسٹی ہوپے میں ووخانگ یونیورسٹی وغیرہ کچھ عرصہ ہوا کہ بعض صوبوں کیطرف سے مختلف دارالعلوم قائم ہوئے ہیں اور بعض قائم ہونے والے ہیں۔ کلاآن سے شینسی، ہونان، کینتن، اور نیان کی جامعوں کا آغاز نہایت حوصلہ افزا ثابت ہوا ہے۔ بعض ایسی درسگاہیں اور Institutes بھی ہیں جو مخیر اشخاص کے روپیہ سے چلائے جا رہے ہیں اور اپنے حسن انتظام کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں مثلاً تین سین میں ننکائی کالج اور اموئے کی یونیورسٹی۔ بہت سی تعلیم گاہیں ایسی بھی ہیں جنہیں حکومت تسلیم کرتی ہے انکی ظاہری شکل بھی سرکاری جامعوں کی سی ہے البتہ مضامین درس اور شعبوں کی ترتیب میں کچھ اختلاف ہے۔ یہ سب کی سب تعلیم گاہیں علمی پیشوں اور خاص مضامین کی علمی تحقیق کیلئے لوگوں کو تیار کرتی ہیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ اس تعلیمگاہ کا ذکر ذرا تفصیل سے کروں جس سے خود میرا تعلق ہے یعنی جامعہ پیکنگ یہ بات عام طور پر معلوم ہوگی کہ اپنی ابتدا اور بعد کی تاریخ کی بنا پر اس تعلیمگاہ کا ایک خاص نظام ہے۔ میں سطور ذیل میں کوشش کروں گا کہ اس کے خصائص اور رجحانات اور اسکی آئندہ ترقی کے امکانات پر کچھ روشنی ڈالوں۔

۱۹۱۲ء میں تجویز کی گئی کہ اس جامع میں تمام شعبوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن بعض شعبوں کی تعلیم کا انتظام چونکہ دوسری تعلیمگاہوں میں تھا اور اس کے لئے زیادہ تیاریاں تھیں اسلئے پھر جلدی یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اور اس جامع نے فنون، کلیات، مشین سازی اور قانون کی تعلیم کے لئے اپنے کو وقف کر دیا۔ ۱۹۱۷ء تک جامع کے یہ چاروں شعبہ خوب ترقی کرتے رہے اور چین کی تعلیمی فضا پر انہوں نے بہت گہرا اثر ڈالا لیکن بعد میں پیانگ یونیورسٹی اور پیکنگ کے صنعتی تعلیمگاہ کے

خیال سے اس جامع میں مشین سازی کی تعلیم موقوف کردی گئی اور اسکا یہ شعبہ اب مذکورہ بالا تعلیمگاہوں سے مل کر کام کرنے لگا۔ اسکا اثر یہ ہوا کہ صرف پیکنگ ہی میں نہیں بلکہ چین کی تمام جامعوں میں مختلف شعبے رکھنے والی تعلیمگاہ کے خیال سے جس سے "جامع" عبارت ہے لوگ ہٹ چلے اور اس کے بعد سے تخصیص کار کا خیال کرکے ایک ہی شعبہ کی اعلیٰ تعلیمگاہ کا خیال فروغ پانے لگا۔ یہی وہ تغیر ہے جس سے چین کی سرکاری او نیم سرکاری اعلیٰ تعلیم کا موجودہ نظام پیدا ہوا ہے۔ اس تبدیلی سے اب یہ ممکن ہے کہ یونیورسٹی میں تھوڑے سے شعبے یا صرف ایک شعبہ ہو اور اس شعبہ کی حیثیت امریکن یونیورسٹی کے کالج کی سی ہو۔

ہماری یونیورسٹی میں فنون حکمیات اور قانون کے جو شعبے پرانے نظام کے مطابق تھے انھیں ۱۹۲۰ء میں پانچ حصوں میں منقسم کردیا گیا جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

شعبہ اول: ریاضی، طبعیات، ہیئت

شعبہ دوم: کیمیا، طبقات الارض، حیاتیات

شعبہ سوم: نفسیات، فلسفہ، تعلیمات

شعبہ چہارم: چینی ادب اور زبان، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ادب اور زبان۔ نیز دوسری زبانوں کے ادب۔

شعبہ پنجم: معاشیات، سیاسیات، قانون، تاریخ و جغرافیہ

دوسرے مضامین کے درس کا جو انتظام ہونیوالا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے انہیں پانچ شعبوں میں سے کسی کے ساتھ ملا دئے جائینگے۔

اس تبدیلی کی بڑی وجہ یہ احساس تھا کہ ملک کی نئی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے قدیم نظام تعلیم میں بنیادی تغیر ضروری ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل وجوہ ان تغیرات کا باعث ہیں!

(۱) نظری حیثیت سے یہ ممکن تھا منطقی صحت کیساتھ بعض مضامین درس کو فنون یا علوم کے ماتحت لایا جائے یہ بذات خود کوئی آسان کام نہیں کہ تمام علوم کی سختی سے حدبندی کیجائے۔ مثلاً

جغرافیہ کا مضمون بہت سے شعبوں کے تحت میں آسکتا ہے۔ سیاسی جغرافیہ قانون کے شعبہ کی ایک شاخ ہے۔ حیاتیات یقیناً علوم فطرت میں شامل ہیں جب انہیں نباتات وحیوانات کی ساخت اور افعال اعضا کی بحث ہو لیکن جب مسئلہ ارتقا پر دینی نقطہ نظر سے بحث ہو تو کیا ایک شخص یہ انہیں حق بجانب نہیں کہ اس مسئلہ کو حیاتیات کی اصل تسلیم کرے۔ پھر جن مضامین میں زندہ اشیا سے بحث ہوتی ہے انکی حد بندی تو اور بھی دشوار ہے۔ مثلاً نفسیات کو عموماً فلسفہ کا جزو سمجھا جاتا ہے لیکن جب سے ماہرین نفسیات نے تجربہ کے طریقہ پر عمل شروع کیا ہے، بعض ماہرین نفسیات کو ایک طبعی بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش شروع کی ہے اسوقت سے لوگ اسے علوم فطرت میں شامل کرنا چاہتے ہیں ..... ان وجوہ سے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر چند لفظ "شعبہ" (فیکلٹی) کا نام جرمنی میں عام رواج پاچکا ہے لیکن اسے ترک کر دوں۔

(۲) جب کوئی طالبعلم یونیورسٹی میں داخل ہوتا ہے اور جب ایک مضمون کا نظام اوقات دوسرے سے بالکل جدا پاتا ہے تو اسے بڑی دشواری ہوتی ہے۔ فطرتاً طالبعلم حتی الوسع فلسفیانہ رجحانات اور انکے مقاصد سے اجتناب کرتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی تعلیم میں ایک قسم کی یکرنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اسطرح ایک خود غرض اور میکانکی رجحان خیال رکھنے والا طبقہ پیدا ہوتا ہے۔ فلسفہ کے طلبہ اسکی پیچیدگیوں سے بچنے کیلئے طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کے مطالعہ میں جاپڑتے ہیں اور اس طرح قبل اس کے کہ یہ فلسفیانہ نتائج پر پہونچیں انکے پیر تلے سے زمین نکل چکی ہوتی ہے سوائے ان غیر معمولی دماغ والے طلبہ کے جو اپنے ماحول کی حقیقی ماہیت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ لئے ہم نے اس سرحد ہی کو مٹا دیا جو مختلف مضامین کے طلبہ کے درمیان قائم تھی۔

(۳) اب یونیورسٹی کے اندرونی انتظام کیطرف توجہ کریں۔ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ پرانے نظام کے ماتحت بڑی سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ خرابی اس سے پیدا ہوتی تھی کہ ہر شعبہ میں ایک ڈیکان ہوتا تھا جو اپنے شعبے میں تعلیم کے تمام سیاہ وسفید کا مختار تھا اور صرف یونیورسٹی کے چانسلر کے ماتحت ہوتا تھا۔ یہ نظام ایک طرح کی خود مختارانہ حکومت تھی جمہوریت

کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکا ترک کرنا بھی لازم ہوگیا۔ اور اس کے بجائے تمام پروفیسروں کی ایک جمعیۃ ترتیب دی گئی۔ یہ سب مل کر ہر شاخ اور شعبے کے لئے ایک ایک جماعت انتظامیہ منتخب کرتے ہیں۔ پھر یہ انتظامی جماعتیں تمام شعبوں کے لئے ایک ڈیکان کا انتخاب کرتی ہیں یہ ڈیکان ان انتظامی جماعتوں کی مدد سے تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔ چانسلر کو اختیار ہے کہ وہ بعض معلین کی جماعتیں بنا کر انکے ذمہ یونیورسٹی کے بعض صیغوں کا کام کر دے۔ مثلاً کتب خانہ۔ تجربہ گاہ، حساب وغیرہ کا انتظام۔ یہ کمیٹیاں خود اپنا صدر منتخب کرتی ہیں۔ اور پھر یہ صدر صیغوں کے انتظام کیلئے ضروری آدمی فراہم کرتا ہے۔

اس طرح ایک قسم کا دوہرا انتظام قائم ہوگیا ہے جسمیں ایک طرف جمعیۃ معلین اور دوسری طرف جمعیۃ منتظمین ہے۔ لیکن اس قسم کا نظام لامحالہ ناقص ہے جبتک اسپر کوئی قانونی جماعت بالادست نہ ہو۔ یہ جماعت "سنیت" کے نام سے تمام معلین منتخب کرتے ہیں۔

ہماری جامعہ کا مقصد یا مطمح نظر یہ ہے کہ بے تعصب مطالعہ کے مذاق کو نشو ونما دے تاکہ علم علم کی خاطر حاصل کیا جائے۔ ہم کبھی یہ نہیں سمجھتے کہ جامع طلبہ کو محض ایسی تعلیم دے کہ وہ آگے چلکر اپنے پیشہ کے فرائض کو کماحقہٗ ادا کرسکیں۔ یہ ضروری ہے کہ جامع سے ہر سال کثرت سے ایسے طلبہ نکلتے ہیں جو کسی نہ کسی پیشہ میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ایسے طلبہ بھی ہوتے ہیں جو حصول سند کے بعد تمام تر وقت علمی تحقیق کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور انکے تحقیقاتی کاموں کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ میں اسکا بھی ذکر دوں کہ کچھ عرصے سے ہماری یونیورسٹی میں تحقیق کے لئے بعض وظائف بھی جاری کئے گئے ہیں اور ہمارے ملک میں از منہ قدیم سے "سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالات" کے مطمح نظر کے لوگ محض وعظ ہی نہیں دیتے بلکہ اسپر عامل بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ راقم کی رائے میں ہماری یونیورسٹی کے اہم ترین مقاصد میں سے یہ بھی ہے سیرت اور شخصی زندگی کا ایک ایسا بلند معیار پیدا کرے جس سے اچھے طلبہ اور پھر اچھے انسان پیدا ہوں۔

اعلیٰ تحقیق کو فروغ دینے کیلئے یونیورسٹی نے یہ خاص انتظامات کئے ہیں۔

(۱) اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ پروفیسر اور لکچرر نہ صرف درس دیں بلکہ جدید تحقیق کے نتائج سے بھی اپنے کو آگاہ رکھیں اور اس کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

(۲) ہر صیغہ میں اساتذہ اور طلبہ نے ملکر تحقیق کا کام شروع کر دیا ہے۔

(۳) تحقیق کرنے والوں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس مسئلہ پر چاہیں تحقیق کریں اور اسمیں سیاسی، مذہبی، رسمی یا روایتی اثرات سے بالکل متاثر نہ ہوں۔ یہانتک کہ اگر خلاف مذہب خیالات کے اظہار کی نوبت بھی آجاتی ہے تو بھی اس پر نہایت ٹھنڈے دل سے گفتگو ہوتی ہے تاکہ علمی تحقیق میں بیجا جذبات مخل نہ ہوں۔

سیرت اور شخصیت کے نشو و نما کیلئے یہ تدابیر اختیار کیجاتی ہیں۔

(۲) ا۔ جسم کی نشو و نما کے لئے یونیورسٹی میں ہر طرح کے کھیلوں اور کسرتوں کے مقابلہ ہوتے ہیں۔ کھلے میدانوں میں تفریح اور کھیل کے خاص انتظام پائی تائی (جمعیتہ طلبہ جامع پیکنگ) کیطرف سے ہوتا ہے اور انکا مقابلہ ہر حیثیت سے مغربی جامعوں کے کھیلوں سے ہو سکتا ہے۔ فٹ بال، ٹینس، تیراکی، کشتی رانی اور گھوڑ دوڑ پر خاص توجہ کیجاتی ہے۔ ۲۔ طلبہ نے خود ایک قسم کی فوجی تربیت کا انتظام کیا ہے اور اسکاؤٹ بننے کی تحریک نے بڑا اثر پیدا کر لیا ہے۔

(ب) مذاق لطیف کے پیدا کرنے اور نظر میں فنون لطیفہ اور فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہونیکی صلاحیت کو نشو و نما دینے کے لئے فنون لطیفہ اور موسیقی کے رواج دینے کی غرض سے جمعیتیں قائم کی گئی ہیں۔

(ج) ہمسایوں کی خدمت کا جذبہ طلبہ میں یوں پیدا کیا جاتا ہے کہ غیر تعلیمیافتہ اور مزدوری کرنے والی آبادی کیلئے فرصت کے اوقات میں طلبہ کچھ کریں۔ شبینہ مدارس قائم ہیں اور دیہاتوں میں طلبہ کی طرف سے معلومات عامہ کے درس ہوتے ہیں۔

سیاسی اور اجتماعی مسائل کے متعلق نئی چینی نسل کے خیالات میں طرح طرح کی جدت [illegible]

ہے اور اس نئے انکار و یہ بہت مختلف اور بہت پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام سیاسی تحریکوں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ طلبہ تقریباً سارے ملک میں حصہ لیتے ہیں۔ طلبہ میں یہ سیاسی تحریک بہ چند کہ دور حاضر کی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن ہان اور منگ خاندان کے عہد حکومت میں بھی اس قسم کی تحریکوں کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ ان پچھلے دنوں اس تحریک نے بلووں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جہاں تک منتظمین یونیورسٹی کا تعلق ہے انہیں کوئی خرابی نہیں کہ طلبہ اپنے جذبات وطن پرستی اور عقائد سیاسی کی بنا پر کچھ عمل کریں۔ تعلیم جدید نے طلبہ کو ہر قسم کے جبر سے آزاد کر دیا ہے۔ اس آزادی نے نئی پود کے دلوں میں نئے نئے مقاصد، اغراض اور خدمت قومی کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور انہیں قیادت اور تنظیم کی قوت کو ابھارا ہے، ہاں اس کے ساتھ ہی طلبہ اور انکی علمی ترقی کے لئے خطرات بھی ہیں۔ اور بس اسی خیال سے یونیورسٹی اپنے طلبہ کو نہایت ہمدردانہ طریق پر ان خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

یہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس میں چین کی اعلیٰ تعلیم کے رجحانات کا ایک خاکہ پیش کرنا مقصود تھا اور یہ اس ذاتی تجربہ پر مبنی ہے جو مجھے پیکنگ کی قومی یونیورسٹی میں قیام کے باعث حاصل ہوا ہے ممکن ہے کہ اور مقامات پر نئی راہیں نکالی جا رہی ہوں اور نئے خیالات کا خمیر اٹھ رہا ہو۔ اور یہی نہیں بلکہ ان اصلاحوں سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے مقاصد میں تبدیلی ابھی شروع ہوئی ہے۔

عید قرباں

حسن عشق آموز جاناں تیری شوخی کے نثار — مجھکو مجھ سے کھو دیا اور خود رہا بیگانہ وار

چہرۂ زیبا پہ تیرے بے نقابی ہے نقاب — دیکھنے والوں کی نظریں نگیں خود پردہ دار

پھر دکھا دے اپنا جلوہ اے جمال طور سوز — ہم بھی جل جائیں فروغ حسن سے پروانہ وار

ہے ہمارا دل بھی ممنون نگاہ شعلہ خو — ہم بھی رکھتے ہیں جگر میں سوز الفت کا شرار

دل نے سیکھا تھا نگاہوں سے محبت کا چلن — اب نگاہیں دل سے سیکھیں گی تڑپنے کا شعار

دل میں تو آنکھوں میں تو خلوت میں تو جلوت میں تو — ہر طرف تو ہے تو پھر اس "میں" کا کیا اعتبار

نیست این ہستی بجز عکس جمال شاہدے
لاشریکے، لایزالے، ذوالجلالے، واحدے

دل کہ تھا روز ازل زینت فضائے بزم یار — آج وہ حسرت کا مرقد ہے تمنا کا مزار

آ ادھر اے بیکسی تو ہی مری دمساز ہے — کر مدد اے ناامیدی تو ہے میری غمگسار

نارسا ہے آہ میری کیا کروں مجبور ہوں — گر پہنچ جائے تو ہو جائے فلک کے دل کے پار

آہ لیکن آج تو عید الضحیٰ کا روز ہے — دل بہت حرص تمنا کے لئے ہے بے قرار

آج میں اس جبر کے پردے کو کردوں چاک چاک — جبر اے مالک مجھے مل جائے اتنا اختیار

مرحبا اے سوز غم دردو درون را تازہ کن — حبذا اے نیش الفت زخم دل را زندہ دار

باز آمد عید قرباں در دل ویران من
باز شد آئینہ دار یار من مہمان من

جانتی ہے عید بھی طرز تغافلہائے یار — ہائے اس کا منہ دکھانا سال بھر میں ایکبار

اے تعالی اللہ کیسا خوشدلی کا روز ہے — ہر خوشی دنیا کی اس دن ہے مسرت پر نثار

اہل دل باہم گلے ملتے ہیں کس کس شوق سے — دل سے دل کو راہ ہے سینہ سے سینہ ہمکنار

نعرہ الیوم عیدٌ ساز لب سے نغمہ ریز — کتبہ الحب للّٰہ لوح دل پر آشکار
سحرِ بادہ عشرتِ محو سرخوشی — رخ و فورِ نشۂ شادی سے ہمرنگ بہار
باش اے طبع فضولم یا وہ گوئی تاکجا — نعرۂ مستانہ سنج و خموشی عرضہ دار

بس خجل ہستم نہ دارم فدیہ شایان تو
آنچہ غیر از تست شاہا میکنم قربان تو

تصویرِ حال

گلشن نہ ہم صفیر نہ وہ آشیاں رہا — میں یوں مٹا کہ کچھ بھی نہ باقی نشاں رہا
تقریر میں وہ سوز نہ انداز جوش میں — تحریر میں نہ خامہ میرا خونچکاں رہا
گریہ سے زخم چشم ہوا۔ زخم جس کے داغ — یوں لالہ کس کے ہجر میں شبنم فشاں رہا
نایاب تھا میں تو میں اچھالا ہی موج نے — رسوا کیا اسی نے کہ جو راز داں رہا
خود کام دوستوں کی لگاوٹ میں لاگ تھی — میں سادگی سے غافل سود و زیاں رہا
کشتی رہی ہے سیل حوادث کے دوش پر — چرخ ستم شعار مرا بادباں رہا
کھینچا کب اس نے ہاتھ ستم سے کہ شل تیر — کھنچکر اگر رہا بھی تو زیر کماں رہا
لیکن نہ دیکھ مجھکو حقارت سے ای فلک — وہ میں ہوں ہر زباں پہ جو داستاں رہا
عالم ہے جانتا کہ مشرب تھا صلح کل — دشمن ہوا کہ دوست میرا میہماں رہا
غیروں کی جاں پہ کرکے نثار اپنی زندگی — امیدوار زندگیٔ جاوداں رہا
میں عالم کرم میں ہمائے فلاح کا — ہم آشیاں رہا ہوں بلند آشیاں رہا
جس تک نہ اڑکے طائر سدرہ پہنچ سکا — میں اس مکین عرش کا بھی راز داں رہا
دہشت سے جسکی ناطقہ موسیٰ کا بند تھا — میں اس کا ہمکلام رہا ہمزباں رہا
مستانہ راز دل لب گویا سے کھل گیا — سب بھید مے کا قلقلِ مینا سے کھل گیا

شذرات

ہم نے وعدہ کیا تھا کہ رسالہ مہینہ کی دس تاریخ کے قریب نکالا کرینگے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اسمیں بہت سی دقتیں واقع ہونگی۔ خریداروں کی تعداد ماشاءاللہ بڑھ رہی ہے۔ انہیں ہر مہینہ نئے وی۔پی بھیجنا پڑتا ہے اور (یہ ایک راز کی بات ہے جو صرف آپ سے کہی جاتی ہے) دس تاریخ کا وی۔پی "گاہ باشد" لیکن پہلی تاریخ کا تیر بہدف ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ رسالہ آخر ماہ میں نکالا کرینگے یعنی ہر مہینہ کا رسالہ اُس مہینہ کی ۳۰ - ۳۱ تاریخ یا دوسرے مہینہ کی پہلی تک قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ جایا کرے گا۔ اسمیں یہ مصلحت بھی ہے کہ ہمارا مطبع عموماً مہینہ بھر کے خدانخواستہ اپنے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے گناہوں کے کفارہ میں آخر ماہ میں بہت مستعدی سے کام کرتا ہے۔

جامعہ ملیہ کے وفود جنکی اطلاع پہلے دی جاچکی ہے حیدرآباد، صوبجات متوسط اور برار روانہ ہوگئے ہیں۔ پہلے وفد کے رئیس ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم۔اے پی ایچ ڈی ہیں جنکے ہاتھ میں جامعہ کے نظم ونسق کی باگ ہے اور دوسرے کے جناب خواجہ عبدالحی صاحب استاد تفسیر و ناظم شعبہ دینیات ان دونوں کی غرض وفود کے لے جانے سے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنا تعلیمی کام کرنے والوں سے تبادلہ خیالات کرنا اُنکے تجربات سے فائدہ اٹھانا اور اُنہیں اپنی رائے سے فائدہ پہنچانا اور ساتھ ساتھ جامعہ ملیہ کے مقاصد کی اشاعت ہے۔ چندہ جمع کرنا ان کے دستور العمل کا کوئی اہم جز نہیں ہے لیکن ہمیں قابل وثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اگر اہل ہمت چھوٹی بڑی کمشت یا ماہانہ رقوم جامعہ کے مختلف شعبوں کے قیام وترقی کیلئے ان حضرات کو دینا چاہیں گے تو انکو قبول کرنے میں زیادہ تامل نہ ہوگا۔ اگر یقین نہ ہو تو تجربہ کیا جاسکتا ہے۔

اپنے قارئین کرام کو ہم صرف رسالۂ جامعہ کا خریدار نہیں بلکہ جامعہ ملیہ کا سرپرست اور خادم محسن اور احسانمند سمجھتے ہیں اس لئے ہماری یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ انمیں سے ہر شخص جو حیدرآباد صوبہ متوسط یا برار کا باشندہ ہی ہمارے وفود کی مدد اس طرح کریگا گویا وہ خود انکا رکن ہے۔

محترم ہمعصر "سچ" اپنی ایک تازہ اشاعت میں اُس نوٹ کا ذکر کرتے ہوئے جو ہم نے گذشتہ ماہ موتمر حجاز پر لکھا تھا تعجب کرتا ہی کہ ہم باوجود خلافت کمیٹی سے تعلق رکھنے کے اسکی رائے کے مخالف ہیں اور یہ گمان کرتا ہے کہ ہم کسی خاص فرقہ کی طرفداری کے سبب عام ملت اسلامی کے مفاد سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ہمارے ہمعصر کی یہ رائے کئی غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ اول تو جامعہ ملیہ جس کی خدمت کا فخر ہمیں حاصل ہے اب ایک خالص تعلیمی مرکز ہے اور خلافت کمیٹی یا کسی دوسری سیاسی انجمن سے اسے کوئی تعلق نہیں دوسرے اگر تعلق ہوتا بھی تو ہم اختلاف رائے کر سکتے تھے تیسرے یہ صحیح نہیں ہے کہ ہمیں مسئلہ حجاز میں عام مسلمانوں کی رائے سے اصولی اختلاف ہی۔ حجاز میں جمہوری حکومت قائم ہونیکے خلاف ہم نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ البتہ ہمارا یہ خیال ضرور ہے کہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی بے توجہی اور مسلمانان ہندوستان کی بے بسی پر نظر کرتے ہوئے یہ معاملہ خود اہل عرب (اس سے کوئی فرد واحد مراد نہیں ہی بلکہ امت عربیہ) کے طے کرنیکا ہے۔ اب رہا کسی فرقہ یا کسی شخص کی بیجا طرفداری اس الزام سے ہم اپنے رسالہ کو اس وثوق کے ساتھ بری سمجھتے ہیں کہ ہم اسکی تردید میں ایک لفظ بھی نہ کہیں گے بلکہ صرف یہ درخواست کرینگے کہ ہمارے پچھلے پرچوں کے شذرات ملاحظ فرماکر اہل انصاف خود فیصلہ کرلیں۔ خود اُس پرچہ کے شذرات میں جن سے ہمارے ہمعصر کو شکایت ہی سب سے پہلے امیر ابن سعود کے ایک فعل پر جو احکام اسلام کے منافی ہے اعتراض کیا گیا ہے۔ امیر نجد اور نجدیوں کی بیجا طرفداری کرنے والا شاید ایسا نہ کرتا۔

ماں باپ کی محبت اولاد کے ساتھ ضرب المثل ہے کسی ماں یا باپ کا اپنی اولاد کی خاطر

آرام و آسایش، دولت و حشمت تج دینا معمولی بات ہے لیکن شاہی خاندانوں میں اس قربانی کی مثالیں کم ملتی ہیں سلطنت میں کچھ ایسی دلفریبی ہے کہ اسکی محبت ہر محبت پر غالب آجاتی ہے۔ پھر بھی بعض نفوس قدسیہ بادشاہوں میں گذرے ہیں جنہوں نے حب دنیا کو ترک کر کے اپنے آپ کو اپنی اولاد کیلئے مٹا دیا۔ چنانچہ شاہان مغلیہ میں سے بابر و ہمایوں کا قصہ زبان زد عام ہے۔ اگر اس واقعہ کے ماننے میں کسی کو تامل بھی ہو تو ابھی چند روز پہلے جو مثال محبت مادری کی علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال نے ہمارے سامنے پیش کی ہے وہ ہر شبہہ سے بالا ہے۔

علیا حضرت کا نواب حمید اللہ خانصاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین بنانا خدا کی سب سے بڑی رحمت یعنی محبت مادری کا نتیجہ ہے لیکن یہ محبت مادری اس قدر کم مایہ نہیں ہے کہ صرف اولاد تک محدود ہو۔ علیا حضرت کی شفقت مادرانہ رعایائے بھوپال کے حال پر بھی اسی طرح مبذول رہی ہے۔ جیسے خود اپنے خاندان پر۔ اسی کا اثر ہے کہ علیا حضرت نے (جیسا وہ خود فرماتی ہیں) اپنے زمانہ حیات ہی میں نواب صاحب بہادر کے ہاتھ میں عنان جہانبانی سپرد کر دی تاکہ وہ اپنی نگرانی میں جوہر قابل کو عروج کمال تک پہنچا سکیں اور اپنے تاجدار فرزند کی رعایا پروری اور معدلت گستری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر روحانی سرور حاصل کریں۔

ہم خدائے تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ عرصہ دراز تک علیا حضرت کا سایہ عاطفت نواب صاحب بہادر کے سر پر قائم رکھے۔

عروس سلطنت کے دولہا نواب حمید اللہ خاں صاحب بہادر کی علم دوستی طالبعلم نوازی اور حب قوم وملت تمام عالم پر روشن ہے لیکن جو شفقت حضور ممدوح کو زمانہ شاہزادگی سے اپنے ملکی کاموں۔ رعایا کی دادرسی ان کی فلاح و بہبود کی تدابیر سوچنے، مظلوموں کی حمایت ظالموں کی سرکوبی سے رہا ہے۔ اس سے ہندوستان کے دور و دراز مقامات کے لوگ بخوبی

واقف نہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ کسطرح سالہا سال تک چیف سکرٹری صاحب بہادر غالباً اپنی ریاست کے ہر عامل سے زیادہ محنت اور عرقریزی کیساتھ امور ریاست کا تصفیہ فرماتے تھے، کس طرح شکار کے سفر سے کسانوں کے دلی جذبات معلوم کرنے اور عمال کی غفلت یا بیجا سختیوں کے انسداد کا کام لیا جاتا تھا کس طرح رعایا کے حقوق کو بڑی بڑی طاقتوں کے استبداد سے بچانے میں ہر طرح کی رعایت پس پشت ڈالدی جاتی تھی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر آج رعایائے بھوپال اُن چیف سکرٹری صاحب کو مسند فرمانروائی پر جلوہ گر دیکھکر اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی ہے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ مالک حقیقی حضور ممدوح کی عمر و دولت و اقبال میں ترقی کرے اور حضور کو اپنی رعایا ملک اور قوم کی خدمت میں پہلے کیطرح سرگرم رکھے۔ یہی خدمت مخدومی کی دلیل ہے۔

مشہور فرانسیسی ادیب اور حامی امن رومیں رولان (Romain Rolland) جنکی کتاب مہاتما گاندھی، تمام عالم میں شہرت حاصل کر چکی ہے جنوری ۱۹۲۶ء میں ساٹھ برس کے ہوگئے۔ انکی شصت سالہ سالگرہ کی تقریب میں ایک مجموعہ مضامین جرمن زبان میں (Liber amicorum Romain Rolland) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں رولان کے دوستوں نے جنمیں دنیا کے ہر ملک کے سربرآوردہ لوگ شامل ہیں اس محب انسانیت کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کی ہے۔ انمیں سے حکیم آئن اشٹائن اور جمہوریہ چیکوسلوواکیا کے صدر مزآریک کی تحریروں کا ترجمہ ڈاکٹر ڈی۔ ایم بوس نے برلن سے ماڈرن ریویو کے لئے بھیجا ہے ہم اسپاسنندی کے اظہار کے ساتھ اسکے بعض جملے یہاں نقل کرتے ہیں۔ اسمیں ایک دلچسپ بات یہ بھی نظر آئیگی کہ عالم اور مدبر کے خیالات اور طرز تحریر میں کتنا فرق ہے۔ حکیم آئن آنشٹائن فرماتے ہیں۔

مرشد محترم

میں نے ظاہری آنکھوں سے آپ کی زیارت صرف ایکبار کی ہے یہ وہ زمانہ کہ

جب جنگ عظیم کا داغ آپکے دل میں تازہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ گوشہ تنہائی سے زمانہ کے نیرنگ کو دیکھ رہے تھے۔ اپنی بنی نوع کی تپ غم سے اس طرح جل رہے تھے جسے کوئی زبان بیان نہیں کرسکتی اور اس احساس کے بوجھ سے دبے جاتے تھے کہ آپ وہ روشنی نہیں پیدا کرسکتے جو اُن سب کو نجات دے سکے ...... موجودہ زمانے نے جو ہم یوروپ والوں کے لئے نہایت قابل شرم ہے دکھادیا ہے کہ ذہنی قلابازیوں سے روحانی کم مائگی اور وحشیانہ جذبات کی روک تھام نہیں ہوسکتی۔ میرا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ انسانیت کے پسندیدہ خصائل یونیورسٹیوں اور اکادمیوں میں بہ مقابلہ بے زبان گمنام آدمیوں کے دائرہ عمل کے زیادہ پنپ سکتے ہیں۔ آج ان لوگوں کی جماعت جو آپکی ذات میں ایک نور افشاں نصب العین دیکھتے ہیں۔ آپ کو مبارکباد دیتی ہے۔

مزاریک رقمطراز ہیں۔

میں رومین رولان سے جنگ کے قبل بھی واقف تھا کہ یوروپ پرستی میرے دل کو لگتی تھی اور جو پرجوش دعوت انہوں نے یوروپ کے ذہنی حلقوں کو سورماؤں کی زندگی بسر کرنے کیلئے دی تھی وہ مجھے مرغوب تھی جب جنگ شروع ہوئی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ تمام قوموں نے رولان کی دعوت شجاعانہ عمل کے بارے میں قبول کرلی ہے۔ شجاعت شجاعت سے، دل دل سے اور ذہن ذہن سے برسر پیکار تھا۔ یہی عالمگیر جنگ کا المیہ ہے۔

ہر مہذب آدمی دنیا کے ادب میں چند برگزیدہ ہستیوں سے دلی تعلق اور دوستی رکھتا ہے اُن مصنفوں اور اپنے فن کے اماموں میں سے جن سے میں ذہنی تعلقات رکھتا ہوں رولان بھی ہے۔

رفتارِ تعلیم

لنڈن ٹائمز کے تعلیمی ضمیمہ بابتہ ۲۲ مئی ۱۹۲۶ء میں ایک مضمون ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم پر نکلا ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں مسلمان ابھی تعلیم میں ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں اور وہ ضروری سمجھتا ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں حکومت مسلمانوں کیلئے خاص آسانیاں بہم پہنچائے۔

مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے اسباب مضمون نگار نے حسب ذیل لکھے ہیں۔

(۱) مسلمان قدامت پسند اور تنگ نظر ہیں اور دینی تعلیم کو دنیاوی تعلیم پر ترجیح دیتے ہیں۔ دینی تعلیم عام طور پر مکتبوں کے ملاؤں کے ہاتھ میں ہے جنکا طرز تعلیم ناقص اور دقیانوسی ہے۔ جو لڑکے ان مدارس سے نکلتے ہیں اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اپنے فرسودہ اور خلاف عقل طریق مطالعہ کو چھوڑنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے اور وہ زیادہ ترقی نہیں کر سکتے۔

(۲) ہندوستان کے ان صوبوں کے مسلمان بھی جہاں کی مادری زبان اُردو نہیں ہے۔ اُردو سیکھنے پر اصرار کرتے ہیں اس طرح انہیں انگریزی، اپنے صوبہ کی زبان اور اُردو تین زبانیں سیکھنا پڑتی ہیں اور عام طور پر ایسے مدرس ملنا مشکل ہیں جو یہ تینوں زبانیں جانتے ہوں۔

مسلمانوں کی تعلیم کیلئے خاص انتظام کی ضرورت سے کسی صاحب فہم کو انکار نہیں یہ دوسری بات ہے کہ کسی کے نزدیک یہ انتظام حکومت کیطرف سے ہونا چاہئے اور کسی کے خیال میں خود مسلمانوں کی اپنی کوشش سے اور سرکار کی خطرناک مدد سے الگ رہ کر۔ اب رہے مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے اسباب انمیں سے پہلے سبب کے دو حصے ہیں (۱) دینی تعلیم کو دنیاوی تعلیم پر ترجیح دینا یہ ایسی چیز ہے جو مسلمانوں کی ملی سیرت سے انکی تہذیب کی تاریخی نشوونما سے اور انکے مذہبی حس سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا میں کسی کو کسی قوم کی نسبت یہ فیصلہ کرنیکا حق نہیں ہے کہ وہ مذہب کا دامن تھام کر رہے یا اسے خیرباد کہدے۔ البتہ دوسرا حصہ جسمیں دینی تعلیم کی نوعیت یا اس کے موجودہ طریقہ تعلیم پر اعتراض ہے صحیح

ہے اور سمجھدار مسلمان خود اپنی اس شامت کا احساس کر رہے ہیں یقیناً جو طریقہ دینی تعلیم دینے کا ہے اُس سے لڑکے کے قوائے ذہنی مردہ ہو جاتے ہیں اور اگر اسکی اصلاح نہ ہوئی تو مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا یہی حال رہے گا۔

شکر ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا اردو سیکھنے پر مصر ہونا مضمون نگار کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہے وہ صرف اسکی دقتیں بتاتا ہے۔ ہم کو مضمون نگار سے پورا اتفاق ہے کہ اُن صوبوں کے مسلمانوں کو جہاں کہ مادری زبان اُردو نہیں ہے۔ چاہیے کہ اپنے یہاں سے معلمین کو اردو سیکھنے کے واسطے باہر بھیجیں لیکن مضمون نگار کے خیال میں اس کے لئے اُس طرح کے اُردو مدارس موزوں ہیں جیسے سرکار نے احاطۂ بمبئی میں قائم کئے ہیں اور ہمارے خیال میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بہتر کوئی تعلیمگاہ اس مقصد کیلئے نہیں ہے ہم جامعہ کے ارباب حل وعقد کو اس مسئلہ ضروری کیطرف توجہ دلاتے ہیں۔

شہر لندن میں تعلیم پر ۲۵-۱۹۲۴ء میں ۹۳ء۲۲۹۹ ۱ پاؤنڈ یعنی ۸ کروڑ چوالیس لاکھ چھیانوے ہزار آٹھ سو بچانوے روپیہ صرف ہوا۔ سارے ہندوستان میں تعلیم پر تقریباً دو کروڑ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ لندن کی آبادی ستر لاکھ ہے اور ہندوستان کی تینتیس کروڑ نتیجہ نکالنا بغاوت ہے۔

بنگال کی تعلیمی رپورٹ بابتہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں سے ہمعصر ماڈرن ریویو حسب ذیل اعداد و شمار شائع کرتا ہے۔ صوبہ کی تمام درسگاہوں میں ۲۰۴۷۷ء۱۷ لڑکے اور ۴۰۷۰ء۳۰۰ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ آرٹ (علوم ذہنی) کے کالجوں میں طلبہ کی تعداد ۲۰۸۰۵ سے ۲۱۹۱۹ ہو گئی جنمیں سے ۱۸۶۹۷ ہندو تھے ۲۸۵۳ مسلمان اور ۳۶۹ دوسرے مذاہب کے لوگ۔ مسلمانوں کی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے اعلی تعلیم میں انکا حصہ بہت کم ہے۔ البتہ ابتدائی تعلیم میں انکی تعداد ہندوؤں سے زیادہ ہے۔ اور روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ سال زیر بحث میں ۳۹۹ء۸۰۶ مسلمان اور

۹۵ ۱۹۴۲ء ہندو ابتدائی مدارس میں تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں مسلمان صحیح ترتیب سے چل رہے ہیں اور پہلے ابتدائی تعلیم کی بنا مضبوط کر رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری مشفق سرکار بنگال سے مسلمانوں کی توجہ ابتدائی تعلیم سے ہٹا کر اعلیٰ تعلیم کیطرف مبذول کرا رہی ہے لیکن اگر انہیں سمجھ ہے تو "ایں دارو و آں نیز ہم" کا مصداق بننے کی کوشش کرینگے ورنہ ابتدائی تعلیم کو چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم کیطرف بڑھنے کے معنی بے دیوار کی چھت بنانا ہے اور اسکا جو انجام ہے وہ ظاہر ہے۔

سی رپورٹ میں اُن تعلیمگاہوں کی ذیل میں جنکی سند سرکار تسلیم نہیں کرتی مسٹر اوٹن شانتی نکیتن کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اس تعلیمگاہ کے بانی (ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹگور) کوشش کر رہے ہیں کہ قدیم ترین ہندوستانی روایات کو جدید تعلیم کی بہترین خصوصیات کیساتھ ملا دیں۔ شانتی نکیتن میں مذہبی اور اخلاقی اصول کی تعلیم پر خاص توجہ کیجاتی ہے۔ ہاتھ سے کام کرنا سکھایا جاتا ہے مثلاً فلاحت آرٹ اور موسیقی پر زور دیا جاتا ہے اور رفاہ عامہ کے کاموں اور اپنی مدد آپ کرنیکی تربیت ہوتی ہے۔ یہ تعلیمگاہ جس کے ہر پہلو میں اُسکے بانی کی تہذیب، روحانیت اور عینیت (idealism) کی جھلک نظر آتی ہے ہر بیرونی نگرانی اور اثر سے آزاد رہنے کو اپنے کام کیلئے ناگزیر سمجھتی ہے۔ اُس نے بغیر اپنی آزادی سے دست بردار ہونے حال ہی میں یہ انتظام کیا ہے کہ اُس کے طلبہ میں سے جو چاہیں کلکتہ یونیورسٹی کا امتحان دے سکتے ہیں۔ یہاں کی ایک نمایاں خصوصیت لڑکوں اور لڑکیوں کا ساتھ پڑھنا اور کھلی ہوا میں درختوں کے نیچے درس دینا ہے۔ جو شخص یہاں معائنہ کی غرض سے آتا ہے اُسے بعض باتوں پر تنقید اور بہت سی چیزوں کی تعریف کرنا پڑتی ہے لیکن اس کا تہ دل سے اقرار کرتا ہے کہ اس تعلیمگاہ کا کتب خانہ ارباب علم و تحقیق کیلئے سرمایہ مسرت، اُسکی اتحادی روح ناگوار اختلافات و نزاعات کے بیابان میں ایک پُر امن نخلستان ہے اور اسکا مستقبل کیسا ہی کیوں نہ ہو اس نے ابتک تین خاص چیزوں میں بہت کچھ کر دکھایا ہے یعنی علوم مشرقی کی اعلیٰ تحقیق میں جیسی

غیر ممالک کے فضلا نے اشتراک عمل کیا ہے۔ آرٹ اسکول میں جس کے منتظم نندلال بوس صاحب ہیں
اور تنظیم دیہی اور فلاح عامہ کے کاموں میں جس میں مسٹر ایلمہرسٹ جیسے ماہر فن کی مدد شامل ہے۔

سرسید محمد فخرالدین صاحب وزیر تعلیم بہار و اڑیسہ کو بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ہندوستان کی
موجودہ تعلیم ناقص ہے۔ آرہ میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ موجودہ تعلیم ذہن پر بارڈہ رکھتی ہے
لیکن سیرت کو کسی سانچہ میں نہیں ڈھال سکتی، انفرادیت پر زور دیتی ہے لیکن ہم آہنگی نہیں پیدا
کرتی۔ مقابلہ باہمی کی ترغیب دیتی ہے لیکن اتحاد عمل نہیں سکھاتی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ نصاب تعلیم پر
زور دینے اور اخلاقی اور معاشرتی پہلو سے غفلت کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

ہم وزیر صاحب کی اس ہمت کی داد دیتے ہیں کہ انھوں نے قواعد ترقی و رخصت سے آگے
قدم بڑھایا اور تعلیم کے اصول پر بحث شروع کی لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ موجودہ تعلیم ذہن
پر بارڈہ کس طرح رکھتی ہے اور انفرادیت کیونکر پیدا کرتی ہے۔ سید صاحب کو جن چیزوں کے نہ ہونے کی
شکایت ہے وہ واقعی موجود نہیں لیکن جن کے ہونے کا اعتراف ہے وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتیں۔
انگریزی ادب کی چند کتابوں کا بازاری شرحوں کی مدد سے بے سمجھے ہوئے یاد کرلینا، فارسی یا
سنسکرت کے بے اصول اتنی بات کا کسی نیم مولوی یا نیم پنڈت کیا تھا ناظرہ پڑھ لینا، تاریخ اقتصادیات
یا فلسفہ کی دو چار لکھی کتابوں کا خلاصہ استاد سے (جنہوں نے اسے اپنے استاد سے نقل کیا تھا) سنکر
حرف بحرف لکھنا اور حفظ کرلینا اگر ذہن پہ بارڈہ رکھنے کیلئے کافی ہے اور سب طلبہ کے ایک مقررہ
سوال کے ایک سے جوابات لکھنے ایک سی غلطیاں کرنے سے اگر "انفرادیت" کا اظہار ہوتا ہے تو ہم
سید صاحب کے قول کو صحیح سمجھیں گے، ورنہ یہ کہیں گے کہ "ذہن پر بارڈہ رکھنا" اور "انفرادیت" موصوف
کی تقریر میں محض کشتی جہاز کے لنگر کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں۔

صوبۂ متحدہ کی حکومت یہ محسوس کر رہی ہے کہ یہاں کی یونیورسٹیوں کے معیار امتحان میں بہت فرق ہے کہیں پچاس فیصدی طلبہ پاس ہوتے ہیں کہیں نوے فیصدی۔ ہمیں ہمعصر ماڈرن ریویو کی رائے سے اتفاق ہے کہ ۹۰ فیصدی طلبہ پاس کرنیوالی یونیورسٹی کا معیار کم ہونا لازمی نہیں ممکن ہے کہ تعلیم بہتر ہو مگر اس کا کیا جواب ہے کہ خود ماڈرن ریویو کے علم میں اس صوبہ میں ایک یونیورسٹی ایسی ہے جسمیں ایک خاص مضمون میں کل طلبہ ناکامیاب تھے لیکن نتیجہ نکالتے وقت سب کے سب پاس کر دیئے گئے۔ ہمارے ہمعصر کو یہ خبر اسی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے معلوم ہوئی اور پھر خود ممتحن نے اس کی تصدیق کی۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ کس مبارک تعلیم گاہ کا ذکر ہے لیکن جب ماڈرن ریویو نے باوجود علم کے نام بتانے کی جرأت نہیں کی تو ہم محض قیاس کی بنا پر کیونکر اظہار کر سکتے ہیں مگر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ یونیورسٹی خواہ کوئی بھی ہو قصر تعلیم کو بنیاد سے کھود کر گرا دینے کی تدبیر کر رہی ہے۔

انجمن ارباب علم پنجاب کا

ادبی مقابلہ۔ ساڑھے بارہ سو روپیہ انعام

ملک کی مقتدر علمی سوسائٹی "انجمن ارباب علم پنجاب" نو سال سے مشہور ادیب آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا ایم ایل سی سابق وزیر تعلیم پنجاب کی رہنمائی میں اردو ادب کی جو خدمات انجام دے رہی ہے اُن خدمات کی گرانمایگی کا اعتراف ہندوستان کے تمام مشہور اخبارات اور گرانقدر اہل قلم غیر متعدد بار کرچکے ہیں۔ اُردو بے قافیہ نظموں (بلینک ورس) کا رواج فیشن کی حد تک ہر دلعزیزی حاصل کر رہا ہے۔ اُردو شاعری میں زلف و خال کنگھی چوٹی کے سوقیانہ خیالات ایٹی کیٹ کے خلاف سمجھے جانے لگے ہیں۔ اردو شاعری کو خیالات، واقعات، اور معاشرت آرائی کی حیثیت سے ہندوستان کی شاعری بنانے کی جانب عام توجہ ہو رہی ہے۔ یہ تمام خوشگوار تبدیلیاں انجمن ارباب علم پنجاب کی کوششوں کا نتیجہ ہے گذشتہ سال سے انجمن نے اپنے ادبی پروگرام کو کامیاب بنانے کی غرض سے ادبی مقابلوں کا سلسلہ شروع کیا ہے انجمن کے ادبی مقابلے کیلئے ہلدہ شو کمپنی ڈھائی سو روپیہ سالانہ کا عطیہ پیش کرکے اپنی ادب نوازی کا ثبوت دے چکی ہے۔ پہلا ادبی مقابلہ مارچ ۳۵ء سے مارچ ۳۶ء تک جاری رہا جس میں ہندوستان کے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے اہل قلم نے شرکت فرمائی۔ مقابلے کی تمام نظمیں مصنفوں کی نظر میں قابل قدر ثابت ہوئیں اور ان میں سے مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری ایڈیٹر نظارہ اور رسید علمدار حسین واسطی علی الترتیب کثرت رائے سے اول اور دوم انعام کے مستحق قرار دئے گئے۔ اس مرتبہ خوش قسمتی سے دوسرے ادب پرور حلقوں نے بھی توجہ فرمائی۔ چنانچہ اُردو مرکز لاہور، اور انڈین واچ کمپنی لاہور نے پانچ سو روپیہ سالانہ کے دو عطیات انجمن کے انعام فنڈ کو عنایت فرمانے کا اعلان کیا۔ انجمن کی مجلس انتظامیہ نے اس سال کے ساڑھے بارہ سو روپے کے انعام کو نظم و نثر کے انعامی مقابلوں پر حسب طریقہ ذیل تقسیم کیا ہے۔

(۱) بہترین مختصر افسانوں (شارٹ سٹوریز) کے مقابلہ کیلئے ۱۲۵ روپے (۲) بہترین نظموں کے مقابلہ کیلئے ۱۲۵ روپے

تفصیلات و ہدایات

(۱) غیر مطبوعہ مختصر افسانوں کے سال بھر میں نو مقابلے ہونگے۔ سال کے اخیر میں ججوں کی رائے میں جو صاحب اولیت کے معیار پر اول درجہ حاصل کرینگے انہیں انجمن کی جانب سے چار سو روپیہ نقد پیش کئے جائینگے۔ دوم درجہ حاصل کرنیوالے کو دو سو روپے نقد۔ سوم درجہ حاصل کرنیوالے کو طلائی تمغہ۔ اور اگر منصفوں کی متفقہ رائے سے رتبۂ اولیت اور ثانویت حاصل کیا ہے تو انجمن اول کو سحر طراز اور دوم کو سحر نگار کے خطابات پیش کرے گی۔ (۲) غیر مطبوعہ اردو نظموں کے سال بھر میں بارہ مقابلے ہونگے مذکورہ بالا تفصیل کے ساتھ اول دوم اور سوم کو نقدی کی صورت میں وہی مقدار انعام کی اور خطاب کی صورت میں وہی خطابات (۳) آزادی یہ دیجاتی ہے کہ مقابلے میں شریک ہونیوالے افسانہ نویس اور نظم نگار حسب پسند کوئی سرخی اپنے افسانے یا نظم کیلئے انتخاب کرکے اسپر طبع آزمائی کرسکتے ہیں۔ انجمن اپنی جانب سے افسانوں اور نظموں کے عنوانات مقرر کرکے اہل قلم کو پابند نہیں کرنا چاہتی (ب) دوسری آزادی ہے وقت کی۔ مارچ ۱۹۴۷ء کے ختم تک نو افسانے اور بارہ نظمیں دفتر میں موصول ہو جانی چاہئیں (۴) ۱۔ جو صاحب مقابلوں میں سب سے زیادہ اول مرتبہ حاصل کرینگے وہ اول اور اسی طرح دوسرا درجہ حاصل کرنیوالے دوم قرار دئے جائینگے (ب) لہٰذا ہر مقابلے میں حضرت ثاقب کانپوری نے بارہ مقابلوں کے لئے صرف تین نظمیں بھیجی تھیں۔ اور پھر بھی اول درجہ پاگئے۔ اس مرتبہ بھی یہ طریقہ برتا جائے گا۔ ممکن ہے کوئی ادیب کم سے کم افسانے یا نظمیں بھیج کر اپنی اہلیت کی بنا پر اول درجہ حاصل کرلیں۔

ہدایات

افسانے ہوں یا نظمیں ان میں چند باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) غیر مطبوعہ ہوں (ماخوذ ہوں یا اوریجنل دونوں منظور کرلئے جائیں گے (ب) دوسری زبانوں سے ماخوذ افسانوں کو ہندوستانی معاشرت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا چاہئے (ج) حیاسوزی، عریانی، اور مخرب اخلاق پہلوؤں سے احتراز قطعاً ضروری ہے (د) اہل قلم افسانے یا نظم کی کم سے کم تین خوشخط نقلیں بھیجیں (ہ) شکستہ اور باصرہ خراش خط تکلیف دہ ہوگا۔ بدخط ادیب

کو کسی خوشخط منشی سے اپنے افسانے یا نظم کی تین نقلیں بھیجنا ضروری ہیں (و) ہر مقابلہ بذریعہ رجسٹرڈ خط بھیجنا چاہیئے۔

نوٹ:۔ انجمن ارباب علم پنجاب ملک کے مستند اور بلند پایہ اہل قلم کی ایک گرانقدر جماعت ہے اسکی جانب سے جو خطاب عطا کیا جائیگا اس کے لئے کسی تائید کی ضرورت نہیں ہے لیکن مزید تائید کیلئے انجمن اپنے خطابات کیلئے ملک کے باقی مشاہیر اہل قلم کی تائیدی رائیں حاصل کرکے شائع کرے گی۔

منصفین

افسانہ نگاری کا فیصلہ حسب ذیل منصفین کی کثرت رائے سے ہوگا۔

(۱) خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا صدر انجمن (۲) لالہ دیانرائن نگم بی۔اے ایڈیٹر زمانہ (۳) لالہ پریم چند بی۔اے (۴) سید سجاد حیدر یلدرم بی۔اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی (۵) شیخ محمد ضیاءالدین شمسی جرنلسٹ (۶) پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم۔اے مسلم یونیورسٹی (۷) حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار۔ مزید تائید کیلئے سید افضل علی صاحب ایم۔اے کلکٹر ایبٹ آباد حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

نظموں کا فیصلہ حسب ذیل حضرات کی کثرت رائے سے ہوگا۔

(۱) ادبی نقاد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (۲) مولانا اصغر مصنف نشاط روح (۳) مولانا سالک بٹالوی بی۔اے (۴) مرزا یاس عظیم آبادی (۵) فانی بدایونی وکیل اٹاوہ (۶) میر نیرنگ وکیل انبالہ (۷) پنڈت میلا رام وفا ایڈیٹر روزانہ بھیشم۔

نوٹ:۔ منصفوں کو مقابلے میں شریک ہونے والے اہل قلم کے ناموں کی بجائے مقرر کردہ نشانات بھیجے جائینگے اور انصاف حاصل کرنے میں بدرجہ غایت احتیاط برتی جائے گی۔ اخیر میں قابل اشاعت مضامین نظم و نثر کو اعلیٰ شاندار طریقہ پر کتابی صورت میں مع تصاویر شائع کیا جائیگا۔

تاجور نجیب آبادی پروفیسر السنہ شرقیہ ڈی ایس کالج لاہور سکرٹری انجمن ارباب علم

مطبع جامعہ ملیہ دھلی

سے

باہتمام محمد مجیب بی اے (آکسن)، پرنٹر و پبلشر شائع ہوا